

سلسلہ انتخاب الناظر لکھنؤ (۱۹۰۹ء - ۱۹۳۷ء) - ۲

تاریخ و فنون و فنون

متذکرے

خدا بخش اورینٹل پبلیکیشنز لاہور ری پرنٹ

نامینک فکال فناععین

# تذکرے

خدا بخش اور نیٹل پبلیک لائبریری پٹنہ

سن اشاعت : ۲۰۰۱ء  
قیمت : ایک سو بیس روپے  
غیر مالک کے لیے ، چھ ڈالر



## حرف آغاز

ماہنامہ الناظر مطلع صحافت پر نمودار ہونے والا انتہائی روشن اور درخشاں ستارہ تھا۔ یہ جولائی ۱۹۰۹ء کو طلوع ہوا اور ۱۹۳۷ء تک افق صحافت اور اس کے وسیلہ سے علمی و ادبی فضا کو منور کرتا رہا۔ اس دوران اسے کئی بار گہن بھی لگا۔

الناظر اودھ کے دار الخلافہ لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ لکھنؤ اس زمانے میں شعر و ادب کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ یہ اپنی حسن معاشرت اور مخصوص تہذیب و تمدن کے لیے بھی چار دانگ عالم میں مشہور تھا۔ الناظر کے مالک و ایڈیٹر ظفر الملک علوی (اصلی نام: اسحاق علی کاکوروی- ۱۸۷۱ء تا ۱۹۳۶ء) اسی تاریخی صوبہ اودھ کے غلی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ اور یہیں کے مخصوص علمی و ادبی ذوق نیز طرز معاشرت کی نمائندگی کرتے تھے۔ عملی سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے۔ قومی تحریک سے وابستہ رہے۔ حکومت کے خلاف تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے؛ ہر جوش تقریریں کرتے۔ اس لیے اس کی آنکھ میں کانٹا بین کر چبھتے اور اس کے ظلم و تشدد کا شکار بنتے رہے جس سے خود ان کو اور ان کے عزیز از جان رسالے ”الناظر“ کو نقصان پہنچتا۔ لیکن یہ دھن کے ایسے پکے تھے کہ بڑے سے بڑے نقصان کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ جس کام کا آغاز کرتے بڑے جوش و خروش اور ابوالعزمی سے کرتے۔ چنانچہ ”الناظر“ جاری کیا تو وہ بھی اس عزم کے ساتھ کہ اردو ادب میں انقلاب برپا کر دیں گے۔

”الناظر“ کے مضمولات کا کیسوس بہت وسیع تھا۔ ان میں غزلیات و منظومات اور انشائیوں کے علاوہ تنقید و تحقیق، سوانح، سماجیات، معاشیات، فلسفہ، اسلامیات، مذہبیات، تعلیم نسواں، اخلاقیات، جیسے اہم موضوعات پر بھی معیاری مضامین شائع ہوتے۔

”الناظر“ اب قصہ پاری بن چکا ہے۔ اس کے شمارے اب عام طور پر دستیاب

نہیں ہیں۔ لیکن اس کی معنویت آج بھی مسلم ہے۔ اس کو زندہ و پائندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی کے پیش نظر خدابخش اور نیشنل پبلک لائبریری نے طے کیا کہ اس کے مضامین کا انتخاب شائع کر کے اسے نئی زندگی عطا کی جائے۔ اور چوں کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے یہ مناسب تصور کیا گیا کہ ان کو موضوع کے اعتبار سے آٹھ جلدوں میں ترتیب دے کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ وہ عنوانات جن کے تحت یہ مضامین ترتیب دیے جائیں گے، اس طرح ہیں:

- |                   |                     |             |
|-------------------|---------------------|-------------|
| ۱۔ اردو شعراء     | ۲۔ مقالات تاریخ ہند | ۳۔ تذکرے    |
| ۴۔ اردو شعر و ادب | ۵۔ ہندوستانی مسلمان | ۶۔ اسلامیات |
| ۷۔ تعلیمات        | ۸۔ تعلیمی ادارے     |             |

ان میں سے اردو شعرا اور تاریخ ہند سے متعلق مضامین کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں جنہیں علمی و ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب "تذکروں" سے متعلق مضامین شائع کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے انھیں بھی سابقہ جلدوں کی طرح قبول عام نصیب ہوگا۔

محمد ضیاء الدین انصاری



# فہرست تذکرے

## صحابہ/صحابیہ:

۱	محمد جان	تنقید الفاروقؓ
۴۰	اسلم جیرا چوری	ام عمارہؓ

## اولیاء:

۴۹	محمد عسکری	غوث الاعظم
۵۷	عبداللہ	حضرت داتا گنج بخش علی ابیحوری اللہ ہونگا
۷۹	"	حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر مسعود اجدادیؒ
۹۹	"	حضرت محبوب الہی محمد نظام الدین بدایونیؒ

## فلاسفہ

۱۱۴	حامد علی	سقراط
۱۳۳	مرزا محمد عسکری	جمہوریت افلاطون
۱۶۷	حامد علی خان	افلاطون الہی

## مورخین

۱۸۰	معتز دول الرحمن	ابن خلدون اور ان کا فلسفہ تاریخ
-----	-----------------	---------------------------------

## مشاہیر

۱۹۴	اسرار حسین خاں طباطبائی	نواب اودھ
-----	-------------------------	-----------

۲۰۸	خواجہ عبدالرؤف عشرت	واجد علی شاہ قالوا انا لله وانا اليه راجعون (وقار الملک مولوی مشتاق حسین)
۲۱۳	ادارہ الناظر	بھارت سپوت
۲۱۶	ابوسلیمان	بی اماں
۲۲۵	جلیل قدوائی	حسین شریف مکہ
۲۲۶	ظفر الملک	مقدس ڈاکو (خواجہ حسن نظامی)
۲۲۳	"	

### ادباء اردو

۲۵۹	ادارہ الناظر	خبریں (مولوی ذکرا اللہ مرزا سلطان احمد)
۲۶۰	ادارہ الناظر	سر سید مرحوم کی رائے... (شبلی نعمانی کے سلسلے میں)
۲۶۲	حبیب الرحمن شروانی	ایک خط
۲۶۳	عبدالمجاہد	"ایک خط" کے متعلق کچھ عرض
۲۶۶	سلطان حیدر خوش	ترک قلم
۲۷۰	عبدالمجاہد	یکطرفہ جنگ
۲۷۳	غفیل احمد جعفری	آہ شیخ ممتاز حسین عثمانی

### ادباء فارسی

۲۷۸	مرزا محمد عسکری	نعمت خان عالی
۲۹۹		خودنوشت میرزا محمد خان قزوینی

### شعراء فارسی

۳۱۷	غلام حسین خان حنفی آفاق	تذکرہ شیخ علی مزین
۳۵۰	اختر جونناگروہی	پروفیسر میرزا حیرت



## تقیۃ الفاروق

مولانا شبلی مروج کی تاریخی تالیفات میں الفاروق کو ایک خاص درجہ قبول حاصل ہوا۔ حضرت  
 امینہ ثانی عمرہ روق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جامع کمالات شخصیت کے ساتھ مسلمانوں کو جو عقیدت و ارادت ہے اُس کے  
 بیان کی حاجت نہیں۔ لیکن انصافی ہوگی اگر الفاروق کی مقبولیت کے اسباب میں خود مولف کے اسلوب  
 بیان اور انداز ترتیب کو نمایاں جگہ دی جائے۔ لیکن یہ بات کچھ کم قابلِ افسوس نہیں کہ جہاں ادبی حیثیت سے  
 الفاروق کو یہ سترت نصیب ہوئی۔ وہاں ادب و نظر کی نگاہوں میں اُسے ایک مستند تاریخ کا درجہ میسر نہیں ہوا۔  
 کیونکہ اکثر صاحبانِ علم کی رائے میں واقعات و حالات کے بیان میں جو درجہ حزم و احتیاط تاریخ کی کسی مستند کتاب کا  
 طرہ امتیاز ہونا چاہیے الفاروق اُس سے محروم ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عام طور پر اُن اصحاب نے جو عہد فاروقی کے  
 واقعات و حالات کی جانچ پڑتال کے اہل تھے اس کتاب پر تنقید و تبصرہ کی زحمت گزار انہیں فرمائی۔ اور انہیں میں  
 ایسے لوگ بھی تھے جو الفاروق کے ادب و مردم اعتماد کا انظار اپنے گہروں بادِ باب کی بھلوں میں تو کرتے تھے لیکن  
 بحث و مناظرہ سے اپنا دامن بچانے کے خیال سے یا مولانا شبلی کی شہرت و مقبولیت کے سبب یہاں آکر غم اٹھانے کی  
 حرارت نہ کر سکے۔

سرسید اور اُن کے اتباع میں مولانا شبلی کا سارا زور اسپر مٹ ہوتا رہا ہے کہ طلبہ و دارانِ تعلیم کی طرف سے  
 اسلام کے خلاف جو دلائل پیش کیے جائیں اُن کا جواب دیا جائے لیکن جواب دینے کا مقصد یہ نہیں ہوتا تھا کہ



اُن کے براہین کا رد کیا جائے یا جو میاں عقلی اُنھوں نے بزمِ خودِ تمام کیا ہے اُسکی حقیقت کا پردہ ناکش کیا جائے بلکہ اسکے برخلاف ان اربابِ عقل کو ہر طریق قرار دے کر اور اُنکے مفروضات کو اصول و ضوابط تسلیم کر کے اعلیٰ تعلیمات دینی مسائل اور تاریخی واقعات کو اُن راویوں سے مطابقت دینے کی انتہائی کوشش ہوتی رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انکی ایسی نام تجزیروں نے اگر ایک طرف ماطلانِ شریعت اور علمائے مذہب کو براہِ فرختہ اور کبیدہ خاطر کیا تو دوسری طرف خود اسلام کی قوت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دیا ہے۔

یونانی اشلی نے امرت سر کے طلبہ مذہبِ العلماء میں جو ناری تزیج بند پڑھا تھا اُس میں جدید تعلیم بانٹ کر دہ کو اس طرح غالب کیا ہے :-

اے کہ برائے یورپ ہاں باشی	حیف باشد اگر از جلوہ ایشان باشی
حیف اگر از اثر نسلند مغربیاں	شکر ناسند سنت و قرآن باشی
سمر از شبہ جلوہ دہ سر نہی	شکر سبند سوسے عمراں باشی
گشت سولن و آئین جہان بافی او	برزباں داری دجگانہ ز انماں باشی
از نیبال صد افسانہ و داستان گوئی	جاہل از سرکہ اسے شیر مرداں باشی
قیصران را ہمہ یک یک بشمار ز آناز	بے خبر از عمر و حیدر و عثمان باشی

لیکن ہیں تو خود مولانا کا دامن بھی اس مصیبت سے سرتا سر آلودہ نظر آتا ہے۔ گو اُنھوں نے اپنے چہرہ پر ایک ایسا نقاب ڈال رکھا ہے جس کی وجہ سے لوگ مومن و موح کا کھا جاتے ہیں۔ ان اتنا فرق ضرور ہے کہ جدید تعلیم بانٹ اسباب اگر قرآن و حدیث سے واقف ہونے کی بنا پر عقل سے یورپ کے اہل ایمان لے آئے ہیں تو ہمارے مولانا پرستاران عقلیت کی راہوں کے مطابق اسلام کی تاریخ گزشتہ اور قرآنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ خواہ مذہب کا منشا پورا نہ ہو لیکن مقبضین یورپ کی تشفی ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتِ نہی تمام دنیا سے اسلام کے لیے موجبِ مدد مانہ و آزر ہے اور انشاء اللہ رہے گی۔ لیکن اگر اُنکے کسی قول یا نسل کو عقل سے یورپ اور تہذیب مغربی کی بارگاہ سے سنبھول نہیں ماسل ہو سکتی تو خود حضور موصوف کے کمالات میں اس سے کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ مسلمانوں کو یہ ناشایاں ہو سکتا ہے کہ وہ ان روزانہ تبدیل ہونے والے نظریات کی بنا پر اپنی عقیدت و ارادت میں ترسیم کریں۔ اور اگر لاف بھی یا مذہب حقہ



سے عدم واقفیت کی بنا پر کچھ ایسے بد نیت ہیں کہ حق و باطل میں تیز نہیں کر سکتے۔ تو ارباب علم و دانش کو یہ ذرا پس  
کہ ان کو قابو میں رکھنے کی غرض سے غلط اور خود ساختہ ادلیات پیش کر کے مذہب تاریخ کی قلب مہیت کر دیں۔

سطور بالا کی تصدیق کے لیے ناظرین کرام کے ملاحظہ میں ایک مولانا شہادت پیش کرنا ہے جو ہمارے مکرم و  
محترم جناب مولانا فاضل محمد جان صاحب قازمی پوری کی ساعی جمیلہ سے فراہم ہوئی ہے۔ صاحب موصوت ایک عالم  
باطل ہونے کے علاوہ ادب و تاریخ کا ذوق بھی ہرچہ اتم رکھتے ہیں۔ چنانچہ عرصہ ہوا جب انھوں نے نقد الفاروق  
کے نام سے ایک بیضا نقیہ الفاروق پر لکھی تھی۔ یہ رسالہ جس کا حجم موجودہ حالت میں بھی اتنا طر کے تین پرچوں  
کے برابر ہے پہلے دفترو گیل کو بھیجا گیا۔ مگر ماسلوم اسباب کی بنا پر نہ تو اس کی اشاعت ہی گوارا کی گئی اور نہ سودہ ہی  
واپس لانا تھا۔ بالآخر مدت کے بعد مولانا کے ایک مخلص خاص اسی غرض سے امرت سرگئے اور سودہ واپس لے آئے۔

اسکے کچھ ہی دنوں بعد مولوی رشید احمد صاحب انصاری جو علی گڑھ میں بہ نمرہ درجین ملازم ہیں مولانا کو ملے اور اس  
رسالہ کا ذکر آیا تو وہ مطالعہ کی غرض سے سودہ کو علی گڑھ لے گئے اور کچھ عرصہ تک اُسکے پاس رہا۔ اس دوران  
میں کسی جگہ اُس کی کتابت بھی کرانی گئی جس کے خانات سودہ پر موجود ہیں۔ مگر اغلب ہے کہ اُسکے چلے ہوتے کی  
نوبت نہیں آئی۔ البتہ شروع کے چار ورق اور آخر کے کچھ اجزاء اس عارضی بیہ نظمی کے زمانہ میں غائب ہو گئے۔

حال ہی میں خاکسار کو یہ سودہ عنایت ہو ا ہے۔ اور اگرچہ موجودہ حالت میں اس قابل نہیں کہ بدورت کتاب خانہ  
کیا جاسکے اور مرض چشم کی وجہ سے خود مولانا سے کرم ابھی غالباً عرصہ تک اُسکے تلف شدہ اوراق کی تکمیل نہ فرما سکیں گے  
تاہم ان اثر کے ذریعے اُسکے چیدہ چیدہ اجزاء ارباب بصیرت کے ملاحظہ کے لیے پیش ہوتے رہیں گے تاکہ الفاروق  
کی تاریخی منزلت کے متعلق اُن کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔

مولانا شبلی مرحوم زندہ ہوتے تو خود اُن سے یہ درخواست کی باقی کہ باقی نقیہ نے جو اناطوط و اسقام دکھائے  
ہیں اُن کو پیش نظر رکھ کر الفاروق میں سب موقوف اصلاح کر لیں اور اب بھی اُن کے جانشینوں سے نا اہل یا نہ وقت  
بے محل نہ ہوگی کہ وہ اس استدعا پر توجہ فرمائیں۔

اگر بانیشیان شبلی کو اس میں کچھ مذہم یا وہ ان اعتراضات کی صحت و واقعیت پر یقین کرنے میں نال  
ہوں تو انھیں اس نقیہ کی تردید کا پورا موقع حاصل ہے۔ ناظرین اُن کے جوابات نہایت خوشی سے درج کیے  
جائیں گے۔ کیونکہ ہمارا مقصد انہار حق اور تحقیق واقعات ہے نہ کہ تحریب و تشکیک۔

ہیں اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس سے زیادہ کسی بات سے سرت نہیں رہ سکتی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار و سیر سے مسلمانوں اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کی تمام قوموں کو پوری واقفیت حاصل کرنے کے لئے واقع ذرا پیہر کیے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی ضرور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہمارے ہادی برحق اور اُن کے اصحاب کرام کی مقدس و پاکیزہ ذرریاں جن و صدائفت، راستی و درایت کے لیے مایہ انجارتیں اُسی طرح جن کتابوں میں ان کے برگزیدہ صحابہ و رتن ہوں اُن کا دامن بھی ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہو۔

ان سروضات کے بعد نقد الفاروق کا ایک لومانی اقتباس : یہ تاخرین کیا جاتا ہے۔ وہ ہذا

الفاروق صفحہ ۱۶۰۔ اخیر میں ہم کو اُن واقعات کی حقیقت بھی بتانا ضرور ہے جن کی وجہ سے

لوگوں کو یہ غلط خیال پیدا ہوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بلکہ خود اسلام نے ذمیوں کے ساتھ

نا انصافانہ سلوک کیے۔ اس مسئلہ کو مخالف اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے حق

میں یہ کلمہ دیا کہ وضع اور لیاں، غیرہ میں کسی طرح مسلمانوں کا تشبیہ نہ کرنے پائیں۔ کمر میں زار باز پائیں

بسی نوپاں بنیں، گھوڑوں پر کاٹھی کیس، نئی عبادت گاہیں، بنائیں، شراب و سوہ نہ پھیں، اداں

نہ سبائیں، صلیب نہ نکالیں، بنو تغلب کو یہ بھی حکم تھا کہ اپنی در و در کو اصحابانہ دینے پائیں، ان

سب باتوں پر ستراد یہ کہ حضرت عمرؓ نے عرب کی وسیع آبادی میں ایک یہودی یا عیسائی کو نہ رہنے دیا

اور بڑے بڑے قدیم خانہ ان جو سیکڑوں برس سے عرب میں آباد تھے غلامی کر دیے، بے شہرہ انراشا

نہایت توجہ کے قابل ہیں اور ہم ان کے جواب دینے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیں گے، کیونکہ

ایک زمانہ محدث کے نسب اور تقلید نے واقعیت کے چہرے پر بہت سے پردے ڈال دیے ہیں۔

نقد الفاروق۔ الفاروق کے تمام مقامات میں جو مقام مصر کے کا سمجھا جاتا ہے اور جو خصوصیت

کے ساتھ زیادہ مہتمم باشان خیال کیا گیا ہے وہ صرف یہی ایک مقام ہے۔

اگرچہ مصنف نے اپنے زعم میں کتاب کے ہر ایک بحث کو ایسی ہی تحقیقات کے ساتھ لکھا ہے

کہ اُس سے بڑھ کر گویا اب نا ممکن ہے۔ لیکن تاہم اُس نے ایک امتیازی حیثیت دکھانے کے لیے

اس مقام پر اپنی تحقیقات کا بہت بڑا حصہ صرف کر دیا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ ذمیوں کے احکام کے



مذہب اسلامی: بنیائیں ایک عام غلطی پھیلی ہوئی ہے اور صد ہا برس پیشتر کے علما جن باتوں کو مذہبی احکام سمجھتے تھے وہ درحقیقت مذہبی احکام نہیں ہیں، اس لیے پوری کوشش کے ساتھ اُس نے جاہل ہے کہ آج اپنی تحقیقات کی صاف و ریز روشنی ڈال کر نادانیت اور جہالت کی اُس تاریکی کو بالکل دور کر دے جس میں اُس کے نزدیک مدت دراز سے تمام اسلامی دنیا گرفتار پٹی آتی ہے۔

اس خصوص میں مصنف کو جو کہ کاوش ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنی متفرق تصانیف میں محض ضمنی ہی تحریریں پر اکتفا نہ کر کے ایک خاص رسالہ "حقوق الذمیین" کے نام سے بھی لکھا ہے جو ایک مدت دراز سے اُس کے تاریخی مضامین کے سلسلہ میں شائع و ستداہل ہے۔ اس رسالہ میں بھی مصنف سے جہاں تک ہو سکا ہے بڑے طمطراق سے فقہائے کرام کے اقوال کو غلط اور نامعتبر ثابت کرنے میں اپنی انتہائی کوششیں صرف کر دی ہیں، بلکہ "حقوق الذمیین" میں تو نہایت پیچ و تاب کھا کر صاف یہ الفاظ لکھ دیئے ہیں کہ "ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ احکام اللہ کے رسول کے، صحابہ کے ائمہ مجتہدین کے، نہیں ہیں۔" ان امور پر نظر کرتے ہوئے غالباً یہ امر کچھ عجیب ہوگا کہ اس بحث کے ہر پہلو پر بڑی احتیاط کے ساتھ ایک نائر نظر ڈالی جائے۔ اور نہایت کتبہ سنجی سے دیکھا جائے کہ اُسکی غیر معمولی کوششیں اُسکے پُر جوش اظہار کے موافق اس بارے میں کہاں تک سرسبز ہیں، اور اسکے خارج از حوصلہ و عادی آبیانی الواقع جیسا وہ کہتا ہے صحیح و دربراد ہیں، یا اُس نے محض اپنی زباں فردشی سے مختلف مواقع پر خلافت تحقیق ایک ایسی بات کو غلط اور بے اصل ثابت کرنے کی بحث کوشش کی ہے، جسے انصاف کسی طرح غلط، اور بے اصل نہیں سمجھ سکتا،

میں اپنی اس تنقید میں صرف اُنہیں اقوال کی بحث پر اکتفا نہ کروں گا جو کہ خاص الفاروق میں ہیں، بلکہ جہاں تک بحث کا تعلق ہے، حقوق الذمیین، سیرۃ النہمان وغیرہ کے بھی جدید و جدید مقامات زیر بحث لاؤں گا، اور اس لیے کلام کی طوالت ایک امر ناگزیر ہے جس کی نسبت مجھے اسید ہے کہ ناظرین صاف فرمائیں گے۔

لائق مصنف نے اپنی کتاب الفاروق کے خاص اس مقام پر کُل دس باتیں ایسی لکھی ہیں جن کی نسبت اُس کا خیال ہے کہ اُنکی واقفیت کے چہرے پر آج سے نہیں بلکہ مدت دراز سے

تصیب تقلید کے پرے پڑے چلے آئے ہیں،

ان باتوں کی تفصیل اگرچہ اوپر گزر چکی ہے، لیکن سلسلہ کلام کے قائم کرنے کے لیے ہم پھر

آغازِ بحث میں ایک دفعہ اور اُنکا اعادہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں، وہ باتیں یہ ہیں،

(۱) وضع و لباس وغیرہ میں ذیوں کا مسلمانوں کے ساتھ تشبیہ نہ کرنا۔

(۲) اُنکا لمبی ٹوپیاں پہننا، (۳) گھوڑوں پر کاٹھی کنا،

(۴) نئی عبادت گاہیں نہ بنانا، (۵) شراب اور سوز نہ بیچنا،

(۶) ناقوس نہ بجانا، (۷) منیپ نہ بکانا،

(۸) مصلیٰ نہ دینا، (۹) زمار نہ باندھنا،

(۱۰) حجاب و طہنی

اب اس کے بعد ہم ان باتوں میں سے ہر ایک کا تاریخی ثبوت دیتے ہیں اور مصنف کے خلاف ثابت کرتے ہیں کہ یہ احکام فقہاء کے فرضی تصعب کے نتائج نہیں ہیں، بلکہ حقیقت یہ وہ ارشادات ہیں جنہیں وقتاً فوقتاً خود صحابہ اور ائمہ مجتہدین نے اپنی زبان مبارک سے اعادہ فرماتے ہیں، اور جو مستند اور قابلِ وثوق طریقوں سے ہم تک پہنچے ہیں۔

یہ امر لکھنا ظاہر کے قابل ہے کہ اس مقام پر مصنف نے باوجود اس آتش بانی اور راز گوئی کے جسے

اس نے اپنی مطول جوابی تقریر میں، جو آئندہ کئی صفحوں میں آئے گی، دکھائی ہے، سرے سے تین باتوں

کے جواب کو بالکل قلم انداز کر دیا ہے یعنی گھوڑوں پر کاٹھی کنا، نئی عبادت گاہیں نہ بنانا، شراب اور سوز

بیچنا، البتہ سور کی نسبت قاریج از بحث اتنا ضرور لکھا ہے کہ مسلمانوں کے اعلاطے میں اُسکے لے جانے

کی مانعت تھی۔ لیکن کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے سور کے بیچنے کی مانعت کا اعتراض کیونکر اٹھ گیا،

بسی ٹوپیاں پہننا چونکہ وضع و لباس سے متعلق تھا اس لیے مصنف نے جواب میں اُسکو ایک ہی

امر قرار دیا ہے، اور اس طور سے اب دس باتوں میں سے کل چھ ہی باتیں رہ گئیں جن کے جواب اور

جواب ابواب کی تقریر حسبِ میل ہے

وضع و لباس | اس بحث کے متعلق ہم باہر وجہ مصنف کے نہایت میزان ہیں کہ اُس نے اس قدر

نور سلیم کر لیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی شاہت سے منع کرتے تھے، لیکن اُسکا یہ خیال البتہ ہمارے نزدیک کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ یہ مانتے حضرت عمرؓ کا ایک مذاقِ طبعی تھا جس کے صرف یہی تھے کہ تمام قومیں اپنی اپنی خصوصیتوں پر قائم رہیں، چونکہ اس بحث پر ہم کو بالامتیاب گفتگو کرنی ہے اور عموماً فقہاء کے ساتھ سنت کو جو بدگمانی ہے اُس کا جواب دینا ہے اس لیے ہم تسیل بیان کی ضرورت سے مناسب سمجھتے ہیں کہ پہلے چند نتیجے قائم کریں، پھر اُنکے جوابات دیں،

میرے نزدیک ان جوابات سے کم از کم اتنا ضرور ہو گا کہ ناظرین حق و ناحق کے متعلق ایک خوش اسلوبی کے ساتھ کوئی آخری فیصلہ کر سکیں گے،

(نتیجہ اول) کیا دراصل فقہاء یہ کہتے ہیں کہ ذمیوں کو بتایا مسلمانوں کے اُن خاص خاص لباس کا اختیار کرنا ضروری ہے جنہیں خود اسلام یا خلفائے اسلام نے اُن کے لیے تجویز کر دیا ہے اور کیا قرآنِ اول میں ایسا کوئی لباس، کوٹ، پتلون، جیکٹ وغیرہ کی قسم سے تجویز ہوا تھا یا نہیں؟ (دوم) خلفاء و ائمہ میں سے بھی خاص حضرت عمرؓ نے کیا اہل ذمہ کے لباس یا لباس کے علاوہ وضع وغیرہ دوسری باتوں میں کوئی روک ٹوک یا مزاحمت کی تھی یا یہ کہ اُنکو ایسے تمام امور میں پورے طور پر آزادی حاصل تھی؟

(سوم) مزاحمت در روک ٹوک ہونے کی صورت میں کیا یہ راز ہے پردہ ہو سکتا ہے اور اسکے سمجھنے کے لیے کافی وجوہ ہیں کہ ایسی کارروائیاں ذمیوں کی عزت کے لحاظ سے نہیں یا ذلت کے خیال سے یا یہ کہ ان دونوں باتوں کے حوالہ سے کچھ اور تھا؟

ان نتیجوں پر ہم کو بڑی احتیاط سے بحث کرنی ہے جس کے متعلق ہم ذیل کی تفصیل سے کام لیتے ہیں پہلی تحقیق کی نسبت ہم سبناظرت تمام کہہ سکتے ہیں کہ قرنِ اول میں ہرگز کوئی خاص قسم کا جدید لگاؤ لباس ذمیوں کے لیے نہیں تجویز ہوا تھا، اور نہ فقہاء طیبہ ایسے کسی خاص قسم کے نامعلوم الاسم و لیسٹی لباس کو ذمیوں کے استعمال کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، بلکہ عموماً عام طور پر تمام اگلے پچھلے فقہاء ہی کہتے اور کہتے چلے آئے ہیں کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے ساتھ لباس وغیرہ میں تشبیہ نہ کرنا چاہیے جو نہ صرف ہمارے نزدیک صحیح ثابت ہے بلکہ مہنف کو بھی اناروق وغیرہ متفرق تصانیف میں اُسکا ملانہ اعتراض ہے،



البتہ مقام تفصیل میں فقہائے سنی خاص خاص چیزوں کے نام لیے ہیں مثلاً لمبی ٹوپیاں پہنا، سواری میں زین پر نہ بیٹھنا، مسلمانوں کی سی جوتیاں نہ پہنا، اپنی جوتیوں کے تسمے دوسرے رکھنا وغیرہ وغیرہ، لیکن ایسی باتیں سچاے اسکے کہ فقہاء کی کوئی ایسا دین امتداد انفسم کہی جاسکیں، خود روایات و احکام صحابہ میں معتبر طریقہ پر جتہ جتہ انکی تصریحات موجود ہیں، جیسا کہ آئندہ اسکی تفصیل آتی ہے۔  
اس لیے ایسی صورت میں ہم بالکل خیال نہیں کر سکتے کہ فقہاء خود بخود کسی طرح فرضی احداث فی الذہب کے جرم میں جائز شرعاً و بر ما خود ہو سکیں گے۔

نتیجہ نبر۱ کے جواب میں ہمارا ملایہ دعویٰ ہے کہ بیشک حضرت عمرؓ نے زیوں کے لباس وغیرہ کے متعلق ایک حکماً نہ روک ٹوک کی تھی جس کی نسبت ہم مسند کے غلات آئندہ یہ ثابت کریں گے کہ وہ حضرت عمرؓ کا کوئی طبعی مذاق نہ تھا اور نہ اس سے قومی خصوصیتوں کو قائم رکھنا منظور تھا، اس موقع پر ہم صرف دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ مزاحمتیں کیا کیا تھیں؟

بے شبہ حضرت عمرؓ نے زیوں کے لیے یہ قرار دیا تھا کہ وہ کسی طرح مسلمانوں کے ساتھ لباس، سواری، ہیئت وغیرہ میں مشابہت نہ کرنے پائیں، وہ ہی ٹوپیاں پہنیں، اپنے زیوں کے آگے انا کی شکل کی گول کمری ٹکائیں، جوتیوں کے تسمے دوسرے رکھیں، مسلمانوں کی سی جوتیاں نہ سلا لیں، انکی پٹیاں کاٹ ڈال جائیں، انکی عورتیں کجاؤں میں نہ سوار ہوں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ ان باتوں کی تصدیق کے لیے اندہ ہو کتاب الخرج وغیرہ کی عبارت منقولہ ذیل جو مختلف مقامات سے لی گئی ہے۔

وینبئ + + ان یقدم فی ان لا یرکب حدنہم تشبہ بالمسلمین فی لباسہ و عانی مرکبہ و عانی بیاتہ و یؤخذوا +	لباس اور سواری وغیرہ میں کسی ذی کو مسلمان کے ساتھ تشبیہ نہ کرنے سے۔ انکی پابندی کرانی جائے کہ انکی ٹوپیاں خاص طور کی
+ + ان یکنون قد نسیم مفرجہ و ان تحبہ اعلیٰ سر و جہم فی وضع القرا میر شل الیامۃ من خشب ان یجلبوا +	اور لمبی ہوں، انکی زینوں پر قراب میں کی جگہ انا کی شکل کی گول کمری ہو انکی جوتیوں کے تسمے دوسرے اور جوتیاں مسلمانوں کی جوتیوں کی سی نہ ہوں، انکی عورتیں کجاؤں کی سواری سے منع کی جائیں
نساؤ ہم من رکوب الحائل + + + + + لکن ینسہم	ان کی ٹوپیاں خاص طور کی لمبی ہوں۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے مالوں کو حکم کیا تھا کہ زیوں سے
طوالا مفرجہ + + + + + گھڑا کان عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ	

عند امر غلامه ان ياخذ ذابل الذئب بهذا الزئبي <sup>۱</sup> | اس خاص صفت کی پابندی کریں۔

ان عمر بن الخطاب کتب الی امراء الانجاد ان  
 ۱۰۰ تجزوا نواصیم من اتحدہ منهم شرأ وتنفو ہم  
 الرکوب الا علی الاکت عرنا ولا یرکبوا کما یرکب  
 لسلون <sup>۲</sup>  
 حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے افسرین فوج کو لکھا  
 کہ ان کے سر کے آگے کے بال کاٹ ڈالو اور منہ کرو کہ وہ پالان کے سوا  
 زین وغیرہ پر نہ سوار ہوں۔ جس طرح سلطان سوار ہوتے ہیں اس  
 طرح ساری نہ کریں۔

حضرت عمر کے علاوہ عمر بن عبد العزیز جن کو مصنف نے اسلام کا نو ذبیہ <sup>۳</sup> اور یہ بھی لکھا ہے  
 کہ وہ دوسرے عمر کے جاتے ہیں، انھوں نے ذبیوں کے متعلق جو خاص خاص اجتماعی احکام مسما  
 کیے تھے وہ یہ ہیں،

عموماً یہودی و نصرانی پالان کے سوا زین پر نہ سوار ہوں، ان کی عورتیں بھی پالان کے سوا  
 کچاوس کی سواہی نہ کریں، نصرانی قبائلیہ نہیں، خنزیر جو ایک قسم کا ریشمی کپڑا ہوتا ہے وہ بھی نہ پہنیں،  
 عصب جو ایک قسم کی زنگین چادر ہوتی ہے وہ بھی نہ اوڑھیں، عمامہ بھی نہ باندھیں، جام اور دفر بھی  
 نہ رکھیں، تقصیص کے پابند رہیں، وغیرہ وغیرہ چنانچہ اُن کے فرمان کی خاص الفاظ جو اس کتاب  
 اخراج حسب ذیل ہیں

ولا یرکبن یہودی ولا نصرانی علی سرچ ولیرکب علی  
 اکاف ولا ترکبن امراة من نساہم علی بحالة رکن  
 رکوہا علی اکاف وتقدم فی ذلک تقدما ینجاد من  
 من قبلک فلا یلبس نصرانی قبا واولا ثوب خرد ولا  
 وقد ذکرنی ان کثیرا من قبلک من الفزاری قد عویا  
 لبس الدائم وترکوا المناطن علی ادسا ظم واستخذوا  
 البجام والوفر وترکوا التقصیص + + + فانظر کل شئ  
 نہیت عت نامر عنہ من فعلہ <sup>۴</sup>  
 یہودی اور نصرانی باؤں کے سوا زین پر نہ سوار ہوں انکی عورتیں بھی  
 پالان کے سوا کچاوس میں نہ بٹھیں اس بات کی سخت پابندی کرانی  
 چاہیے اور منہ کرو کہ کوئی نصرانی قبا، خنزیر، عصب، آستال نہ کرے  
 مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے یہاں بہت سے عصبائی کاٹے  
 باندھے گئے ہیں اور زمار باندھا چڑھایا ہے بلبلے بال رکھنے  
 میں، دیکھو جن باؤں سے طافت کی گئی ہے، ہرگز کوئی  
 شخص انھیں نہ کرے، روکو، اور منہ کرو،

۱ کتاب اخراج صفحہ ۷۲ و ۷۳ ۲ سترہ اہمال جو مصنف عبد الرزاق وابن ابی شیبہ و بہقی  
 وغیرہ صفحہ ۱۹۱ جلد ۲ ابی حنوفہ ذہب صفحہ ۱۶۲ ۳ حقوق صفحہ ۴۸ ۴ کتاب اخراج صفحہ ۷۲

ان مانتوں کے بعد کس کو شبہ ہو سکتا ہے اور کون خیال کر سکتا ہے کہ ذی ملو لباس سوار  
وضع وغیرہ امور میں پرے طور پر آزار تھے، اور ان کے لیے خاص خاص باتوں کا پابند ہونا کوئی  
لازمی امر نہ تھا۔

انفوس! یہی پابندیاں اور یہی نزاحتیں میں جنہیں فقہائے اسلام نے خدمتِ اسلام تکبر اپنی  
کتابوں میں ذرا تفصیل سے لکھ دیا جسکے وہ ہر طرح سخت تھے۔ لیکن یہ زمانے کی خوبی ہے کہ آج  
انکی یہ خدمت اسلام بجا طور پر ایک مکروہ خطا سمجھی گئی ہے اور اس لیے پیش نہ کیا جائے گا۔  
بڑی تیزی کے ساتھ پڑ رہی ہیں،

نمبر ۳ کے متعلق جیسا کہ میں ابھی اوپر کہہ آیا ہوں، مسنفت کا خیال ہے کہ یہ نام مزاحمتیں  
حضرت عمر کے ذائقہ بیعت کی بنا پر تھیں اور اس لیے کہ تو میں اپنی اپنی خصوصیتوں پر قائم رہیں،  
لیکن میں نہایت ادب سے مسنفت سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ایک امر صحیح طور پر حضرت عمر کا  
ذائقہ بلایت تھا تو سب سے اس کے وہ انہیں کے زمانے کے ساتھ مخصوص رہتا، کیوں زمانہ پابند کے  
خلفائے ان پر سختی کے ساتھ عمل کیا، مثلاً حضرت عمر ابن عبدالعزیز جن کی تعریف مسنفت ہی کی زبان  
سے ابھی گزر چکی، کیوں انہوں نے اپنے مال کو یہ کھنا کہ خیر دار کوئی یودی و نصرانی مرد و عورت  
پانچ چھوڑ کر زین یا کچھ سے پر نہ سوار ہو، نصرانی تباہ پنیں، خنزیر پنیں، عصب نہ اوڑھیں، عامر  
نہ بانہ میں، بال کٹوائیں، گھر میں نہ آتا، یعنی بنیو بانہ میں، وغیرہ کیانی الوان ذائقہ بلایت  
جی کوئی آیت یا حدیث کا کلمہ رکھنا تھا کہ جس کے اتباع میں ایسا تشدد و اتمام اکمل لازم  
سمجھا جاتا تھا؟ یا یہ کہ حضرت عمر ہی کے ذائقہ بیعت میں کوئی ایسی ناس خصوصیت تھی جسکی وجہ  
ان کے بعد کے جانشین خاندان کے حکام کے ذرا برابر ہی فلاح نہیں کر سکتے تھے؟

مسئلہ ۱۱، حضرت عمر کا یہ قلم کرنا یاں کے سروں پر سے چھایا کاٹ ڈالی جا۔ اور حضرت  
قالد کے معاہدے میں یہ شرط (جیسے حضرت عمر وغیرہ نے بھی کیا) کہ مسلمانوں کے ساتھ لباس میں  
مشابہہ کرنے کے علاوہ اہل ذمہ ذمی لباس بھی نہ پہنیں ورنہ باز پرس کے وقت اگر معقول وجہ  
نہ ہوگی تو سزا بے ہوشی کے، کیا یہ باتیں بھی ذائقہ بلایت کی وجہ سے تھیں؟



صرف قومی خصوصیتوں پر قائم رہنے کی نہایت لتو اور رگلیک تاویل کو ہم اُس وقت تسلیم کر سکتے ہیں جبکہ بائیں مصنف ثابت کر دے کہ خز، قبا، غصب وغیرہ کا پہننا خاص مسلمانوں کی کے لیے مخصوص تھا، جیسی ان کو پہلے سے نہیں پہنتے تھے،

نیز یہ کہ یود و نصاریٰ کی یہ قومی خصوصیت تھی کہ وہ ہمیشہ سے پالان ہی پر سوار ہوتے تھے، انکی ناس قسم کی زمین سکے آگے قدیم سے گول لکڑی لگی ہوتی تھی، انکی جوتیوں کے تسمے دودھ سے ہوتے تھے، چٹیا نہیں رکھتے تھے، انکی سواری کی ہیئت مسلمانوں کی سواری کی ہیئت سے الگ ہوتی تھی، وہ ہمیشہ پالان پر سوار ہوتے تو عرضنا: طولاً وغیرہ وغیرہ، کیونکہ بغیر اسکے کہ ان باتوں کا قومی خصائص میں سے ہونا ثابت کیا جائے، یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ ان باتوں کی پابندی انکے لیے اس وجہ سے ضروری کی گئی تھی کہ وہ اپنی قومی خصوصیتوں پر قائم رہیں۔ بات یہ ہے کہ بات بنانے کے لیے بھی انسان کو ایک سلیقہ چاہیے، مصنف نے سخن سازی کی بھی تو عا مایہ، لکھنے کو تو کچھ دباؤ حضرت عمر کی اس روک ٹوک کا ناص منشا یہ تھا کہ قومیں اپنی اپنی خصوصیتوں پر قائم رہیں، لیکن یہ خیال کیا کر چٹیا، جسکے کاٹنے کا حکم حضرت عمر نے دیا تھا، اگر وہ قدیم سے اہل ذمہ کی خصوصیت تھی تو اُس کا کاٹنا بجائے اسکے کہ انکی قومی خصوصیت کو قائم رکھنا کہا جائے، اور اسکو مٹانا ہے، اور اگر وہ پہلے سے نہیں رکھتے تھے، بلکہ پیچھے رکھنے لگے تھے، تو اس سے میں نہیں سمجھ سکتا، کہ مسلمانوں کی کون سی قومی خصوصیت مٹی جاتی تھی، اور کس اسلامی شعار کے ساتھ تشبیہ پیدا ہوا جاتا تھا، جسکے تدارک کے لیے ایسا کرنا لازم آیا،

میرے نزدیک اسی طرح یہ خیال بھی ایک لتو اور تا مفلول خیال ہے کہ خز اور غصب پہننے سے روکنا، اور پالان پر عرضاً سوار ہونے کا حکم دینا، اور یہ حکم دینا کہ جس ہیئت سے مسلمان سوار ہوتے ہیں اُس ہیئت سے اہل ذمہ نہ سوار ہوں، یہ سب محض اس لیے تھا کہ جانہیں اپنی اپنی قومی خصوصیتوں پر قائم رہیں، حالانکہ ایک متوالی فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ قومی خصوصیتوں کے بقا و قیام کے بجائے ان احکام کا منشا سات طور پر یہ تھا کہ غیر قومیں فاتح قوم کی مہری نہ کرنے پائیں، جیسا کہ مہتابھی لکھتے ہیں۔ منشا اُس وقت اور زیادہ ہو کہ اور قرین قیاس ہو جاتا ہے جبکہ یہ دکھایا جائے کہ خز کا استعمال

جو رشتہ کپڑا ہونے کے مسلمانوں کے لیے پہلے ہی سے مذہباً ناجائز تھا اور اس طور سے غیر قوموں کو جذبہ  
استغماں کرنا جائز نہیں کی قوی خست و مضبوط پر کچھ بھی مخالفت نہیں ڈال سکتا تھا، پھر بھی انکو اس کے  
استغماں سے روکنا، اسکے سر پہ سنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر قوموں کا معاشرہ ہلکا دبا ہوا  
اور تھری راتخار کے پا پہ سے گرا ہوا ہونا چاہیے۔

کیا یہ امر تعجب سے نہ دیکھ جائیگا کہ جناب مصنف دوسروں کے مقابلہ میں تو ہمیشہ درایت اور  
درایت کا نمونہ شریعہ الہیہ میں لیکن یہاں اوقات خود ایسے مقامات میں جہاں درایت سے کام لینا چاہیے  
ایسی سادگی و باہاروی کا ارتکاب فرماتے ہیں کہ شاید دوسرے سے ممکن نہ ہو۔

اسی نتیجہ کا تتمہ ایک درامر بھی ہے یعنی یہ کہ اس طرح کی قیدوں اور پابندیوں سے کیا ڈاکٹر  
ذہنوں کی تعمیر بھی مستعد تھی؟ مصنف کو نہایت سختی سے اسکی نفی پر اصرار ہے، لیکن ہمارے فیصلہ  
لے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ خود مصنف کے فیوض شریعہ علیہ السلام کے خیالات اہل ذہن کے باب میں  
کیسے تھے؟

آیت جزیه جس میں دھم سازوں کا لفظ موجود ہے اور جس سے شارع کی نظر میں جزیه  
واہوں کا ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار رہنا اگرچہ ایک بدیہی امر ہے، اسی طرح یہود و نصاریٰ کو ابتداء اسلام  
نکرنا، اور راستہ میں انکو بچکا بچکا رکھنا، اور کنا سے چلنے پر مجبور کرنا جو کہ نہایت صحیح طور پر آل حضرت سے  
ثابت ہے، جیسا کہ آئینہ واس سے بحث آئے گی اگرچہ ایک معنی خیز امر ہی نہیں، بلکہ سات سات  
تصریح مافی الباب ہے، لیکن اس سے بھی اعلیٰ نظر ہم اس مقام پر صرف کتاب الخراج کے حوالہ سے  
یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک موقع پر معاوندہ صلح کی گفتگو میں مقدس صحابی حضرت معاذ نے حضرت ابو عبیدہ  
سے کیا کہا تھا؟ اس گفتگو کو تاملی ابو بکر نے کتاب الخراج میں جن الفاظ میں نقل کیا ہے وہ ہیں  
ان علیہ السلام علی شئ مسمی فجزا عنہ ثم کین بک اگر تم نے ایک سین مقدار پان سے صلح کر لی اور پھر وہ اس کے  
ان تمکم و تم تجدد بآمن اربال بال اشتراک علیہم اور اگر تم سے قاصر رہے تو تم نہ انہیں قتل کر سکو گے اور اگر  
لقتیہ وان ابسر واد وہ علی غیر الصغار الذی امرتہ ایک کوئی چارہ پاؤ گے کہ تمہیں کی شرط کو بال ل کر دو اور اگر  
نہیں

مع ہذا کنز العمال جلد دوم میں بھی کے حوالے سے خاص حضرت عمرؓ کی یہ روایت بھی منقول ہے  
 لا شتر دار یقین اہل الذمۃ فانہم اہل خراج وارثہم ذمیوں کے غلاموں کو خریدو اس سے کہ وہ اہل خراج  
 فابنہا عوام ول یقرن احدکم بالصفا ربہ اذا یمیا، اور نہ ان کی زمینوں کو خریدو، تم میں سے کوئی آدمی  
 شجاءہ اللہ منہ  
 ذلت کا اقرار نہ کرنے کا یہ کہنے کا اہل الذمۃ اس سے نجات دینا  
 اس سے بڑھ کر یہ کہ خود فتوح البلدان بلاذلی میں جہاں اہل الذمۃ کے معاہدے کو نقل کیا ہے  
 وہاں معاہدے کے خاص الفاظ یہ ہیں،

یا امان علی نفسم وبعیم وھوا مھم وھلوا تم  
 و بنیم علی اقرار بالصفا ربہا بجزیۃ سئل  
 اہل بیت دینار  
 انکی جانیں اورین مذہب، عبادت کو میں، عورت وغیرہ  
 محفوظ رہیں گے اس شرط پر کہ ذلت کا اقرار کریں اور جزیرہ  
 دیں، جو ہر گھرواں، ایک دینار ہوگا،

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں،

اتونی کتاب امان ہم من عبیب بن سلمہ  
 الا قرار بفسار بجزیۃ  
 وہ لوگ میرے پاس ابن یحییٰ ذلت نیکر آئے، عبیب بن سلمہ کی  
 طرفت جزیرہ کی ذلت قبول کر لینے پر متلما،

جس قوم کی نسبت ارشاد خداوندی کے علاوہ خود رسول اور رسول کے صحابہ کے ایسے خیالات ہوں  
 انکی نسبت نہایت آسانی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ ایسی جزئی قیاس لباس اور غیر لباس میں خاص  
 اس قوم کی عزت افزائی کے لحاظ سے نہیں؛ ذلت و تنگ گیری کے خیال سے،

لباس کی بحث میں مسنت نے یہ لکھ کر کہ مجوزہ لباس عجم کا قدیم لباس تھا، اور اسکا ثبوت یہ ہے  
 کہ حضرت عمرؓ کے معاہدے میں ”وان لزم زینا حیث ما کنا ہے اور نیز یہ لکھ کر کہ ظنیہ منصور نے جو لباس  
 اپنا درباری لباس قرار دیا تھا وہی لباس تھا، جس میں اس نے عجم کی تملیہ کی تھی، اور جو ایک  
 میں دلیل اس بات کی ہے کہ یہ لباس بطور علامت تحقیر کے بنجوز نہیں ہوا تھا، گویا فنیہ کر دیا ہے  
 کہ وضع لباس میں ذمیوں کے لیے فانس اپنی قدیم وضع کے علاوہ کسی اور جدید وضع کی پابندی ضروری  
 نہ تھی،

لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ ذمیوں کے صرف اس اقرار سے کہ ہم اپنی زینت پر قائم رہیں گے، یہ کہو کر



لزم آتا ہے کہ ہم اپنی رزی کے علاوہ اور اونٹنا پتہ حیدر کی پابندی نہ کریں گے ؟ یا یہ کہ ایسی اونٹنا  
کی پابندی کا اُن کو حکم نہ دیا جائے گا ؟

اور مندرجہ وہ منصور جس کے محاسن اور صفات مسندت کو بخوبی یاد ہیں اور جس کی ایک ہالی  
کا مختصر خاکہ مسندت نے سیرۃ النہان میں بھی کھینچا ہے ، اگرچہ اُس کے طرزِ عمل سے کسی شرعی باب میں  
استدلال اریا ہی ہے جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ، لیکن تاہم کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کے درباری  
لباس کو اُن قیود و زائدہ اور اُن اونٹنا پتہ محققہ نہ کہ رو سے کیا تعلق ہے جن کی پابندی ناسکریذیوں  
کے لیے ایک ضروری بات تھی ،

ذبیوں کے لیے صرف لمبی ٹوپیاں اور بقول مسندت پیٹیاں ہی نہیں تجویز ہوئی تھیں جس کی  
تفسیر منصور نے اپنے درباری لباس میں کی ، بلکہ اُن کو تو خاص لباس و وضع کے متعلق ہر ذلت ہی بات کا  
پابند کیا گیا تھا ، تو کیا اُن تمام امور کی پابندی منصور کے درباریوں کے لیے بھی ضروری تھی ؟

سہذا ، جناب مسندت اُن مذکورہ بارہ واقعات ، رینچی کی تکیہ پر کس طرح جرات کریں گے ،  
جن میں غلانیہ اور صفات طور پر منع کیا گیا ہے کہ اہل ذمہ فلاں فلاں کپڑے نہ پہنیں اور خاص فلاں  
فلاں وضع ، اور فلاں بیات کی پابندی اُن سے عطا کرانی جائے ، جن کا انکار اگر انصاف سے  
دیکھو تو روز روشن میں گویا آفتاب کا انکار ہے ،

اسی طرح ایک اور عجیب فقرہ جو لباس کی بحث میں مسندت کے قلم سے نکلا ہے قابلِ لحاظ ہے ،  
وہ یہ کہ حضرت عمر کا سپاہ و جنگو کنز المال وغیرہ میں نقل کیا ہے ، اگرچہ رادیوں نے اُسکو بہت کچھ  
کم و بیش کر دیا ہے ، تاہم جہاں ذبیوں کی طرف سے یہ اقرار مذکور ہے ، کہ ہم فلاں فلاں لباس نہ  
پہنیں گے ، وہاں یہ الفاظ بھی ہیں ”ان لزم زینا حیث اکنا“ اب تھوڑی دیر کے لیے اس بیان  
کو الفاروق صفحہ ۵۵ کی عبارت ذیل سے بھی ملا کر دیکھو ۔

”آنحضرت بڑے جاہ و ہلال سے کہ میں داخل ہوں اور در کعبہ پر کھڑے ہو کر نہایت فصیح و بلیغ

خطبہ پڑھا جو سینہ اریکوں میں منقول ہے ،

کیا درایت و اصول و درایت کا مقتضا یہی ہے کہ خطبات جن کے حفظ کی چنداں ضرورت نہیں ہوئی

وہ تو راویوں کی یاد سے بھینٹا تھا، بچوں میں منقول ہوں لیکن معاہدات جن کے یاد کی بڑی ضرورت  
ہوا کرتی ہے وہ باوجود دواعی حفظ کے ایک روایت میں بھی جگہ کم و بیش منقول نہ ہوں؟  
پھر لطف یہ ہے کہ پہلے انہیں معاہدات کی نسبت حقوق الذمین میں بومناحت تمام یہ ہیں  
ارشاد ہو چکا ہے کہ

”ایک بیری وغیرہ میں سیکڑوں معاہدے یا غافلہ (سینے اصلی انگلیوں میں) موجود ہیں۔“

سچانک ہذا نئی عجیب! اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کو ہمیں ختم کروں اور بقیہ امور کے  
جواب کی طرف متوجہ ہوں،

”افس، اصداغ، صلیب وغیرہ کی بحث کرتے ہوئے مصنف کی تقریر میں ایک غیر معمولی  
جوش آگیا ہے۔ وہ نہایت طیش میں آکر ان احکام کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے، کہ ان سے رہا کذاب شہ  
نہیں دست اندازی ہے لیکن میں یہاں اس راز کی پردہ دری کرتا ہوں کہ یہ احکام جن قیدوں  
کے ساتھ حضرت ابو بکر و عمر نے جاری کیے تھے وہ بالکل مناسب تھے لیکن زمانہ مابعد کے اور درخوں  
نے ان قیدوں کا ذکر چھوڑ دیا اور اس وجہ سے تمام دنیا میں ایک مالگیر غلطی پھیل گئی۔ تم کلام

میں کہتا ہوں، اس سچ ہے، یہ فکر ہر کس بقدر بہت ادست، میں پہلے مصنف کو  
اسکی اس پردہ دری پر آفریں و مبارکباد کہتا ہوں، پھر مؤدبانہ عرض کرتا ہوں کہ خود حضرت ابو بکر  
و حضرت عمرؓ نے ان قیدوں کے بغیر بھی یہ احکام جاری کیے تھے اور زمانہ مابعد کے مورخین سچا  
اسکے کہ احکام میں ایسی ضروری قیدوں کا ذکر چھوڑتے انہوں نے جن عام اور مطلق روایتوں کو لیا ہے  
وہ واقع میں بھی اپنے عموم اور طابق پر تھیں اور اب بھی ہیں، اگرچہ میرے نزدیک مصنف کے لیے  
اس پردہ دری سے پردہ داری بہتر تھی، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ حسن اتفاق سے نہیں بلکہ اتفاق پر  
سے وہ خود ایسی مستحسن حرکت میں مبتلا ہے، یعنی خود طعنہ نے مفاہظ صحابہ کی نقاد بیان کرتے

ہوئے الناروق بمعجمہ ۱۳۰ میں روایت سے صاف اشارہ کی قید کو اڑا دیا ہے، اور یہ ایک پرہیز  
امر ہے کہ انسان خود جس عیب میں مبتلا ہو اسی عیب سے دوسروں کی عیب جوئی حد درجہ شرمناک  
ہے۔ لیکن تاہم ارشاد کیا، اس پردہ دری کی سنجیدہ گری کے بغیر جب یہ نہیں رہ سکتا، چنانچہ اب اس

احمال کی تفصیل ادا ہو۔

نا قوس کی نسبت لائق مسند کتاب الخراج کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اوقات نماز کے علاوہ عموماً تمام وقتوں میں اسکے بجانے کی اجازت تھی، لیکن اسی کتاب الخراج کے صفحہ ۸۰ میں اُس نے یہ کیوں نہیں دیکھا، کہ ابو عبیدہ نے شام کے معاہدے میں صاف طور پر لکھوایا تھا کہ لا یضربوا نوا قسیم قبل اذان المسلمین ولا فی روزانہ قوس نہ بجائیں، مسلمانوں کی اذان سے پہلے اور نہ اوقات اذانہم ان کی اذانوں کے وقتوں میں،

مہذا، حضرت ابن عباس سے جبکہ جُھپوں کے متعلق نئی عبادت گاہوں کے بنانے کا مسادہ پوچھا گیا تو انھوں نے جواب میں سب ذیل تقریر کی۔

اما مصر مصر العرب فلیس لہم اں یکدوا فیہ بناء و شہر عربی آباد کردیا، مصر بڑی ترقی یافتہ تھی جہاں میں ہمارے بیعتہ و امانت و لا یضربوا فیہ بنا قوس و اور نہ قوس بجاسکتے ہیں لہذا جو شہر مجاہدوں نے آباد کر دیے ہیں ان کی سرکانت العجم مصر و فتنہ اند علی العرب عربوں نے اُنہیں فتح کر لیا ہے و وہ اُنہیں نہ روکنگے ہیں و اُن میں فتنہ لیا علی حکم فلعلم مانی ہمدہم و علی العرب ان یوفوا بذر ان ہانکے بجز نہیں جو اُنکے ہمارے ہیں و عربوں کو اُن کا بیعت نہ کرے کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے بلاد عرب میں عموماً تمام وقتوں میں نا قوس بجانے کی ممانعت نہیں کی جاتی ہے اگر مسند کو بجا حذر داری اور ناحق کی ضد نے حق پوشی پر مجبور نہیں کیا ہے تو وہ انصاف سے کہے کہ نا قوس بجانے کی عام ممانعت فقہائے متاخرین کی ایجاد ہے یا یہ خود ایک طویل القدر صحابی کا فتوے ہے؟

صلیب کی نسبت مسند کا بیان ہے کہ معاہدے میں جو الفاظ تھے اُس میں یہ قید تھی لا یضربوا فی اذان، اہل الاسلام صلیباً یعنی مسلمانوں کی مجلس میں صلیب نہ لگائیں، لیکن تاملی ابو یوسف کتاب الخراج میں حضرت عمر کا یہ عام حکم شائع ہے

ولا ینھرون الصلیبان فی الامت و شہروں میں صلیب نہ لگائیں

حضرت عمر بن عبد العزیز اپنے مال کو ایک فرمان میں یوں لکھتے ہیں

فلا تدر من صلیباً ظاہراً الا کسر و محق کسی تلامذہ و فہم کما صلیب کو ڈرے اور شائع بنیبرت چھوڑو

شام کے معاہدے میں خود ہیوں نے جب ابو عبیدہ سے ہاں رخا، رست کی کہ،





ہوں بالکل نایاب از بحث تقریر کی ہے حالانکہ مورد بحث جمع خنزیر کا سائل تھا اگر اس سائل سے مصنف کو گریز بنائے تسلیم ہے جیسا کہ ظاہر بھی ہے، تو چشم مارو شن، ورنہ، کے متعلق بھی حضرت عمر کا فتویٰ تافہی ابوہریرہ کی زبان بیان سے سن لیتا چاہیے

دیر کو نسیکنون فی اصفار السلیق اسواقہم بیون اور میلانوں کے شہروں میں اور بنے ایٹ یا نہیں گئے اور ان کی ویشرون ولایہ بیون خمر اولافزیرا لہ

ازادوں میں بن دین کریں گے لیکن شراب اور سورہ بچپ میں بحث اصطلاح کے متعلق نصائے بنی تغلب یہ بحث کی گرا نا یہ تحقیق یہ ہے کہ سرنٹ تو سلم میا یو

کے بچوں کو اصطلاح دینے کی نمانت تھی، حالانکہ اس باب میں حضرت عمر سے یہ عام روایت کتاب الخراج میں آج بھی موجود ہے،

وکان عمر قد اشترط علی نصاری بنی تغلب ان لا یفسروا اولادہم حضرت عمر نے نصاری بنی تغلب پر شرط لگادی تھی کہ وہ اپنی اولادوں کو نصرانی نہ بنائیں۔

بن نضیب نے عارف میں لکھا ہے،

قال زید بن النعمان او النعمان بن زید التغلبی زید بن نعمان بن زید التغلبی نے کہا کہ بنی تغلب عرب ہیں

انہم کانتہم فہم فافہم قوم عرب یا نفون سن ابحرۃ یا اذ اور فافہم یہ جذبہ ناک ہوں چڑھاتے ہیں تو ان کو اپنے

دہم قوم ہم لکھا یا فافہم عدوک علیک فاضعت دشمنوں کو اپنے اوپر دیر نہ بنائے تب حضرت عمر نے ان پر صدقہ لگایا

علیہم الصدقۃ وشرط علیہم ان لا یفسروا اولادہم کہ دیا اور شرط لگائی کہ اپنی اور کو نصرانی نہ بنائیں،

کتاب الخراج کی ایک دوسری عبارت زیادہ مصرح ہے،

قال فصالحہم عمر علی ان لا یفسروا اعدائہم حضرت عمر نے ان سے اس شرط پر صلح کی کہ اپنی اولادوں میں سے

فی الفسراۃ ویناعفت علیہم الصدقۃ کسی کو نصرانی نہ بنائیں اور یہ کہ ان پر صدقہ دینا بند کیا جائے گا،

ان سے بیچ الفاظ سے قوم کا ثبوت جیسا کہ ظاہر ہے ایک یہی امر ہے اور احتمال یہ ہے کہ صلح کرنے سے

پہلے ان امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ بنی تغلبیوں سے صلح ہوئی تھی یعنی بنی تغلب پر صدقہ الفساعت کیا گیا

صلح یہ خنزیر کے علاوہ خود خنزیر کو ہمسایہ شہروں میں رکھنے کے متعلق بھی کتاب الخراج

نومہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ نمانت منقول ہے وہاں فرمایا کہ ان کو صدقہ خنزیر دے۔

۱۰ کتاب الخراج صفحہ ۲۷ ۱۱ کتاب الخراج صفحہ ۱۱۸ ۱۲ کتاب الخراج صفحہ ۱۱۹

تھا اور جو جزیہ دینے سے ناک بھوں چڑھاتے تھے انہیں سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ اپنی اولاد کو اعلیٰ باغ نہ دو  
اسکے سرخ مفہوم میں اگر انکی تعلیمی اولاد کا حصہ نہ ہو تو انسانا اسکو ناسخ بھی نہ ہونا چاہیے، یہی بلیری  
طبری کی روایت میں تفصیل، اسکی نسبت بعد تسلیم ممکن نہیں، البتہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ مختلف سادہ  
ہوتے ہوں یا یہ کہ نو مسلموں کے اولاد کے بارے میں خود اوسے اعلیٰ باغ نہ دینے کی شرط یا اقرار  
پیش ہوا ہو اور حضرت عمرؓ نے اوسے عموم کی شرط اعتبار کی ہو، عموم کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت  
عمرؓ کو ناسخ بنو تغلب کے اسلام لانے کا زیادہ خیال تھا اور اسلئے وہ ان پر اوروں کے مقابلہ میں سختی  
اور درستی بھی کرتے رہتے تھے کہ چونکہ یہ عرب میں اہل کتاب نہیں ہیں اسلئے تغلب کے مار کو گوارا  
نہ کریں گے اور اسلام لائیں گے۔ چنانچہ کتاب اخراج کی مذکورہ بالا روایت متعلقہ صفحہ ۱۰ کا پانچواں حصہ یہ ہے  
وامرئى ان اعلیٰ باغی تغلب قال انہم قوم اور ہجو فصائل بنی تغلب کے ساتھ۔ ثانی سے پیش لے کا حکم دیا اور کہا  
من العرب لیسا اہل کتاب فلیسلم یسلمون، کہ وہ عرب کی ایک قوم ہیں، وہ اہل کتاب نہیں ہیں شاید مسلمان ہو جائیں،  
اور اگر ہم ان بیانات سے قطع نظر مصنف کی خاطر سے تسلیم بھی کر لیں کہ واقع میں ان قومیں تغلب  
اصطلاح وغیرہ کے متعلق احکامی روایتیں عام نہ تھیں لیکہ ان میں تبدیں اور خصوصیتیں بھی تھیں جو کہ چوڑے  
دی گئیں تو اس سے ابن الاثیر وغیرہ متاخرین اہل تاریخ کے سر ہوتا کیا معنی؟ انصاف تو اسکا معنی  
ہے کہ لائن مصنف خود قاضی ابویوسف اور ابن قتیبہ وغیرہ قدامت سے دست دگر بیان دیا معاف  
لفظوں میں اقرار کرے کہ امام ابویوسف اور ابن قتیبہ وغیرہ بھی متعصب تھے، جنہوں نے ان قیدیوں  
کے مذمت کرنے میں انصاف کا خون کیا،

اسکے بعد مصنف نے بطور نتیجہ اور خلاصہ تقریر کے چند سطریں اظہار افسوس کے لیے وقف کی  
ہیں، لیکن بیجا کہ لگتا اور جامع البیان لوگوں کا قاعدہ ہے کہ انکی مولیٰ اور عام باتیں بھی کسی نہ کسی فائدہ  
زائدہ سے خالی نہیں ہوتیں، بعینہ اسی طرح مصنف نے بھی اظہار افسوس میں غریب ابن الاثیر پر ہاتھ  
مات کرنے کے فائدہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، ابن الاثیر ایک طرف، فقہا جن سے مصنف  
زیادہ خوش افتاد ہے، اور جو اسی لیے ہمیشہ اسکے موافق رہے ہیں، وہ بھی انفسب بسبب  
کے موافق حصہ رسدی سے کامیاب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔



میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان سطروں کو بطور مترجہ حال المتن کے ذیل میں کھدوں، تاکہ ناظرین کی دلچسپی کے عدادہ یہ بات بھی ظاہر ہو جائے کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے 'میں میں غماز گوی اور بالحد کی رنگ آمیزی کس حد تک ہوتی ہے'۔

”اب ہر شخص انصاف کر سکتا ہے کہ اس عام میں غماز واقع ہونے کے لیے مسلمانوں کو، اگر یہ حکم دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی گلیوں میں صلیب اور سورہ ملائیں، خاص نماز کے وقت ناقوس نہ بجائیں، اور مسلم مسلمانوں کی اولاد کو اسلحاغ نہ دیں، تو کیا کوئی شخص اس کو منصب مذہبی کے نام سے نمبر کر سکتا ہے؟ یہ تک نہیں تعبیر کر سکتا، لیکن اگر حقیقت حال کی واقعی اور اصلی تصویر دلیلی ہو تو اس کے لیے بیانات سابق کا آئینہ پیش نظر رکھنا چاہیے،

”انوس اور سخت انوس یہ ہے کہ ہائے پچھلے مورخوں نے ان احکام کی قیدیں اور غصہ منوں کو اڑا دیا۔“  
 ”ماحق پچھلوں کا نام اُچھالنے سے کیا حاصل؟ اگر زبان ہی کھل جاتی ہے اور خواہ مخواہ راست ہی نہ نظر نہ تو قرن اول سے پہلے اور زینہ بوزینہ نیچے، ترستے چلے آئے،“  
 ”بلکہ قدام میں بھی جو منصب آمیز طبیعت رکھتے تھے روایت میں ان خصوصیتوں کو چھوڑ جانے لگے۔“

”یہی کہ عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ جنہیں مصنف نے خود ہی الفاروق صفحہ ۶ میں نہایت نامور اور مستند مصنف بھی لکھا ہے، اور قاضی ابو یوسف جن کی شہرت محتاج بیاں نہیں، یہ دونوں کے دونوں منصب تھے، اور منصب بھی صرف اس وجہ سے کہ ان کی کتابوں میں مصنف کی ذاتی رائے کے علاوہ، منبر بیانات پائے جاتے ہیں،“

حقیقت میں انسان کی خود غرضی بھی مجیب چیز ہے، مصنف بتا اور مصنف ہوتا ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے، یہی مصنف ہے کہ خود اس نے رسالہ شلی صفحہ ۱۸۲ میں سات بیانات لکھائے کہ ”مسلمان ہمیشہ اس بات کے مادی ہیں کہ جو روایت ان کو ہاتھ آئے اس کو بغیر کسی تصرف اور کٹ چاکے بیا کر دیں“ اور یہی مصنف ہاں بیا کی سے ہوں غماز فرما ہے کہ پچھلے مورخوں نے ان احکام کی قیدیں اور غصہ منیتوں کو اڑا دیا، بلکہ قدام میں بھی جو منصب آمیز طبیعت رکھتے تھے روایت میں ان خصوصیتوں کو چھوڑ جانے لگے جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ ہمارے پچھلوں نے جو تصرف اور کٹ چاکے ہمیشہ میں کمال حاصل کیا، یہ ہائے اگلوں کا فیض تعلیم ہے۔ یہیں تفاوت راہ از کہا راست تا کہا۔

علا اس سے بڑھ کر کسی قوم کی پرنسپی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود اسی قوم کا ایک سربراہ اور وہ اور  
 علما ممتاز شخص ملی دنیا میں اپنی ہی قوم کی انتہا درجہ کی بے انتیاری، کینیہ خصلتی، خانت و غلبہ  
 حق پوشی، تفاق پرستی وغیرہ علانیہ بیان کرے، اور لطفت یہ کہ وہ سراسر خلافت و اتع ہو، قوم  
 کو کبھی آسمان پر چڑھائے اور کبھی تخت اثرے میں گرائے، اور باوجود ادعا سے عدل و انصاف  
 یہ سب کچھ پرچ و گراف ہو، اگر واقعی، گلے اور پچھلے سلمان، یعنی متقدمین و متاخرین دونوں ایسے  
 ہی تھے کہ وہ دینی احکام و روایات میں ضروری اور حتمی قیودوں کو بھی محض تنسبا اڑا دیتے تھے تو وہ  
 اسے واسے بریں است اسلام و دیگر بیچ

”یہ غلطیاں اگر چہ سخت نتائج پیدا کرتی تھیں لیکن چونکہ ظاہر میں خفیت تھیں ابن الاثیر وغیرہ اسکا کچھ خیال نہیں کیا“

کتنا سچا مضمون اور کیا مقبول عذر ہے

”رفتہ رفتہ یہ غلطیاں اس قدر پھیل گئیں کہ عربی زبان سرتا پا اس سے سمور ہو گئی“

ہاں تک کہ ان غلطیوں کے مٹانے یا کم سے کم اُپر متنبہ کرنے کے لیے خود وہ اکو خباب مصنف کے خلق کی  
 ضرورت لاحق ہوئی۔ تاظرین کے لیے خصوصیت کے ساتھ اس مقام پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ  
 کہ تخطیہ اور روضہ کا دائرہ اب تک توفیق کی پچھلی تصنیفات ہی تک محدود تھا، لیکن اس قول میں  
 اس دائرے کو تمام زبان عربی تک وسعت دیدی گئی، اور بات بھی یوں ہی ہے کہ انسان جب جھوٹ  
 پر آنے تو پھر اچھی طرح کیوں نہ بولے، ”نتہا چونکہ تاریخ سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے، انہوں نے بے شکست  
 انہیں غلط روایتوں کو قبول کر لیا، اور اپنی نقطہ کے مسائل تفریح کر لیے“

بہت درست، نتیجہ ابو یوسف بھی تاریخ سے جاہل تھے، کیونکہ انہوں نے بھی تو جیسا کہ کتاب الخراج  
 کے حوالہ سے سابقہ سے ظاہر ہے انہیں غلط روایتوں کو قبول کیا ہے، جو صرف اس لیے غلط ہیں کہ وہ  
 مسند شافعی مصنف زکوریہ بالا قیودوں اور خصوصیتوں سے غلطی ہونے کے بجائے معری ہیں، اور شاید  
 یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے جبکہ وہ ایک دفعہ نقیہ مدوح کی میادیت سے واپس آ رہے تھے، یہ کہا تھا کہ  
 خدا نخواستہ اگر یہ شخص ہلاک ہوا تو دنیا کا عالم ہلاک ہوا، دنیا کا عالم وہی شخص ہو بھی سکتا ہے جو خالص تاریخ  
 سے بہت کم واقف یا دوسرے لفظوں میں جاہل ہو

محمد جان

(الناظر، ستمبر ۱۹۱۹ء)

## تنقیذ الفاروق

(۲)

اسکے بعد اگرچہ ترتیب کلام کا اقتضا یہ تھا کہ معذرت کا سالہ مل گیا، لیکن چونکہ اسکے متعلق ہمارا ایک دلچسپ مکتبہ اب قائم ہو چکا ہے جو مقرب آتا ہے اور یہاں ہم نے معصفت کے خلاف اس بات کو اچھی طرح ثابت کیا ہے کہ یقیناً زنا کے معنی میں نہیں ہیں، بلکہ ذمیوں کی بحث میں اس سے مراد وہی جینیہ یا موٹا ذرا ہے جسے فقہاء کہتے ہیں، اسلئے ہم اس بحث کو یہاں قلم انداز کرتے ہیں اور بیٹے اسکے جملہ وطنی کی بحث کو سیتے ہیں۔

اس نام کی بحث میں چونکہ معصفت نے یہ امتیاز طے کیا ہے کہ اپنی عادت مسترد کے خلاف کسی شخص کو نگاہ و عنایت کا سہل نہیں بنایا ہے اس لیے ہم بھی اسکے متعلق زیادہ کاوش کو ضروری نہیں سمجھتے تاہم معصفت کے خلاف اس موقع پر اتنا ضرور کہیں گے کہ غبرانیوں کا اخراج بین اور اس کے اطراف سے جیسا کہ معصفت کا خیال ہے صرف پولیکل ضرورت سے نہیں تھا، بلکہ زیادہ نفس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ ضرورت کے علاوہ جب خود اہل خیران نے باہمی حسد کی بنا پر آپ بھلا وطن کے جانے کی درخواست حضرت عمر سے کی، اس وقت انھوں نے انھیں خارج کیا، چنانچہ بعض معصفت روایات میں کسی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، اس مقام پر معصفت ابن ابی شیبہ سے ایک روایت اس معصفت کی نقل کرتا ہوں جو سالم کی روایت سے منقول اور تفسیل السند بھی ہے، اور وہ یہ ہے



نا وکیع ۱۲۱۱ عن سالم قال کان اہل نجران  
قد بلغوا اربعین الفاً قال وکان عمر بنی النعمان  
بیوا علی السلین فتما سدوا منہم فاقوا عمر فقالوا اجلنا  
قال وکان رسول اللہ قد کتب لعم کتابا بان لا یجلبوا  
فاقتنما عمر فاجلنا ہم فذموا فاقوا فاقوا فقالوا اقلنا  
فاجلنا ان یقلیم

سالم کہتے ہیں کہ نجرانوں کا شمار چالیس ہزار تک پہنچ گیا  
تھا، حضرت عمر اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ مسلمان پڑھ  
ن پڑیں، پھر آپ ہی انہوں نے باہم سد کیا اور حضرت عمر کے پاس کر کہا کہ  
ہم کو جلا وطن کر دیجیے (رسول اللہ نے انکو ایک شہہ دیا تھا کہ وہ  
جلا وطن نہ کیے جائیں) حضرت عمر نے اس شہہ کو غنیمت سمجھا کہ درخواست خود انکی  
طریق ہوئی پھر انھیں جلا وطن کر دیا، جب وہ تادم ہو کر پھر آئے اور حکم سابق  
نسوتی اور درگزر چاہا تو حضرت عمر نے نہ مانا۔

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر اہل نجران کے اجتماع سے یائف تھے، لیکن تاوقتیکہ نجرانیوں نے  
باہم سد کی بنا پر اپنی طرف سے جلا وطن کیے جانے کی درخواست نہیں کی حضرت عمر نے انھیں جلا وطن نہیں کیا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل نجران کے پاس جناب رسول اللہ کا ایک نوشتہ تھا جس میں آپ نے  
لکھ دیا تھا کہ وہ جلا وطن نہ کیے جائیں، پھر کیونکر قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر نے آنحضرت کے حکم کے  
خلاف بغیر انکی درخواست کے اپنی طرف سے (گو سخت سے سخت ضرورت کی بنا پر کیوں نہ ہو) انھیں  
جلا وطن کیا ہو گا،

اسکے بعد انھیں مباحث کے سلسلے میں مصنف نے جزئی کی بحث بھی چھیڑ دی ہے، یہ بحث بھی  
مصنف کی معرکہ الآراء بحثوں میں سے ایک ہے، اسکے متعلق اگرچہ ہم نے ایک مختصر تنقید علی مصنف  
کے اُس قول پر کی ہے جہاں اُس نے الفاروق صفحہ ۱۶۸ میں لکھا ہے کہ جزئی کا مصروف فوجی مسائل  
پر محدود تھا یعنی اُس رقم سے صرف اہل فوج کے لیے خوراک، لباس اور دیگر ضروریات مہیا کی جاتی تھیں  
لیکن اسکے علاوہ ہم اس مقام پر دوسری بیہیتوں سے بحث کر کے مصنف کی دیانت اور تحقیق کو منظم نام  
میں لانا چاہتے ہیں،

مصنف نے اپنے اس دعوے پر کہ جزئی صرف حفاظت کا سواد منہ تھا، جہاں اور بہت سے داخل  
الفاروق وغیرہ میں لکھے ہیں، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ  
خاص سرکہ برہک کے پیش آنے کے وقت جب اسلامی فوجیں شام کے مغربی حصے سے ہٹ آئیں اور

انگو نہیں ہر کیا کہ بن شہراں سے وہ جزیرہ وصول کر چکے تھے مگر وہاں کے باشندوں کی مخالفت کا اب وہ ذرا نہیں اٹھا سکتے تو جزیرہ سے جس قدر رقم وصول ہوئی تھی سب واپس کر دی گئی، اور ان سے ضمانت کہ رہا گیا کہ جب تک ہم اس وقت تمہاری مخالفت نہیں کر سکتے، اس لیے ہم کو جزیرہ کے لینے کا کوئی حق نہیں۔"

بینک : سمجھئے کہ حضرت ابو عبیدہ نے اس نازک وقت میں عام طور پر تمام مالانہ تحت کو لکھا تھا کہ وہ ان رقم کو واپس کر دیں جو انھیں جزیرہ سے وصول ہوئی ہیں، لیکن واقعہ کی خاص خصوصیتیں جنہیں مسند نے قلم انداز کر دیا ہے یہ ہیں،

(۱) اس میں جزیرہ کی کوئی تخصیص نہیں تھی، بلکہ خراج سے جو رقم وصول ہوئی تھی اسکی بھی ایسی کا حکم تھا جو ایک معنی خیز امر ہے،

۲ اس واپسی کی وجہ میں الفاظ میں بیان کی گئی تھی وہ یہ ہیں،

انما ردونا علیکم اسواکم من نقد یا من المذموم | جسے تمہارے اس کو اس لیے واپس کر دیا کہ ہر شہر کی بنا کی سرپرستی  
وانکم تہ اشتراطہ علینا ان نلکم وانا ما نقد علی ذلک | ہے اور انہوں نے ہم سے شرط کر لی تھی کہ ہم تمہاری ضمانت کریں۔ اب اس پر  
جس سے ضمانت واضح ہوتا ہے کہ واپسی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ منصوبین نے خاص طور پر اپنی مخالفت  
کی شرط لگائی تھی جسے ابو عبیدہ نے بھی تسلیم کر لیا تھا اور اس وقت اس شرط کا ایفا نہیں ہو سکتا تھا،

۳۔ مسابحات شام میں اسیر فوج حضرت ابو عبیدہ کا ایسی شرطوں کو تسلیم کرنا اور منقودہ قہروں کو انکے معاویہ شوق کا دنیا محض تالیف قلوب کی حکمت عملی پر مبنی تھا اور اس میں غایت مغرشی کہ دوسری قومیں بھی سن سن کر مصالحت کی طرف جلد ملہ مائل ہوتی پائیں، خاص الفاظ یہ ہیں،

انما کان ابو عبیدہ یحبہم الی الصلح علی ہذا الشرط | حضرت ابو عبیدہ جو ان شرطوں پر صلح کر لینے تھے اور جن وہ  
و یطہروا سائرہ بذرک التهم و یسمع ہم غیر ہم | مانگتے تھے، انہیں دیتے تھے اس سے فخر تالیف قلوب غی وہ  
من اهل الذن و یطہروا سائرہ بذرک التهم و یسمع ہم غیر ہم | کہ در سب شہر والے جنہوں نے بھی صلح نہیں کی ہے اس  
الی طلب الصلح | بات کو نہیں اور صلح کی طرف پیش قدمی کریں،

اس سے قیاس : کہ شرط مخالفت کو عوام داخل مسابحات کرنا ایک ضروری مصلحت پر مبنی تھا  
یعنی اس لیے کہ جزیرہ کے واسطے مخالفت کی شرط ایک مایہ غیر منطک بات تھی،

۴۔ جزیے کی کل رقم واپس نہیں ہوئی تھی بلکہ صرف وہ رقمیں دی گئی تھیں جو شہروں سے وصول ہوئی تھیں، اور دیہات کی کل وصول شدہ رقمیں سب سے واپس دینے کے مسلمانوں میں تقسیم ہوئیں اور یہ بھی ایک سنی خیر امر ہے، خاص الفاظ یہ ہیں،

وماکان ابو عبیدۃ اخذ من القرۃ الی قول حضرت ابو عبیدہ نے دیہاتوں سے جو مال و متاع لے لیا وہ غلام  
المن من الاموال والبی والمتاع فلم یردہ علیہم وغیرہ ایسے نئے انھیں واپس نہیں دیا بلکہ ان کو مسلمانوں  
و قسمہ من السلیم بعد ان، الخ میں تقسیم کیا، الخ

۵۔ جو رقمیں واپس دی گئی تھیں پھر انکو دوبارہ واپس کرنے کے لیے خود باشندگان شہر اسوقت لائے جبکہ حضرت ابو عبیدہ دوبارہ ان املاک میں بڑا گھڑے اور انھوں نے شرائط سابقہ پر انھیں سب مال رکھا، خاص الفاظ یہ ہیں،

دکلمہ علی مدینۃ ماکان صالح الیہا وکانت الیہ فیما دیہ کسی ایسے شہر میں گذرتے جاں کے ہاں نے صلح کر لی تھی و ماکنہ  
قد رد علیہم ماکان اخذ منهم لفقہ بالاسوال الی کان وصول شدہ و خیرہ اور خراج کی نہیں لگا و ہن مدنی نہیں دے و و رگ پھر ان  
رد ہا علیہم ماکانوا صد لخوا علیہ من الجزیۃ و الخراج الخ مالوں کو لیکر آتے اور حضرت ابو عبیدہ سے ملے،

اب ان قلم انداز باتوں کو بھی پیش نظر رکھ کر انصاف سے دیکھنا چاہیے کہ جزیہ مقرر کرتے وقت خاص حفاظت کی شرط کو اپنے اوپر لازم کر لینا کن اسباب کی بنا پر تھا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خیال بہت صحیح ہے کہ دفع جزیہ کے بعد اکثر صورتوں میں مسلمانوں پر ضرورت تھا کہ وہ اہل ذمہ کی حفاظت کریں، لیکن کلام اس میں نہیں، بلکہ اس میں ہے، اور دیکھنا بھی خاص کر یہ ہے کہ آیا جزیہ اہل ذمہ کی صورت اس حفاظت کا معادضہ تھا جو بیرونی حملوں سے انکی کھپائی تھی، یا یہ کہ اسلام کو قبول نہ کرنے کے بعد شارع نے محض ترجمات ایک زائد صورت انکی جان بچانے کو یہ نکالی تھی، کہ وہ جزیہ دیں جس کے بعد وہ قتل سے محفوظ رہیں گے،

جاں تک میں خیال کرتا ہوں اس بحث کے متعلق مصنف کی تمام عام فرسائی کا اصل سول ایک امر معلوم ہوتا ہے، اس لیے مناسب بلکہ ضروری ہے کہ اس پر بڑی احتیاط سے انحراف نہ جائے  
سب سے پہلے جب ہم اس باب میں اسلام کی حقیقی و اصلی کتاب قرآن مجید کی طرف



مع کرتے ہیں، تو نہایت خوشی سے دیکھتے ہیں کہ اٹھ سہارے سات لفظوں میں سورہ توبہ کے اندر یہ آیت نازل فرمائی ہے

وَنَاقِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (الآیہ) اور انہوں سے مقاتلہ کر دو جو کچھ وہ نہایت دن پر ایمان نہیں لائے یہ آیت ذیبن کے باب میں بغیر کسی پیچیدگی کے نہایت واضح طور پر پکار کے کہہ رہی ہے کہ ان سے لڑو اور مقاتلہ کرو میان تک کہ وہ ذلیل ہو کر ہاتھ سے جزیہ دیں، جزیہ دینے کو مقاتلہ کی فایت قرار دینا، اسکے سرخ پستی ہیں کہ جب تک وہ جزیہ قبول نہ کریں، اُنکے مقاتلہ سے باز نہ رہو، ہاں جب جزیہ دیں تو اُنکی جان بخشی کرو،

اس سے ایک غیر متعصب انسان پسند شخص سمجھ سکتا ہے کہ جزیہ اصلی طور پر فنی حد ذاتہ کیا حیثیت رکھتا تھا؟ جزیہ صرف قتل سے بچنے کے لیے ایک پست تھی جسکی آڑ میں اہل ذمہ مسلمانوں کی قتل سے پناہ دیتے تھے، یہ شارع کا وہ قرارداد ٹکس تھا جسے دے کر وہ قاتل قوم کے قتل سے اپنے لیے ذریعہ نجات حاصل کرتے تھے، اگرچہ شارع کی نیا نیا اور مزید عنایت سے بعد میں اور بہت سے حقوق کے علاوہ یہ حق بھی اُنہیں دیا گیا کہ کیا اوقات ہیر و منی ملوں سے اُنکی حفاظت کا ذمہ اپنے اوپر لیا گیا، لیکن اس سے صحیح طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دشمنوں سے بچانے اور اُنکی طرف سے لڑنے کا ایک معاوضہ تھا جسے اہل ذمہ مسلمانوں کو بغیر اجرت و معاوضہ کے دیتے تھے، حدیث اور آثار میں اس میں اگرچہ ایسی تصریحیں جو بالکل تابع احتمالات ہوں قریباً نہیں ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ قرآن کی اس واضح تعلیم کے ہوتے ہوئے ہم کو ان تصریحات کی ضرورت بھی نہیں ہے، اگر وقت یہ ہے کہ جو لوگ مورخان، متحقق کو صرف تاریخ کی چند کتابوں کی اوراق گردانی پر منحصر سمجھتے ہیں، اُنکی تسلی صرف اُس سے نہیں ہو سکتی، اس ضرورت اور صرف اس ضرورت سے ہم تاریخی حیثیت سے بھی اس بحث پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں،

اور لاکھ وسعت نے آجہزیہ میں جہاں یزدگرد کے پاس نمان بن مقرن کا سفیر کے جانا لکھا ہے وہاں نمان کی سفارتی کونگو کا خاتمہ مع ترجمہ یہ بیان کیا ہے،

ان انقیود الباجزا و تہا باہم غلام (یوں مگر یہ کہ وہ بے جان ہوا کے زہم نول کے بجائے ان کے ہوش سے ہوا کے

انتساب سے گھو کیا یہ اس بات کی تصریح بلکہ اقراء نہیں ہے کہ جزیرہ دراصل زمیوں کے لیے مسلمانوں کے  
 ہاتھ سے جان بچانے کا ایک ذریعہ تھا، لیکن نظر مبصاح اُس کے ساتھ مزید رعایت یہ تھی کہ مسلمان اکثر اُن کی  
 بیرونی مخالفت کا ذمہ بھی کر لیتے تھے، (تقیستونا کے لفظ پر غور کرو پھر مستحکم کی الگ تصریح رکھیو)  
 اُن کے علاوہ شام کی فتح میں جب مالک مفتوحہ کی تقسیم اور رعایا کے لونڈی غلام بنانے کے سلسلہ میں  
 فوج کا اسرار ہوا تو حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہؓ کو جو ابلی فرمان بھیجا تھا اُس میں: الفانائے

لابیل تک علیہم واللسلین ملک ان نعلام فیئنا  
 و تقسیم فسلح الذی جوی بنیک و بنیم ولا تذك  
 و ابخرتہ منہم بقدر طاقتہم + + + فاذا اخذت منہم  
 ابخرتہ فلما شئ ملک علیہم ولا بیل + + + فانرب علیہم  
 ابخرتہ و کف عنہم البیئہ  
 تم کو اور غمار سے ہمراہی مسلمانوں کو آپ یہ حق نہیں ہے کہ تم اُن کو  
 نئی قرار دیکر باہم بانٹ لو اس لیے کہ تم میں اور اُن میں صلح  
 ہو چکی ہے اور تم نے اُن سے جزیرہ بھی لے لیا ہے + + +  
 جب تم نے ان سے جزیرہ لیا تو آپ تمہارا کوئی حق اپز نہیں ہے  
 + + + اپز جزیرہ مقرر کرو، اور لونڈی غلام نہ بناؤ،

ان الفانائے صات طبر پر جو جزیرے کی اصلیت سمجھائی گئی ہے، ظاہر ہے، یعنی یہ کہ جزیرہ بجائے اسکے  
 کہ اہل ذمہ کو اُن کے بیرونی دشمنوں سے بچانے کا کوئی معاوضہ یا بدل ہو، وہ خاص اُن کی جان بخشی کا  
 معاوضہ ہے، اور جب شایع نے جزیرہ لیکر اُن کی عقب گزاری اور جان بخشی کا حکم دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں  
 ہے کہ مسلمان جزیرہ لینے کے بعد بھی اُن کے نفوس سے تعرض کریں، اور انھیں ناجائز طور پر لونڈی غلام  
 بنائیں، قاضی ابویوسف کتاب الخراج میں ایک جگہ صات صات لکھتے ہیں،

ولا یحل للوالی ان یدع احد امن الفساری والیہو  
 والجوس والصابین والسامرة الا اخذ منہم الجزیرۃ  
 + + + لان دماؤہم واموالہم انما احزرت ابادا  
 محبترۃ ستہ  
 حاکم کو یہ جائز نہیں ہے کہ نصرانیوں اور یہودیوں، مجوسیوں  
 صابیوں، سمریہ میں سے کسی کو بھی بغیر جزیرہ بے چھوڑے  
 اس لیے کہ جزیرہ ہی کے دینے سے اُن کے خون اور مال و دولت  
 بچائے گئے ہیں،

لے سرکہ فارسی میں سے رستم سے سفارتی گفتگو کرنے کے لیے رہی بن نامہ کو بھیجا تھا انھوں نے بھی اپنی تقریر میں صات صات فرمایا تھا  
 اخذنا الاسلام و ذلک ارشاد اور الجزیرۃ نقبل و کف ملک ان اجبت الینا نصرناک اور الناجۃ فی الرابع الجزیرۃ فرمادیا ہے  
 صفحہ ۹۵ - ابن خلدون اس عبارت میں بھی فضل و کف ملک اور ان اجبت الینا نصرناک کو غور سے پڑھو اور سمجھو کہ فرمایا  
 رہی رستم جزیرہ کی حقیقت کیا سمجھے ہوئے تھے۔ ستہ کتاب الخراج صفحہ ۸۲ ستہ ایضاً صفحہ ۸۰،

آخری جملہ پکڑے گا کہ ہے کہ جزیرہ دراصل کوئی اجرت : قسمی بلکہ وہ جان بخشی کا معاوضہ تھا جس کے بعد اہل ذمہ کی جان و مال سے تعزیر نہیں ہوتا تھا،

اس قدر کہنے کے بعد اب ہم مسنف کے اور استدلالات پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔  
النازق اور خاص کر الجزیرہ میں مسنف نے اپنے دعوے کو ثابت کرتے ہوئے مختلف معابدات کی ان عبارتوں سے بھی استناد کیا ہے جن میں بیان ہے کہ ذمیوں سے فوجی خدمت لینے کی صورت میں جزیرہ معاف کر دیا جائے، بلکہ اُس کے استدلال کا ایک کافی حصہ ایسی ہی عبارتیں ہیں، لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی حاکم یا بادشاہ کے اس نسل سے کہ وہ اپنی محکوم رعیت سے کسی نمایاں خدمت سے سبقت ہو کر اپنا کوئی حق اُسے معاف کر دے، یہ کیوں ثابت کیا جائیگا کہ اصل میں بھی وہ حق اُسی خدمت کا معاوضہ تھا،

مثلاً آج کوئی زمیندار اپنی کسی رعیت سے مرث اس لیے خوش ہو کر برس دو برس کا خراج ملے معاف کر دے کہ اُس نے زمیندار کو اُس کے دوسرے کے وقت شکار میں مدد دی تھی، یا یہ کہ اُسے ایک نازک موقع پر مثلاً شیر کے حملے سے بچایا تھا، تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقع میں ہی خراج و شکار میں مدد دینے یا شیر سے بچانے کا معاوضہ تھا؟

مہذا، اگر خود فرضی نے مسنف کو خلاف گوئی پر مجبور نہیں کیا ہے، اور فی الواقع امر حق کے انکشاف دل سے چاہتا ہے تو ہمارے نزدیک اُسکو چاہیے کہ وہ قدرت کے اُس بیش بہا علیہ سے سبنا نہ آئے ہو۔  
ہرے طور پر کام ملے، یعنی اگر اُس نے اب تک مرث ایک آنکھ سے اُن معابدات کو دیکھا ہے جن میں خاص خاص موقعوں پر جزیرے کی معافی مذکور ہے، تو اب وہ دوسری آنکھ سے ذیل کے اُن معابدات کو بھی دیکھے جن میں نہایت صاف اور کھلے الفاظوں میں اصل و مال کی تائید کے علاوہ اسکی بھی تصریح ہے کہ ہم جزیرہ لینے کے باوجود بھی تمہاری حفاظت اور تمہاری طرف سے لڑنے کے ذمہ دار نہیں ہیں،

یہ معادے مورخ بلاذری نے فتوح البلدان میں نقل کیے ہیں اور ہم اُسی کے حوالہ سے اس مقام پر لکھتے ہیں۔

پہلا معاہدہ جس میں مسنف کے خلاف اس بات کی صاف تصریح ہے کہ ہم جزیرہ بھی لیں گے اور مہذا تمہارے دشمنوں سے لڑیں گے بھی نہیں، کتاب فتوح البلدان بلاذری میں یہ اس الفاظ میں منقول ہے،



فما لحکم علی سببہ العت رمانتی دنیا ریوود تہانی | ہجران سے سات ہزار دو سو دینار سادہ اور اگر زبردستی کی اور رومیوں  
 کن عام و دعا لہم الروم علی شکاک ذلک ہم یو | نے بھی ان سے لٹے ہی پر صلح کی زبردستی ہر فرات اور تہ کے اٹل شری  
 خراجین و اشترطوا ان لا یمنعہم المسلمون ادا صلح | سلمانوں سے یہ تھی کہ مسلمان انہیں دینوں کو رقم صلح اور ایک سب  
 الی الروم و اشترط علیہم المسلمون ان لا یقاتلوا علیہم | سنہ نہ کریں اور مسلمانوں نے یہ شرط کرنی تھی کہ وہ جنگ و دشمنی کے ساتھ  
 من ارادہم من وراہم وان یؤذوا المسلمون بـ | انکی حرمت سے نہیں لڑیں گے اور ان لوگوں پر مزہد تھا کہ وہ مسلمانوں  
 مددہم من الروم | کو دشمنوں کی نفس و حرکت سے اٹھاس بھی دیں۔

دوسرا معاہدہ جس میں علی رضی اللہ عنہ اس بات کی تصریح ہے کہ جزیرہ برقرارہ اور اگر کسی وجہ سے  
 ہم ہماری مخالفت یا مدد کر سکے اور تمہارے دشمن پھر غالب آجئے تو اسکے ہم جواب دو نہیں  
 اور یہ امر ناقض عہد ہو سکتا ہے خاص الفاظ یہ ہیں،

وان اتیمم و اتمم العداۃ تا فواتنا فی الدین | اگر تم نے رجوع کیا اور منافقین قائم رہیں تو میں سے دین پر جزیرہ  
 والا فاجزیہ ملککم وان عرض المسلمین شغل عنکم فتمکم | قرار ہو گا اور اگر مسلمانوں کو کافی مشغول ہیں انکی اور تمام دشمن پھر غالب نہ ہو  
 مددکم نفیر ما خو ذین بذلک لا یونا قرض عہدکم | اسکے نہ تو وہ جواب دہ گے اور نہ یہ امر بات غرض عہد ہو سکتا ہے  
 تیسرا معاہدہ اس میں یہ تصریح ہے مخاطب (جو ایک معزز نصرانی تھا) اگر اپنے دین پر قائم رہے تو  
 جزیرہ دینا لازمی ہے یا ا غاظہ دیگر غیر مذہب شخص کا اپنے دین پر قائم رہنا ہی اسباب جزیرہ کے لیے کافی  
 ہے، کما سبق مثانیہ سبق، خاص الفاظ یہ ہیں،

ان جبلة استے عمر بن الخطاب ہو علی نصرانیۃ فرض | جبہ سات نصرانیوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا حضرت رستا پھر  
 عمر علیہ السلام و اداء الصدقة فابے ذلک قال | اسلام پیش کیا اور زکوٰۃ اور کونے کو کما آئے انکار کیا اور کہا میں اپنے  
 اقیم علی دینی و ادوی الصدقة فتمال عمران قت | دین پر قائم ہو گا اور صدقہ زکوٰۃ داکر و نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ لکھا اگر تو  
 علی دیک فاد الجزیۃ فانف شہا | اپنے دین پر قائم رہے گا جزیرہ سے اس پر سننے تاک ہوں چڑھائی۔

چوتھا معاہدہ اس میں مسند کے خلاف اس بات کی تصریح ہے کہ جزیرہ اور خراج پر جو صلح  
 واقع ہوئی وہ اس بنا پر ہے کہ مقتوحین قتل نہ کیے جائیں اور نہ انہیں اونٹنی غلام بنایا جائے وغیر  
 صلح اہل الدامان و درایا ذقیۃ علی الجزیرۃ و | اور اسان اور درایا ذوالوں سے جزیرہ و خراج پر عہد صلح

الخزان علی ان لا یقتلوا ولا یسبوا ولا ینفوا طریقا | اگر لی اس شرط سے کہ وہ سب نہ ہوں، اور نہ کوئی مذہب چاہے  
 سلوئے | اور نہ اپنے اختیار کردہ طریقے سے۔ وگے بایں،

ب۔ اگر انصاف اور انصاف کے ساتھ خوب مذاہب ہو تو مصنف کو چاہیے کہ وہ ان مذاہب  
 کو بھی پیش نظر رکھ کر بتائے کہ ان سے جیسا کہ مصنف کا خیال ہے آیا ثابت ہوتا ہے کہ چیز صرف  
 بیرونی حفاظت کا معاونہ یا حق المحدث تھا؟ یا یہ کہ خیالات اسکے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حسب  
 فی حد ذاتہ ایک ذریعہ ہاں بخشی تھا جس سے غیر قومیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے اپنی جان و مال پر کئی قسم  
 گو کہ اکثر انکی بیرونی حفاظت کا ذمہ بھی مسلمان کر لیتے تھے،

یہ بات کہ چیز لینے کے باوجود بھی ہم تمھاری حفاظت کے ذمہ نہیں، جیسا کہ پہلے اور دوسرے مذاہب،  
 اسکے الفاظ صاف صاف تبار ہے ہیں، ایک نہایت روشن دلیل اس امر کی ہے کہ چیز فی الواقع  
 کوئی اجرت یا حق المحدث نہ تھا، اور کہ مصنف نے جو کچھ اُسکا متنا سمجھا ہے غلط ہے،

معزز ناظرین! یہ بھی مصنف کے اُن مباحث کی حقیقت جن کی بنا پر اُس نے فقہاء متاخرین  
 اہل تائید پر نہایت رک ایک الزامات عائد کرنے میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیے ہیں۔ جن کے  
 انکشاف نفس الامری کو وہ اپنے محققات میں سے سمجھتا ہے، اور جن کے متعلق بڑی بیباکی اور انصافی  
 کے ساتھ اُسکا یہ خیال ہے کہ نہ صرف متاخرین علماء بلکہ قدامت بھی ایک مدت دراز سے غلطی و جہالت میں  
 گرفتار رہے آتے ہیں،

حوالت کے لحاظ سے اب میں اس بحث کو یہیں ختم کرنے کے بعد چاہتا ہوں کہ اپنی اس تفسیر کے  
 خاتمہ پر بعض اُن اختلافی مباحث پر بھی ایک روشنی ڈالوں، جن کی نسبت مصنف کا خیال ہے کہ  
 وہ بھی متعصب فقہاء کی تلک گیری کے نتائج ہیں، اور جن کا ذکر مصنف نے اپنی کسی نہ کسی تصنیف  
 میں مخالفانہ و معترضانہ پیرایہ میں کیا ہے،

ان مباحث کے سلسلے میں ایک سلام کا سارا ہے جس کے متعلق مصنف نے رسائل شامی صفحہ ۶۵  
 میں لکھا ہے کہ

”خلافوں کی طرف سے ایک خود متعصب مسلمانوں کی طرف سے بڑا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود یہ حکم دیا تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو سلام نہ کرو + + + یہ اور ہی

قسم کی روایتیں بہت زیادہ فہرت پر لگتی ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس راز سے بالکل پردہ اٹھا دیں

تم کلامہ اسے بہت معصفت نے اپنی عادت ستم کے موافق پردہ اٹھایا ہے، لیکن چشمہ پر دور، اس میں مجھ پانہ  
انما زے، کہ خود اس پر جسے کو اٹھا کر اپنی ہی آنکھوں پر ڈال لیا ہے، ورنہ یقیناً کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کو  
صحیح مسلم جیسی حدیث کی نہایت معروف، مستند کتاب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذیل کا  
حکم جو کہ یہود و نصاریٰ ہی کے باب میں ابتدا اسلام کی ممانعت کے متعلق ہے نظر نہ آتا، یعنی

لا تجدوا الیہود والنصارى بالسلام المحمدي لے الیہود و نصاریٰ سے ابتدا و سلام نہ کرو۔ الا

اب میں نہیں سمجھ سکتا کہ جن سچے اور نیکدل مسلمانوں نے اس ارشاد نبوی کے موافق کوئی واقعی ہتھکڑی  
پیش کیا، خواہ خواہ کیوں متعصب ہو گئے؟ اگر وجہ تعصب صرف یہی ہے کہ انہوں نے حدیث صحیح کے  
مطابق ایک بات کہی تو سیرت نزدیک ہر مسلمان نہایت خوشی سے متعصب بننے کے لیے آمادہ ہو گا، اور  
بے شبہ سچے مسلمانوں کے نزدیک ایسا تعصب شرافت اسلام کا تقاضا ہے، سلام ہے،

مسیحیت یہ ہے کہ یہاں تو حدیث صحیح کے مطابق ایک بات کہنے پر جناب معصفت کو ایسا جوش  
آیا کہ بخود چکر اٹھوں نے متبعان حدیث کو فوراً متعصب کہہ دیا، اور ساتھ ہی بالوقت پردہ اٹھانے  
کی بھی ٹڈی درا دی، لیکن خیر سے آپ ہی رسائل شعلی صفحہ ۴۷ میں یوں ذمہ پیرا ہوتے ہیں کہ  
”سلام صرف ان مسائل اور احکام کا نام ہے جو قرآن مجید یا احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں، اسکے سوا ہر کچھ

بے گراں ہے تو میں اور ملک میں کوئی اعتبار حاصل کر لیا ہوں، لیکن وہ اسلام کا اصل قانون نہیں ہے“

۱۵۔ کتب التیسرین ابن حجر صفحہ ۳۷۹ بحوالہ مسلم برادیت ابی ہریرہ، انہیں کے علاوہ انوار تودی وغیرہ کتب حدیث میں بھی  
یہ روایت موجود ہے۔ ۱۱

۱۶۔ لغت کی بات بہرہ۔ اسی ابتدا اسلام کی ممانعت کو شاد ولی اللہ صاحب جو اسرار و حقائق میں نے بہت بڑے سبب سے بیان فرمایا

ایک صحیح ثابت سائل اگر کتاب حوالہ صفحہ ۳۷۹ میں اسلام بیرون بیان کرتے ہیں ان قول سرور ان اعدی المسلمین یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم، انہوں  
باللہ او ساریہ و جہاد اعلیٰ اعلیٰ و بلہما لا یخفق الا بان کون لہم لحوال میں ہوا ہم۔ مگر جناب معصفت اس کو ایک غیر شرعی اور بعضی بات کہتے ہیں بالادک  
شاد و متالی نسبت خود مسند نبی با خود ہے کہ وہ اپنے خمنس تے کہ اٹھ کتہ ہجوں کے آگے قرآنی، رازی اور ابن کثیر کے دلائل ہی انہیں لگے۔



بکا حاصل یہ ہے کہ ابتدا اسلام کی مخالفت یہود و نصاریٰ کے متعلق جو آن حضرت سے بطریق صحیح مروی ہے اور جو صحیح مسلم بیسی حدیث کی نہایت متبرک کتاب میں آج بھی موجود ہے، وہ خود جناب مصنف ہی کے بیان کے مطابق اسلام کا حقیقی سادہ ملک عین اسلام ہے،

ایک اور مقام پر یعنی رسائل شبلی صفحہ ۵۸ میں یوں ارشاد ہوتا ہے کہ

”پوری دنیا اپنے منصب پر بحال رہیں گے، اور نہ ہی سے کچھ فرض نہ کیا جائیگا، یہ خاص رسول اللہ

کے احکام ہیں اور اس لیے دوسرے لقوٰں میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ خاص اسلام کے احکام ہیں“

بھان اللہ! یہ عجیب و غریب منقول ہے کہ جو بات حدیث صحیح سے ثابت ہو، وہی اسلام اور اسلام کا قانون بھی ہو، اور وہی جناب مصنف کے نزدیک منصب بھی ہو، رسول اللہ کا خاص حکم، اسلام کا خاص حکم جس ہو، اور وہی وہ بات بھی ہو جسے ماننے سے غریب سلمان کٹر، متعصب بھی کہلائیں،

تغویر تو اسے چرخ گرداں تھو

جناب مصنف نے تہی عبادت گاہوں کے بنانے کے مسئلہ کو بھی جیسا آپس نے ذکر کیا ہے القاری میں صرف نقل اعتراض کے موقع پر ذکر کر کے بے جواب چھوڑ دیا ہے، اگرچہ اسکے متعلق مختلف تحریریں ہیں مصنف کی مختلف سداہیں اسکی بادرہشی کا اعلیٰ ثبوت ہے یہی ہیں، چنانچہ رسائل شبلی صفحہ ۵۸ میں مخالفین کے اس اعتراض کو کہ مسلمانوں کے عہد میں نے گرجاؤں یا عبادتوں کے بننے کی اجازت نہ تھی نقل کر کے دیا لکھا ہے کہ یہ انکی سرسری معلومات کا نتیجہ ہے، حالانکہ سیرۃ النمان صفحہ ۲۰۰ میں یوں لکھا ہے کہ

”آیتہ اہم ابو صفیہ نے یہ حکم دیا ہے کہ اہل ذر اسلامی شہروں میں اپنی عبادت گاہیں بنائیں، لیکن ان کا قصد

صرف اس قدر تھا کہ امن و امان میں خال نہ ہو۔ الخ“

اسکے بعد ہی اسی صفحہ میں ارشاد ہوتا ہے

”مسلمانوں کے آباد کردہ جو درہاں شہر تھے ان کے سوا باقی تمام ملک میں ملوث آذہوں کو عبادت گاہوں کے بنانے

کی اجازت تھی“

بجائیکہ رسائل شبلی صفحہ ۵۸ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہوتا ہے کہ قدیم



اُنہ مجتہدین کے احکام نہیں ہیں، اسی کے ساتھ ہمارا یہ بھی دعوے ہے کہ یہ احکام کسی زمانہ میں رواج نہیں پائے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں مصنف کو چاہیے کہ وہ اس پچھلے غلط اہل تک، اور اہل دعوے کو تو صندوق سینہ میں مقفل کر کے رکھ دے، اس لیے کہ قلع نظر اسکے کہ یہ ایک اداسے محسن و کسی اسلامی حکم کا کسی زمانے میں رواج نہ پانا یقیناً اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ حکم واقع میں بھی اسلامی احکام کے دائرے سے باہر ہے،

ابنہ دعوے اول قابل لحاظ ہے، لیکن میں مصنف کے خلاف غلطیہ کہتا ہوں کہ یہ دعوے بھی محسن غلط اور بے بنیاد ہے، منجملہ اُن چند باتوں کے ایک یہ بات کہ ذمی راستہ میں مسلمانوں سے بچکر چلیں، اسکے متعلق صاف طور پر حدیث صحیح موجود ہے کہ راستہ میں ذمیوں کا تاؤ یا مسلمانوں سے بچکر نکلنا تو کیا، نو سلطان اگر راستہ میں ذمیوں سے ملیں تو انکو ملنا تاک، راستہ کی طرف جانے پر مجبور کریں، ملاحظہ ہو "مختصر بحیرہ صفحہ ۳۷۹ میں صحیح مسلم کی یہ حدیث بروایت ابو ہریرہ

اذا تقیموہم فاضطروہم الیٰ ضیق الطريق | جب تم اُن سے راستہ میں دوڑاؤ انھیں تاک، راستہ کی طرف جانے پر مجبور کر دو، پروردگار کے الفاظ یہ ہیں اذا تقیموہم فی الطريق فاضطروہم الیٰ ضیق الطريق، اس حدیث صحیح کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے جو یہ کہے کہ مذکورہ بالا حکم رسول کا حکم نہیں ہے؟ اور حکم رسول ہونے کی صورت میں کون ہے جو یہ کہے کہ اس کا حکم نہیں؟ تو اس علیہ احکام اہل بیت و المجتہدین، لہذا مانعت نے رسالہ شبلی صفحہ ۳۷ میں یہ بھی فرمایا ہے کہ

"اسلام نے اور اسلامی مجاہدوں نے کسی پر تادمہ نہیں بنایا کہ انھیں رویت نہ ہو انکو نابالغ قہر کے حقوق

نہیں مل سکتے یا انھیں نابالغ مدد سے فوج قوم کے بڑاؤ کے ساتھ منہ دوس ہیں"

لیکن شاید انکو استحقاق دہی و ان وہ پوری روایت یاد نہیں رہی جس میں خود حضرت عمر نے اسی استحقاق سے نہایت واضح طور پر فرمایا تھا کہ

انہ لکل لی ان استعین بک علی الامۃ المسلمین و | مجھے : ہاں نہیں ہے کہ تجھ سے سلازوں کے امنی کاموں میں  
ست علیٰ دینہم | مردوں جہاں کہ تو ان کے دین پر نہیں ہے،

کیا اس سے اہل بیت : نہیں سمجھ میں آتا کہ غیر ذہب الوں سے ایک مذہب یعنی مسلمانوں



کے مان اور انہی کا ہوں پر مطلقاً مدد لینا حضرت عمر کے نزدیک جائز نہ تھا؛ شاید اسکا جواب مصنف کی طرف سے یہ ہو کہ حضرت عمر کی تکوینت اسلامی حکومت نہ تھی۔

ہاں خوب یاد آیا لکھنؤ میں پکاٹھی کتنے کے سالہ کو بھی مصنف نے الفاروق ہی میں ذکر کیا ہے لیکن وہی کہ جوش کی حالت میں حضرت عمر کی طرف سے اعتراض تو ہونا بیٹھے مگر جواب دیتے وقت نام جو لفظ سے رکھا تو پھر اٹھا تا قسم تھا، بے شہادہ اکابر فقہاء کو مورد الزام و مستوجب ظلم بنانا ایک آسان کام ہے، لیکن اُنکے خلاف اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا کہ اُنہوں نے جو کچھ کیا وہ انکی تو ایجاد اور یہی کاربند ہے، البتہ کاسے دارد، سالہ بالا کے متعلق فقہاء پر سے الزام اٹھانے کے لیے میرے نزدیک صرف تاحی ابو یوسف کی کتاب الخراج سے استناد کافی ہوگا، دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۲۷۷ میں حضرت عمرؓ بعد از کئے فرمان کی عبارت ذیل،

ولا یرکبن یودی ولا نصرانی علی سرنج و لیرکب علی اکات | کوئی یودی اور نصرانی پالان کے سوارین پر نہ بیٹھے، اُن کی ولا یرکبن امرأۃ من نسائهم علی رحالہ و لکن رکوبیا | عورتوں میں سے بھی کوئی عورت کچاڑے میں نہ سوار ہو، بلکہ علی اکات | اُسے بھی پالان ہی پر سوار ہونا چاہیے۔

کنز العمال ج ۲ صفحہ ۲۹۶ میں خاص حضرت عمرؓ کا ارشاد ان لفظوں میں منقول ہے،  
وتنصوہم الرکوب الی الاکات عرشاً | دیکھو پالانوں کے سوارین و غیرہ پر بیٹھنے سے منع کرو پالان پر عرشا سواروں  
”اکت“ کے لفظ پر اس وقت میرا ذہن مصنف کی ایک خوش فہمی کی طرف منتقل ہوا ہے جو اب سے پتلے خود اُسی کتاب سیرۃ النعمان صفحہ ۲۵۰ و ۲۵۱ میں خاص اُسی کے قلم سے بیان شدہ ہے، اس خوش فہمی کی طرف ذہن کا منتقل ہونا تھا کہ عمارؓ نہایت ہی بادائی، جو عام طور پر مشہور ہے اور اکثر بیان کی جاتی ہے کہ کسی قلم نے اپنے نئے میں شربت بنفشہ اور آلو بخارا لکھا تھا، لیکن مصنف ایک تیز طبع طالب علم کو پڑھنے کے لیے دیا گیا تو اُنہوں نے دیکھ کر تیز مچ گئے شربت بنفشہ کو شربت بنفشہ اور آلو بخارا کو آلو بخارا پڑھا۔

میرزا آفرین ذرا متوجہ ہو کر سنیں (کیونکہ ایک خوش فہمی کی خوش فہمی کو سراہنا ہے) اکتان مصنف سیرۃ النعمان صفحہ ۲۵۰ و ۲۵۱ میں بخوارہ جامع صغیر امام محمدؒ کہنے ہیں کہ ”امام ابو حنیفہؒ سے جو کچھ اسباب میں مروی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ وہی زنا باز تھیں اور ایسے ذہن پر سوار ہوں جن کی شکل تعالیٰ کی سی ہوتی ہے (ہتھیلی کا لفظ پیش نظر ہے) اب جامع صغیر کے الفاظ بھی اہل مذہب (اہل تماشیا) کے منقول ہیں

اب اس قدر لکھنے کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ غالباً دیوں کے مذکورہ بالا احکام کے متعلق کسی مزید بیان کی حاجت نہیں رہی مصنف نے جس ذمہ دعوے سے ان احکام کو خواہ مخواہ متاخرین فقہاء کی ایسا دور اور انکی ذہنی تنگی نظر کی کاتبہ قرار دیا تھا اسکی ایک حد تک کامل اعتبار کے ساتھ اپنی پارچہ ہو چکی، مستتر تاہم انہوں اور صحیح احادیث کے حوالہ سے ہر ایک حکم کے متعلق دیکھ دیا گیا کہ وہ بجا ہے اس کے کہ کسی پچھلے عالم کی کوئی راقی ایجاد ہو، خود جناب رسول اللہ کے صحابہ کے، ائمہ مجتہدین کے احکام ہیں، ایسی صورت میں تاثرین قیاس کر سکتے ہیں کہ مصنف کا وہ مایا نہ جوش جیسے اثر سے اُس نے متاثر ہو کر "حقوق الذہیین" میں یہ لکھ دیا ہے کہ "ہمارا یہ دعوے ہے کہ یہ احکام نہ ان کے رسول کے، صحابہ کے، ائمہ مجتہدین کے احکام نہیں ہیں" کیا ٹھنڈا اور بے بنیاد جوش تھا

مہذا یہ بھی معلوم ہو گیا کہ علی مقامات اور فاسل مکرمہ جیسا کہ دوران بحث میں مصنف کی تحقیق! معلوم کس قدر امانت و دیانت کے اصول پر مبنی ہوتی ہے، بلکہ بالانہیہ الانصافی خود جناب مصنف کے اندر آج دیانت و انصاف کا اعلیٰ جوہر کہاں تک موجود ہے، اور ناسکر متاخرین فقہاء و اہل تاریخ پر فرضی الزامات مانڈ کرنے میں مصنف کو کیا سچا شوق اور کیسی گہری دہشت ہے کہ ناہی اسکی کوئی تصنیف بلکہ تصنیف کا کوئی حصہ بھی اسکی اس الزام پرستی کی ناہیاں خصوصیت سے لانی نہ دکا جائے کہ بیشتر اور اکثر مقامات میں فاسل مکرمہ حقوق الذہیین کی طویل طویل بحث کے موقع پر جہوداً مصنف کی تمام تلی کوشش باطل غالب مرحوم کے اس شعر کی مصداق ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵ کا)

ہوں، دیو خدا اہل الذمہ باغلامہ منجیات والارکوب علی السروج النبی بی امینۃ الآلئ ز آخر جامع سفیر صفحہ ۱۲۳

دیکھ خوش فہمی اس کا نام ہے کہ "اگت" جو کتب کے وزن پر اکاوت کی جمع ہے اور جس کے سنی پلان کے ہیں وہ "اگت" کتب کی جمع پڑھا گیا، اور اُس کے سنی پہلی کے بنائے گئے جو مقام سے انصافاً کہو کس قدر مہیاں ہے؟ اگر جو ہم نے اور تم نے پہلی اور پہنچے کی شکل کے ذہن آج تک دیکھے اور نہ سنے ہوں گے، لیکن کیا ہوا ممکن ہے کہ جناب مصنف کے عالم خیال میں ایسے بھی زمین ہوں جو پہلی اور پہنچہ نہ کیا ہو، ہر تلو سے اور ایڑی کی شکل کے ہونے ہوں حقیقت میں انسان جیسے اس وہ جو خوش فہم ہو اکابر کی نکتہ چینی کے لائق ہی کہ ہو سکتا ہے ضرور کہ قوم کے سلم اثبات ملایا کی شخص فرضی غلطیاں نمایاں کرنے کیلئے کہہ سکے ہی نہ ہی کہہ پڑا اور اہل بیاباں بند پر راز دہن ہونا چاہیے بے شک قدرت کے فیاض انھوں نے آج چشم بدور ہمارے

شہر انصاف جناب مولوی ثبلی صاحب کو عطا فرمایا ہے





ہو وہ فی الواقع بھی ایسے ہی تہسب ہیں جیسا کہ مصنف نے محض اپنی ذہنی بات سے غلط طور پر انھیں تہسب ثابت کرنا چاہا ہے؟ کیا دراصل انھوں نے حقوق اہل اہل کے متعلق امارتِ شیعہ یا اہل اہل کے مرناسے راشدین و ائمہ مجتہدین کے خلاف کوئی غلط ساز یا شہرتِ بائیس تہسب نہ ہی کی بنیاد پر کیا ہے؟ کیا دراصل صحیح ہے کہ متاخرین فقہاء اور متاخرین اہل تاریخ نے عام اس سے کہ وہ تہسب نہ ہی کی وجہ ہو، یا نسبتِ مذہب، نقصانِ سلامات، تاریکی، زمین، وغیرہ وغیرہ کی بنیاد پر ہو، امارتِ شیعہ اور آثارِ صحابہ میں سے بعض ایسے ایسی انسانی اور فزونی خصوصیتیں اُڑا دی ہیں کہ جن کی بنیاد پر آج سے نہیں کہہ مصنف کے بے بنیاد دعوے کے موافق مدتِ دراز سے امامِ انیس ایک ماگیر عالمی پہل گئی ہے۔ سرت میں نہیں کہ خریب عربی زبانِ اہل سر سے پاؤں تک اور ایڑی سے چوٹی تک غلطی ہی غلطی میں لٹ پٹ ہو گئی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷ کا)

(۷) آگے چل کر مصنف کہتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کہ گزشتہ اہل ذہن و ادبی مرد کی ہوتا ہے وہ عورت سے مساوات ملتا ہے اور جس قدر چاہے ملے سکتا ہے، علاوہ یہ صریحاً انصافی ہے کہ عورت بیگناہ بھی ہو اور مساوات بھی ادا کرے لیکن علتِ بدت کو بھی صریحاً انصافی کہ عورت بے گناہ بھی ہو اور مساوات بھی ادا کرے امام ابو حنیفہ کے مذہب میں بھی ہے، یعنی اُن کے نزدیک بھی مذکورہ بالا صورت میں مرد و عورت سے مساوات ملنے لے سکتا ہے (ماخذ ہر حدیث اللہ متوفیہ میں مسیحی، مکرہات کا عقد) لیکن نقدِ مفتی کی ترجیح کے موقع پر جہاں مصنف نے اہل بیت سے قابلِ قدر انصاف کیے ہیں وہاں اُس کا ایک خوشروانی انصاف یہ بھی ہے کہ گزشتہ سال ۱۱۷۷ھ میں امام ابو حنیفہ شافعی میں وہی حکم انصافی ہے اور مذہبِ حنفی میں نہیں (دیکھو ملاحظہ فرمائیے اور یہ قسم کے بیہوش دوسرے مسائل ہیں کہ جن کے صرف نقل میں مصنف نے غلط کر کے گناہ ہیں)

۱۲ نقل پر رد اور دلائل و دلائل میں مصنف اپنے نہیں دوسرے اہل علم سے کسی قدر زیادہ مزا دیکھتا ہے، کوئی: نہ خیال کرے کہ وہ صرف انصاف و حق، اہل اہل و حق میں بھی صرف سمجھت حقوقِ الہیہ ہیں کے ساتھ ساتھ ہی ہے، نہیں، بلکہ جنابِ مصنف نے اپنے اس جوہر کو اپنی نام نہاں میں مٹا دیا اور سیرۃ النہاں میں خصوصاً بہت بھی جمع سے چکا ہے سیرۃ، جس میں نقد اور فخر نقدِ مفتی کے پاس میں تحقیق و تدقیق کی بہت سی جگہ اور اگلیاں گائی گئی ہیں ۲۰ غزین: نجف سے دیکھیں گے کہ مصنف نے اس میں غلطی واری کیا ہے کہ "مذہبِ فقہاء میں سے صرف مذہبِ حنفی ہی ایک

ایسا مذہب ہے کہ سر کے مسائل ثابت آسان، نرم اور سیرِ اہل ہیں، مخالفت اسے اور اہل کے بہت سے کام بہت سخت اور سیرِ اہل ہیں" اس دعوے کے ثبوت میں مصنف نے جو منصفانہ اور بے ہنگام کارروائی کی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کے کہنے و نہت مصنف کا وہ بناؤ اگر لکھنے کے کام میں صرف تھا تو اپنی بات سے اسکی ایک کہ بھی مزا بھی غلطی تھا، اب مصنف کے بے اس سے بڑھ کر انصافی اور کیا ہو سکتی ہے کہ نقد میں شافعی ہو

ہاں کہ ان تمام خوش چہیوں اور بیہودہ طبع آزمائیوں کے بجائے مستف کے یہ زبانی و محض لفظ  
دعوے اُسکی تلی اور خود ستائی کے نہایت قبیح اور مذہوم بیانات ہیں، جن کے ذریعہ سے اُس نے ایک  
ہوائی اور ناممکن شخص کی طرح چاہا ہے کہ وہ تماشکا و عالم میں باوجود بگڑنے والوں کے دیکھنے والوں  
کی نگاہ میں آسمان کا کرنی ٹپے سے بڑا تارا نیکر دکھائی دے، اگر وہ لٹا، فٹھا کو قاضی، سورفین کو فلپسٹین،  
علما کو کپٹی، نادان دین کو پست خیال، قبیان شریعت کے سادہ لوح، وغیرہ وغیرہ تباہی  
دنیا سے ایک ایک کو چُن چُن کر نکال دے، اور پھر ایمان نام ان مارج کے سٹہ ہونے کے بعد  
علی تحقیقات کے بازار میں بلا خوب مزاحمت خود فروشی کی دوکان چمکائے، اور رفتہ رفتہ قوم کو غریبی  
و آزمائش انگنائے لہنی کے جلی سرٹیکٹ دکھا کر ہمارے مستحقانِ محبت گروئی کا قابلِ فخر منصب بھی اپنے  
لیے حاصل کرے، غافلانِ عاقل

دانش بزرگانِ کرب و دور و دراز است از کو چہ مقصود بہ بازارِ تمنا  
(الناظر، اکتوبر ۱۹۱۹ء) محمد جان

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸ کا)

فرز دکھاتے ہو اُس نے چُن چُن کر ایک طرف مذہبِ حنفی کی آسانیاں دکھادی ہیں اور دوسری طرف خامکے بنائے ہوئے  
چیدہ چیدہ دشواریاں، پھر کم دیکھ کر مذہبِ حنفی ایسا آسان ہے اور بانی مذہبِ علیہ و ثواب ذکر و سنت  
۱۳۱۲ ۱۳۱۳ ۱۳۱۴ ۱۳۱۵ وغیرہ اسی طرح سعادت نے مذہبِ شافعی کی بہت سی سختیاں دکھائی ہیں اور نتیجہ اپنے ممالکِ موافق  
اخذ کیا ہے، مالا کہ ان کے مقابل میں مغرور مذہبِ حنفی کی بعض دشواریاں صرف ایک باب کے متعلق ایک طرف ملاحظہ فرما کر  
دکھاتا ہے کہ مثلاً دارالسلام میں غیر فقیروں کے منہم شدہ گریباؤں اور عبادت خانوں کی ترمیم و تجدید کے متعلق امام  
شافعی کے نزدیک تو امامِ اجازت ہے کہ وہ ترمیم و تجدید کریں، لیکن امام ابوحنیفہ علیہ السلام نے شرط لگا کر کہ اگر وہ گریباؤں عبادت خانہ  
اُس زمین میں ہو جو صلح سے فتح ہوئی ہے تو اجازت ہے ورنہ نہیں، اس حکم کو سخت کر دیا ہے، مثلاً امام ابوحنیفہ کا قول ہے  
کہ ذی پر جزا ابتدائے سال سے واجب ہوتا ہے، جو ایک سخت حکم ہے، اس کے مقابل میں امام شافعی آخر سال میں واجب  
کرتے ہیں اور یہ آسان ہے، چہر امام ابوحنیفہ کے بیانِ جزا کا مطالبہ مقدمہ کے بعد ہی سے کر سکتے ہیں، لیکن اس سختی کے برابر  
امام شافعی وغیرہ کے بیانِ آسانی ہے کہ یہ مطالبہ ایک برس گزر جانے کے بعد ہوگا، امام شافعی کا قول ہے کہ تو صلح امامِ فقیہ  
دکھاتا ہے ان اور انہیں ہم دیکھیں علیہما شیعہ فہم لا یجزیہ ان اسلوا سقط منہم و کہ ان اتترہ منہم مسلم، لیکن امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں

”انکذا سقط منہم فراج، منہم باسلام ولا یجزیہ مسلم“ (مجلس علیہ السلام، باب ۱)

خوب آسانوں کے ساتھ دشواریاں بھی ہر مذہب میں ہیں، پھر کہ نہ کر کے یکایک انہما کر کے لڑنے والوں کے سامنے

اور اہلِ نامِ مذہب کے احکام سخت اور بہت سخت ہیں، کہاں کا انصاف اور کہاں کی دیانت سے ۱۲۰۹

## ام عمارۃ

مستند عین سیرۃ ابن ہشام کا مطالعہ کر کے بہت جنگ احمہ کے بیان میں ان کا ذکر دیکھنے میں آیا۔ اور بہت ست میں اسکے حالات کی جستجو میں پڑ گیا۔ لیکن انکی تاریخوں میں جو عورتوں کے حالات نہایت مختصر لکھے گئے ہیں۔ سیرۃ توحید اور سیرۃ محمد بن وہب بن ہشام والی روایت دہرائی گئی ہے۔ سیرۃ الکتابہ میں بھی صرف وہی واقعہ ہے لیکن کثیر تفصیل کے ساتھ۔

اختیار۔ اسد توحید اور ہشتاد میں انکے حالات اسقدر کہہ گئے کہ اس شغف سے میری یاد رہ بھر سکی۔ تاریخ عدوی۔ تاریخ نس اور بعض دوسری مستند تاریخوں میں بھی انکا نام آتا ہے لیکن مورخ انکے کارناموں کی طرف سرسری اشارہ کرتے ہوئے گذر جاتا ہے۔

انکے جنگ پیادہ کے کارنامہ کا ذکر اکثر مورخین نے کیا ہے لیکن تفصیل کسی نے نہیں لکھی۔ بہت عوام اسذریعہ کے منہ سے اپنے معمول کے حالات اس واقعہ کا کسی قدر ربط کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ریاض المستطاب میں بھی کچھ حالات ملے لیکن نہ مٹنے کے برابر۔ ابن سعد نے طبقات کی آٹھویں جلد میں انکا تذکرہ کیا ہے اور اگرچہ فی الجملہ اس سرسری مورخوں سے زیادہ لکھا ہے لیکن پھر بھی ناکافی ہے۔ تاریخ وفات تک کا پتہ نہیں۔

تہذیب التہذیب کا خلاصہ تو صرف ناموں کی فہرست ہے۔ اب اصل کتاب چھپ رہی ہے اسکی گیارہ جلدیں چھپ کر ابھی تک ہیں مگر افسوس کہ انکا تذکرہ بارہویں جلد میں ہے اور وہ اب تک نہیں آئی۔

زینب فواد کی کتاب دار الفتور مصر میں چھپی ہے۔ اسکے لئے دو خط بھیجے کہ تاریخ کو کچھ مفصل لکھا ہو گا۔ ہر حدود اس تلاش کی گئی لیکن بد قسمتی سے نہیں ملی۔ ان سب کوششوں کے بعد مجبور ہو کر حوالات ملے ہیں! الغل انہیں کو پیش کرتا ہوں۔

اصل میں نے بہت نہیں ماری ہے مستحق سلسلہ انشا اللہ جلد ہی رکھو گا یا ملک کا اس



شیراز مبارک صحابیہ کی جو آنحضرت کے لئے ہینہ سپر ہو کر لڑی ہے کل سوانح عمری لکھنے کے قابل ہو جائے۔ یہ مراعدیست باجان کہ تا جان در بدن دارم بنہ جو داران کوشش را چو جان خوشی دارم ام عمارہ کا نام نسیم ہے لیکن یہ اپنی اسی کیفیت کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں۔ باپ کا نام کعبہ تھا۔ وہ قبیلہ بنی تمار میں سے تھے۔ انکی والدہ رباب بنت عبدالمعد قبلہ خراج میں سے تھیں۔ ولادت ہجرت سے تھینا چالیس سال پہلے مدینہ میں ہوئی۔ انکا نکاح انھیں کے چچا زاد بھائی زید بن عاصم کے ساتھ ہوا۔ اسنے دو بیٹے پیدا ہوئے عبداللہ اور حبیبہ زید بن عاصم کے انتقال کے بعد انکا دوسرا نکاح انھیں کے قبیلہ کے ایک شخص غزنیہ بن عمر سے ہوا۔ اسنے ایک بیٹی تمیم اور ایک بیٹی خولہ پیدا ہوئی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی اور آپ نے لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا تو مکہ کے اکثر لوگ دشمن ہو گئے۔ انھوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی۔ جو لوگ مسلمان ہوتے تھے انکو تکلیفیں پہونچاتے تھے۔ انکی ایذا رسانی کی وجہ سے کوئی مسلمان مکہ میں مشکل سے ٹھہر سکتا تھا۔ چنانچہ آپ سبکو ہشتم کی طرف ہجرت کر کے تھے کیونکہ وہاں انکا بادشاہ سمانوٹکا بڑا حامی تھا اور انکو آرام دیتا تھا۔ جب آپ نے سالہا سال کوشش کر کے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے انکے دل پر مہر لگا دی ہے اور انکی عداوت اور دشمنی برابر بڑھتی چلی جاتی ہے تو انکا چھپا چھوڑ دیا۔ اور بڑے بڑے بازاریوں اور مجموعوں میں جہاں عرب کے تمام قبائل جمع ہوتے تھے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے لگے۔ یہ خواہش بھی تھی کہ اگر کوئی دوسرا قبیلہ اسلام کی حمایت کیلئے آمادہ ہو جائے تو آپ ان لوگوں کو چھوڑ کر انھیں میں جا لیں۔

اتفاق سے ایک سال مدینہ کے چھ آدمی آپکا وعظ سکر مسلمان ہو گئے۔ دوسرے سال چھ اور بڑے۔ اب حضور نے ایک صحابی کو جسکا نام مصعب بن عمیر تھا ان مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کو روانہ کر دیا کہ وہ ان قرآن کی تعلیم دیں۔ حضرت مصعب اور ان بارہ مسلمانوں کی کوشش مدینہ کے بڑے بڑے سردار اسلام اسے اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ انھیں اسلام لائے۔

پھر حضرت ام عمارہ اور انکا گھرانہ تھا۔

سیرے سال مدینہ سے ۵ مسلمان کہہ ہوئے۔ ستر کون کے خوف سے حج کے دو تین دن کے

بعد رات کو پچھلے پہر ایسا چاند کی کھائی میں یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔  
 وہاں حضور کے ہاتھ پر ان سب لوگوں نے بیعت کی اور یہ عہد و پیمان ہوا کہ حضور مدینہ  
 تشریف لیں لیکن ہم جان مال اور اولاد سب کچھ اللہ کے دین کی مدد میں قرباں کریں گے۔  
 یہی بیعت کو بیعت عقبہ کہتے ہیں۔ جو لوگ اس میں شریک تھے انکا درجہ تمام انصار میں بلند ہے۔  
 اس بیعت میں دو عورتیں بھی تھیں ایک تو یہی ام حارثہ دوسری ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔

اس عہد و پیمان کے مطابق آنحضرتؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے آئے۔ کفار مکہ نے بیان  
 صحیح نہیں دیا کئی بار چڑا ہوا کر کے آئے اور لڑا بیان کیں۔ بیان تک کہ مدینہ کی لڑائی ہوئی  
 جس میں مکہ کے کافروں کے کٹر سردار بڑے سردار مارے گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کو کفر پر  
 نمایاں فتح عطا فرمائی۔ کفار نے اپنے سرداروں کا بدلہ لینے کی غرض سے بڑی سخت تیاری کی  
 اپنے آس پاس کے تمام قبیلوں کو جمع کیا۔ سب کو ہتھیار اور سواری دی اور تین ہزار سے کچھ  
 زیادہ جنگی آدمی جمع کیے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مدینہ پہنچے۔ لڑائی کی یہی صیلا اللہ علیہ  
 وسلم نے یہ خبر سنا کر مسلمانوں کو جمع کیا۔ تقریباً ایک ہزار آدمی تھے۔ انکو لیکر مدینہ لڑائی کیلئے نکلے  
 تو انہیں سے بھی تیس سو منافق راستہ سے واپس چلے آئے۔ اب مرنے والے مسلمان رہ گئے  
 منافقوں کے ہاگ آنے سے انکا حوصلہ بھی پست ہو گیا تھا۔ مگر آنحضرتؐ نے انکو بہت دلائی اور  
 اللہ پر بھروسہ کر کے مقابلہ کیلئے بڑھے۔

مدینہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جسکا نام احد ہے اسکے دامن میں  
 شنبہ کے دن ۱۱ سوال شنبہ کو مقابلہ ہوا۔ مسلمان اچھے موقع پر پہنچ گئے تھے۔ ایک غلو  
 درہ تھا۔ کفار کے ساتھ آٹھ سو حواری تھے۔ خالد بن ولیدؓ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے  
 ان سواروں کے سردار تھے سوا سے اس درہ کے اُنکے آنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا آنحضرتؐ نے  
 اس درہ پر ساتھ ستر مسلمانوں کو مقرر کر دیا کہ اس طرف سے جب سوار حملہ کریں تو تم لوگ روک  
 انکو آگے نہ بڑھنے دینا اور جب تک ہم حکم نہ دیں اس وقت تک ہرگز اس جگہ سے نہ ہٹنا۔ یہ لوگ کوش  
 کی دیوار کی طرح وہیں جم گئے۔ جب کفار اوسر سے آنے لگے تو ان بھڑے سے مسلمانوں نے  
 انکو نینہ بونہر کر رکھا۔ مجھ رہ کر رک گئے۔ درمیان میں نہ آ سکے۔ اور کھنکھان کی لڑائی شروع

ہوئی۔ قریب تھا کہ مشرکوں کو شکست ہو جائے کہ اتنے میں اسلامی فوج کا علم بردار شہید ہو گیا۔ بعض کافروں نے سمجھا کہ یہی رسول اللہ تھے۔ انہوں نے خوشی کا لغزہ لگایا کہ ہم نے بنی کو قتل کر دیا۔ مسلمانوں نے جب یہ آواز سنی تو اکثر بدحواس ہو گئے۔ انکو کسی چیز کی خبر نہیں رہی۔ کوئی جہاں تھا وہیں مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ کوئی گر پڑا۔ کوئی بیہوش ہو گیا۔ کیسلی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اناقت ڈال تلوار گر پڑی۔ مشرک خوشی کے جوش میں ٹوٹ پڑے۔ درہ پر جو مسلمان تھے وہ بھی سراسیمہ ہو کر دوڑے کہ یہ کیا ماجرا گذرا۔ ان لوگوں کا دامن سے ٹٹنا تھا کہ خالدؓ نے اپنے سواروں کو لیکر حملہ کیا۔ اور قیامت پر قیامت برپا کر دی۔ سرور کائنات کے غمختہ! یہ حمزہؓ رہا اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔

اس سخت وقت میں حضورؐ کے ارد گرد صرف چند مسلمان جبکی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی حفاظت کیلئے رہ گئے انہیں میں ام عمارہؓ رہا انکے دونوں بیٹے عبداللہ اور حبیب اور انکے شوہر عزیمہ بن عمر تھے۔ خود حضرت ام عمارہؓ کی زبانی مورخوں نے اس واقعہ کی کیفیت لکھی ہے ہم اسکا ترجمہ کرتے ہیں۔

”ام عمارہؓ نے کہا کہ میں اپنے کندھے پر مشک لے ہوئے پیاسوں کو پانی پلا رہی تھی۔ ایک ایک مسلمان نے شکست کھائی۔ اور انکے قدم اکبر ہو گئے۔ کفار نے چاروں طرف سے سخت نبرد کیا میں نے اسوقت مشک چھینکی۔ اور ایک تلوار اٹھا کر آنحضرتؐ کی حفاظت کیلئے کھڑی ہو گئی۔ میرے پاس ڈال نہ تھی کسی بلٹ کر جانے والی طرف حضرتؐ نے اشارہ کیا وہ اپنی ڈال بھینکا گیا۔ میں دشمنوں کے تیروں اور تلواروں کو اسی ڈال پر روکنے لگی۔ مصیبت یہ تھی کہ ہم بیدل تھے اور غنیمت سوار ہون پر اگر وہ ہماری طرح بیدل ہوتے تو ہم آسانی سے اُنہیں ہلکتے دیکھتے۔ سوار اپنی پوری قوت سے ہمارے اوپر حملہ کرتے تھے۔ اُنکا روکنا بہت دشوار ہوتا تھا۔ میں نے تو یہ ترکیب نکالی کہ جب کوئی سوار وار کرتا تو اُسکو روک لیتی اور جون ہی وہ آگے بڑھتا چھپے سے ایک اسیادار کرتی کہ اُسکے گھوڑے کا پاؤں کٹ جاتا اور وہ مع سوار کے وہیں گر پڑتا۔ یہ دیکھ کر بنی قریظہؓ دہلے دہلے میرے بیٹے عبداللہؓ کو زور سے آواز دیتے کہ اپنی آن کی مدد کر۔ وہ فوراً آجاتا اور میں اور وہ دونوں ملکر اس سوار کا قاتل کر دیتے“



حضرت امّ عمارہ کے بیٹے عبداللہ کی زبانی روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ  
 ”میں اور میری ماں دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے۔ میں  
 دوسری طرف مشغول تھا کہ ایک شہرک نے عجیبے سے آکر میرے بازو پر ایک تلوار اسی زخم  
 بہت کاری بڑا۔ میں نے مرا کر اس پر حاکم کیا لیکن وہ سید اُنکل گیا۔ میں لڑا رہا تھا مگر میرا خون بند  
 نہیں ہوتا تھا۔ حضور نے امّ عمارہ کو حکم دیا کہ اس کے زخم پر چٹی باندھو۔ وہ اپنے ساتھ ہی چلا  
 کیلئے بہت سی ثیاب لائیں تھیں فوراً ایک چٹی نکال کر زخم کو خوب مضبوط باندھ دیا۔ اور یوں  
 کہ گیا اٹھو اور اور میں خون کے نکلنے سے بہت کمزور ہو گیا تھا اٹھنے کی طاقت نہیں تھی  
 آنحضرت نے فرمایا کہ اسے امّ عمارہ ہر شخص میں درگاہت کہاں ہوتی ہے جو جگہ میں ہے۔  
 اس نے میں وہ شخص جس کے زخمی کیا تھا پر لپٹ کر اسی طرف آیا۔ آنحضرت نے اُسکو دیکھ کر فرمایا  
 کہ اسے امّ عمارہ رکھ دو یہی شخص آ رہا ہے جس نے عبداللہ کو زخمی کیا ہے۔ امّ عمارہ نے لپک کر پھر  
 تلوار کا وار کیا۔ اُسکی ایک بٹلی مان کٹ گئی اور وہ اُسی جگہ دم سے گر پڑا۔ پھر اُنہوں نے  
 آگے بڑھ کر اُسکا سر کاٹ لیا۔ حضور مسکرائے اور فرمایا کہ امّ عمارہ اللہ تعالیٰ نے بڑا تازہ  
 بدلہ تجھ کو عطا کیا۔“

کئی گھنٹہ تک یہ حالت رہی۔ حضرت امّ عمارہ کے زخموں کا کچھ شمار نہ تھا لیکن ان کے جسم میں فولاد کے  
 تاروں کی رگین تھیں۔ ذرا بھی تو ان زخموں کی پروا نہیں کرتی تھیں۔ اور برابر جیتی اور چالاک کے ساتھ  
 حضور کی حفاظت میں مشغول تھیں۔ اسی درمیان میں کسی کافر نے ایک پتھر پھینک مارا جس سے  
 سرور کائنات کا بھی نیچے کال زخمی ہو گیا۔ اور نیچے کے سامنے کے دو دانتوں میں سے  
 داہنا دانت شہید ہو گیا۔ پھر ایک مشہور کافر نے جس کا نام ابن قیس تھا اور جو بہت بہادر  
 اور مشہور سوار تھا آپ پر تلوار کا وار کیا۔ جس سے خود کے دو ہاتھ رخسار مبارک میں چھڑ  
 گئے۔ حضرت ابی عبیدہ بن الجراحؓ نے ان حلقوں کو نکال دیا۔ رخسار مبارک سے خون کے قطرے  
 پھینکے گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت امّ عمارہ نے نشتر کی طرح اچھل کر ابن قیس پر حملہ کیا۔ اس نے ان کے  
 مونڈھ سے بدھی ایک تلوار ماری جس سے بڑا گہرا زخم آیا۔ باوجود اس زخم لگنے کے بھی حضرت  
 امّ عمارہ نے پیادے سے تلوار کے کئی وار کئے لیکن وہ دشمن خدا و زور میں پھینے ہوئے

تھا۔ ابن قمرہ تو ہباگ گیا۔ لیکن حضرت ام عمارہ کے بڑا کاری زخم لگا تھا۔ خون میں  
 لت پت ہو گئیں۔ حضور نے اپنے سامنے کھڑے ہو کر اسکے زخم پر پٹی بندھوائی۔ اور فرمایا  
 کہ واسطی ام عمارہ کا آج کا کارنامہ فلاں فلاں رحمتہ بادر صحابہ کے نام لیکر اس کے کارناموں  
 میت بڑھ کر ہے۔ ام عمارہ نے کہا کہ یا رسول اللہ میرے بیٹے دعا فرمائے کہ اللہ تعالیٰ  
 آپ کے ہمراہ مجھ کو جنت میں داخل کرے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ ام عمارہ نے کہا کہ اب اسکے  
 بعد دنیا میں جو مصیبت پتا ہے میرے سر پر گزر جائے مجھے ذرا ہی پروا نہیں۔

میدان جنگ سے جن مسلمانوں کے قائم اٹھ گئے تھے انہیں سے بعض بعض مدینہ  
 کے قریب تک پہنچ گئے۔ ایک صحابیہ جن کا نام ام ایمن رحمۃ اللہ علیہا مدینہ سے مشک لیکر احادیث  
 آ رہی تھیں کہ مسلمانوں کو پانی پلائیں۔ دیکھا کہ لوگ بھاگے آ رہے ہیں۔ کیفیت پوچھی۔ انہوں نے  
 واقعہ بیان کیا۔ حضرت ام ایمن نے زور سے چلا کر انکو ڈانٹا۔ اور تھلی میں خاک بر کر اٹکی ٹرن  
 پھینکی۔ اور کہا کہ رسول اللہ کو چھوڑ کر تم لوگ کس صف سے یہاں چلے آئے۔ مرو بہے ہو۔  
 لو۔ یہ ہماری چوڑیاں پہنو۔ اور گر کا چوٹھا چٹکی سنبھالو۔ اور اپنی تلواریں بکودید و بھم  
 لڑیں۔ انکے اس کہنے سے وہ غیرت مند مسلمان پلٹے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ ہیں۔ اب انکی ٹوٹی ہوئی بہت بہت ہند ہی اور میدان میں جمع گئے  
 تلہ کے وقت لڑائی ختم ہو گئی۔ حضرت ابو بکر۔ حضرت عمرؓ اور بڑے بڑے صحابہ کے ساتھ آپ  
 پہاڑ پر گئے وہاں نماز پڑھائی اور پھر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔

ایک دنیاوی جیوی کا حال سنئے۔ مدینہ میں جب آنحضرت کے شہید ہو جانے کی خبر اڑی۔ تو وہ  
 رنج و غم سے متیاب ہو کر نکل کھڑی ہوئیں۔ دو زبان آکھوں سے آنسو جاری تھے اور سرتی پڑتی  
 اٹھ کی طرف چلی جا رہی تھیں۔ راستہ میں ایک شتر سوار ملا دوڑ کر اس سے پوچھا کہ کیا خبر ہے؟  
 اونے کہا کہ شہید ہے لیکن تمہارا باپ۔ بیٹا اور توہر تہوں شہید ہو گئے۔ انہوں نے کہا اور  
 رسول اللہؐ کا کہ وہ میلہ کے پاس دیکھو فوج کے ہمدان تشریف لائے ہیں۔ خوشی سے اچھل  
 پڑیں اور کہا کہ جب رسول اللہؐ زندہ ہیں تو بکو کسی کی کچھ پروا نہیں ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں  
 سے جسکو چاہے شہادت عطا کرے۔

ہم نگور وک نہیں سکتے۔ سیکر کذاب نے بڑا سخت مقابلہ کیا اور بڑی کمسان کی لڑائی ہوئی۔ قدم قدم پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے یاڑ سو مسلمان شہید ہوئے اور آٹھ نو ہزار کاڑ مارے گئے۔ اسی کش مکش اور ہنگامہ میں حضرت ام عمارہ نے اپنی نگاہ کے ساتھ سیکر کو رکھ لیا۔ جنگی بہادر و نگور اپنے سامنے سے ہٹاتی برجھتی کی نوک اور تلوار کی دھار سے اپنا راستہ نہ لیتی ہوئی غنیم کی بیچ غوج میں گھستی پٹی جا رہی تھیں نیزہ اور تلوار کے لپٹا رہے زخم کے نلے اور جب سیکر کے بالکل قریب پہنچ گئیں تو کلائی پر سے ایک ہاتھ بچھ کٹ گیا لیکن بردا نہ کی۔ اور آگے بڑھیں کہ سیکر پر وار کریں۔ اتنے میں کیا بکیتی بن کر ایدم سے آگے دو تلواریں پڑیں اور وہ کٹ کر ٹھوڑے گڑ پڑا۔ انہوں نے دیکھا تو انکے بیٹے عبد اللہ کہہ رہے ہیں۔ پوچھا کہ تو نے اسکو قتل کیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک تلوار میری پڑی ہے دوسری

دستی تھی اسید وحشی وہ ہے جس نے اپنی کفر کی حالت میں جنگ اند میں حضرت امیر حمزہ کو شہید لیا تھا، اب معلوم نہیں کس کے واسطے وہ مرا ہے۔ یہ دیکھ کر ام عمارہ اس وقت سجدہ میں گر گئیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کیا۔

غزوہ نکی وجہ سے اور خاص کر ہاتھ کے کٹ جانے سے وہ کمزور ہو گئی تھیں۔ حضرت خالد بن جوفح کے سردار تھے اور جنگی بادی مغرب اشل ہے وہ ام عمارہ کی شجاعت اور بزرگی کی وجہ سے انکا بڑا ادب کرتے تھے۔ انہوں نے انکے زخموں کے علاج اور تیمارداری میں کوئی کوتاہی اٹھا نہیں رکھا جب حالت کچھ ٹھیک ہو گئی تو عبد اللہ بن ابی بکر مدینہ میں لائے خود خلیفہ وقت حضرت ابو بکر رحمہ اللہ کو دیکھنے کیلئے انکے گھر آتے تھے۔

حضرت عمر م غلیو دوم کے زمانہ میں ایک مرتبہ مال غنیمت میں چند بیش قیمت کیڑے آئے۔ انکے ایک دو پٹے مزرکش نہایت قیمتی تھا۔ کسی نے حضرت عمر کو یہ راسخ دی کہ آپ اللہ بن عمر کی بی بی کو دیں۔ کسی نے کہا فلاں کو دیں غرض مختلف لوگوں نے مختلف راہیں نکالیں۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ نام ہو گیا میں میں سب سے زیادہ حقدار اسکا ام عمارہ کو مجھے ہوں۔ انہیں کو دو لگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے احد کے دن سنا



حضرت کو ام عمارہ کا بڑا خیال تھا۔ آئینے سامنے ہی عبدالمد بن کعب کو انکے دیکھے کیلئے بھیجا۔ معلوم ہوا اب حالت اچھی ہے۔ زخم مہلک نہیں ہے۔ تب آپ کو اطمینان ہوا۔ پھر — ایک سال تک علاج کر سکے بعد زخم اچھا ہوا۔

بالا لٹاق تمام مورخ لکھتے ہیں کہ واقعہ حدیبیہ — خیر اور حین کی لڑائیوں میں بھی، حضرت آنحضرتؐ کے ہمراہ شریک ہوئے لیکن جھکاؤ تک کسی کتاب سے ان لڑائیوں میں انکے کا نام نہ ملے تفصیل معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ جنگ یمامہ کا حال جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ لکھتا ہوں۔ اہل یامہ کا سردار سیلہ کذاب ایک نہایت زبردست اور بڑا جابر شخص تھا۔ پہلے تو مسلمان ہوا لیکن پھر دنیا کی لالچ میں مرتب ہو گیا۔ آنحضرتؐ کے انتقال کے بعد، سنے بڑی سرکشی پر کربا نہ ہوئے۔ اسکا قبیلہ بہت بڑا تھا لڑنے والے تقریباً چالیس ہزار آدمی تھے اس نے اپنی اس قوت کے ٹکمنڈ میں آکر نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اور سب سے اپنے آپ کو نبی کہلانا شروع کیا۔ جو نہ کہتا اور نہ کو طرح طرح کی سزائیں دیتا۔

حضرت ام عمارہ کے بیٹے حبیبؓ عمان سے مدینہ شریف کو آ رہے تھے۔ مسیح نے راستہ میں انکو کڑوا لیا اور کہا کہ تم گواہی دیتے ہو کہ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اسنے کہا نہیں۔ یہ گواہی دو کہ مسیح رسول اللہ ہے۔ انھوں نے کہا ہرگز نہیں۔ تب اسنے انکا ایک ایک ہاتھ کاٹ ڈالا۔ پھر یہی سوال کیا۔ انھوں نے پھر بھی جواب دیا۔ دو ہاتھ کاٹ ڈالا۔ الغرض پھر پاؤں کاٹے۔ راتیں کاٹ ڈالیں لیکن انھوں نے اس کذاب کی نبوت کا اقرار نہ کیا پر نہ کیا۔ اور جان دیدی۔ حضرت ام عمارہ نے حبیبؓ واقع سننا تو کھینچا۔ تم کے رنگین۔ اور اپنے دل میں ٹھان لیا کہ اگر مسلمانوں نے لشکر کشی کی تو اس مرتبہ ظالم کو میں انٹا اللہ خود اپنی تلوار سے جہنم میں داخل کر دے گی۔

حضرت ابو بکرؓ رضی اللہ عنہ نے جب مسیح کذاب کے حالات سنے تو حضرت خالد بن ولیدؓ کو چار ہزار فوج کے ساتھ اسکے مقابلہ کیلئے روانہ کیا۔ حضرت ام عمارہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئیں۔ اور ان سے اجازت چاہی کہ اس لڑائی میں مجھے بھی جانے دیجئے۔ انھوں نے

درا یا کہ ہم تھاری بادری اور جرات بہت اچھی تلج دیند چکے مین اسنے تم شوق سے جب  
 راپ فرماتے تھے کہ مین جد ہر شہر ڈاساقتا ام تھارہ ہی ام عوار د مجھ کو نظر آتی تھیں۔ رات  
 دیکھتا ہوں تو ام تھارہ۔ بائیں دیکھتا ہوں تو ام تھارہ۔ چنانچہ آپ نے فقیر کے پس کو بچپور  
 راف کو اس وقت تک اس سے زیادہ حالات مین معلوم ہو سکے۔ فقیر

اسلم۔ جیراج پوری

(النظر: جون ۱۹۱۰ء)





فی الواصل شجرہ مذکور، آپ کے پستے قاضی ابوصالح نصر کا تیار کر دے جن تک اکثر روایات صحیح  
 جو (حضرت) شیخ کی جانب منسوب ہیں پوچھا جاسکتی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ قاضی زینت علیہ السلام  
 الصوسی تھیں۔ اور یہ دونوں (حضرات) اولیاء اللہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کا نام  
 کا نام جس میں آپ کی ولادت ہوئی نہی (بالکسر یا بالفتح) ہے جو بحر کا پسین کے جنوب منہل گیلان  
 میں واقع ہے۔ (حضرت) شیخ اٹھارہ برس کی عمر میں بغرض تعلیم لے کر تشریف لائے یہاں  
 آپ کی والدہ ماجدہ، ابتدائے آپ کے اخراجات کی تکفل تھیں۔ آپ نے مہرث و فخر علیہ السلام  
 امام تبریزی (ستونی سنہ) سے اور فقہ صہلی (ابو یوسف کے نزدیک فقہ ثانی) (سنہ شیخ)  
 سے حاصل کی۔ اور اپنی تصانیف میں آپ بہتہ اللہ بن مبارک اور ابو محمد بن ابی بکر سے بہت  
 روایت کرتے ہیں۔ آپ کے حالات زندگی بامین سنہ ۷۰۰ اور سنہ ۷۰۱ بیت کرم معلوم ہیں  
 سولے اسکے کہ آپ نے اس عرصہ میں فریضہ حج سے فراغت حاصل کی اور نکاح لیا  
 اس وجہ سے کہ آپ کی انچاس اولاد میں سے ایک کی ولادت سنہ ۷۰۱ میں واقع ہوئی  
 تھی یعنی مورخین لکھتے ہیں کہ آپ امام ابو حنیفہ کے مزار کے متونی تھے۔ آپ نے طریقہ  
 سلوک و تصوف (حضرت) ابوالخیر محمد بن مسلم الدیاس سے حاصل کیا۔ جبکہ پایہ بزرگی اس قدر  
 بلند ہے کہ شمرانی کی فرست میں ان کا نام داخل ہے۔ انھیں بزرگ کی تقریب سے اترنے  
 (حضرت) شیخ پر فقر و تصوف غالب ہو گیا۔ اس طرح کہ آپ اُنکے پاس ایک مرتبہ منے آئے  
 تھے، اور چونکہ اس موقع پر کسی نے ایک باز پکڑا تھا اسی وجہ سے دبیری کے نزدیک آپ کا  
 لقب "بازا لا تہب" ہو گیا۔ (شیخ) دیاس کے طریقہ تعلیم میں سخت مشکلات اور تکالیف  
 تھے اکثر کتابوں میں بیٹے محمد کے نام "لکھا ہے۔

سنہ ۷۰۱ قع ہے یہ ویسا گویا کہ ایسے عربی دال بلکہ عربی نژاد محقق نے اس مقام پر فاش غلطی کی اور سنہ  
 ۷۰۰ کا لکھا ہے۔ انگریزی کی اصل عبارت بالکل وہی ہے جیسا کہ ترجمہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی دوسرے  
 شخص کے باز پکڑے اور حضرت فوت ان منہ کو انرا شہب کا لقب ملنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ سمجھ راقبت  
 ہے کہ جب فوت الاظم شیخ دیاس کی خدمت میں بغرض احوال عامر ہوئے تو شیخ نے فرمایا کہ میں نے خوب  
 سنا دیکھا تھا کہ میں سے ایک باز شہب لایا ہے، اور انہما باز تھیں جو "یہ وہ فہمیل کے ساتھ گرد کیے ہوئے ہیں"

سے سامنا تھا اور اُسکے دیکر صوفی شرب مریدوں اور شاگردوں کو ایک فقیہ کی شرکت اپنے۔

سلسلہ طریقت و درس میں نہایت گراں معلوم ہوتی تھی۔ بہر حال (حضرت) شیخ ہمتو سے ہی عرصہ میں اس قابل ہو گئے اور مراعل سلوک اس قدر طے کر لیے کہ آپ کو خرقہ تصوف قاضی ابوسعید مبارک، مخزومی کے دست مبارک سے عطا ہوا جو اُس وقت فقہ حنبلی کے مشہور امام اور رہنما میں باب الہدایہ کے قریب ایک مدرسہ میں درس دیتے تھے جہاں (حضرت) شیخ بھی بغرض استفادہ

حاضر ہوتے تھے۔ سلسلہ میں شیخ یوسف الہمدانی (سلسلہ نہایت مشہور) کی صلاح سے (حضرت) شیخ نے اپنا سلسلہ و غلط علانیہ طور پر شروع کر دیا۔ جہاں ابتدا میں سامعین کی تعداد مختصر...

ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ اتنی بڑھ گئی کہ آپ ابتدا میں باب الہدایہ کے قریب و غلط و نصیحت کی پرورش و فیض تفریر فرماتے اور شائقانِ سخن کی کثرت کی وجہ سے اکثر آپ کو باب مذکور کے باہر

نقل جانا پڑتا تھا۔ اسی جگہ آپ کے واسطے ایک رابطہ تعمیر کی گئی۔ سلسلہ میں باشندگان

شہر کی فراخ تو مسکنی سے مخزومی کا یہ مدرسہ اس قدر وسیع کر دیا گیا کہ آس پاس کے مکانات بھی

اُس میں شامل کر لیے گئے۔ (وہ حضرت) شیخ اس کے مدرسہ اعلیٰ (امام) قرار دیے گئے۔ اس

مدرسہ کے درس کی نوعیت تقریباً وہی تھی جیسا کہ جمال الدین الجوزی (ابن ہزمی) کے درس

کی تھی جس کا حال ابن جبیر نے نہایت تفصیل و وضاحت سے تلمین کیا ہے۔ عید کے دن

جمعہ کو اور دو شنبہ کے دن شام کو (حضرت) شیخ اسی مدرسہ میں وعظ بیان فرماتے اور کشتیہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰ کا)

دمیری کی کتاب الحی ان بلد اول صفحہ ۹ میں درج ہے اور قرینہ کہنا ہے کہ اُسی سے پر و نفیر موصوف نے

نقل کیا ہوگا۔ مگر سچا ہے اسکے کہ خود شیخ دیا س نے "خواب میں" از پڑا وہ لکھ گئے کہ کسی دوسرے شخص نے

"فی الواقع" باز پڑا تھا۔ اور یہی وجہ اس لقب کی ہوئی۔ یہ مبارک لقب جو ہرے جوشِ محبت میں دیا جاتا

آپ کو اس قدر پسند آیا کہ اپنے ایک مشہور تفسیر میں جس کا مطلع ہے

سقا فی الحب کاسات الوصال      نقلت لخرتی سخی نقالی

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:-

ومن ذانی الرجال اعمی مثالی

اما البازی و انہب کل شیخ

کے دن صبح کو حضرت کی خانقاہ میں غسل و غلط منعقد ہوتی تھی۔ آپ کے مطلقہ مریدین و تلامذہ میں بہت مشہور و اولیاء اللہ ہو گئے مگر بعض نے مثل آپ کے سوانح نگار اسماعیلی کے دیگر علوم میں کمال دستگاہ حاصل کی۔ مشہور ہے کہ (حضرت شیخ کے غلط و نفعاً اتنے پُر جوش و با اثر ہوتے تھے کہ ان کو من کر اکثر ہو و نفع داری دولت اسلام سے مشرف ہو۔ اور اکثر مسلمان مسو فی صافی ہو گئے۔ اکثر تحف و ہدایا جو زیادہ تر نذر و نیاز کی صورت میں ہوتے تھے مقامات دور و دراز سے جہاں آپ کی شہرت پہنچ گئی تھی (حضرت شیخ کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے جو تک مدہ اور رات مسندوں کی نماز فرائض کے لیے وقت تھے۔ اسی طرح سوالات فقہیہ (مسئلت کی صورت میں دور دور سے بہتر آپ کی خدمت میں پیش کیے جاتے جنکا جواب فی البدیہہ آپ ارشاد فرماتے اکثر غلط اور بڑا بھی آپ کے ارادت کشوں اور متقدموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(حضرت شیخ کی تصنیفات جن میں زیادہ تر آپ کے شعبے اور مورخین سب مذہبی رنگ میں ہیں۔ آپ کی ذرا تصانیف جن کا ہم کو علم ہے حسب ذیل ہیں :-

(۱) "الغنیۃ بعالم طریق الحق" - ایک مذہبی در اخلاقی رسالہ ہے (مطبوعہ قاہرہ شمسہ)  
(۲) "فتح الربانی" - با ستم خطبوں کا مجموعہ۔ جو شمسہ میں دیے گئے تھے تہ (مطبوعہ قاہرہ

شمسہ) - بعض قلمی نسخوں میں اس کا نام "شین مجالس" ہے۔

(۳) "فتوح النیب" - اکثر خطبوں کا مجموعہ مختلف معنایں پر مشتمل ہے جسکو (حضرت شیخ کے صاحبزادہ شیخ) عبدالرزاق نے جمع کیا تھا۔ اسکے آخر میں آپ کے وصایا، آپ کا شجرہ پیری و اوری، حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ آپ کے تعلق کا ثبوت، آپ کے مذہبی اعتماد اور آپ کی بعض نظمیں درج ہیں۔ (عاشیہ حجۃ الاسراء مطبوعہ قاہرہ شمسہ)

(۴) "حزب بشار الخیرات" - ایک صوفیانہ دعا ہے۔ (مطبوعہ اسکندریہ شمسہ)  
(۵) "عیار الخاطر" (متذکرہ حاجی خلیفہ) خطب کا مجموعہ ہے جن میں پہلے خطبہ کی تاریخ مذہبی ہے جو نمبر (۲) کے خطبہ ۵۹ کی اور آخری خطبہ کی (۱۰) ہے جو نمبر (۱) کے خطبہ ۵ کی ہے۔ شاید یہ اسی کتاب کا دوسرا نام ہو۔

(۶) "المواہب الرمانیہ والفتوح الربانیہ فی مراتب الافلاک السنیۃ و انعامات العرفانیۃ"



اس کا ذکر روشتہ انجمنات صغیرہ ۴۴۱ میں ہے۔ شاید یہ وہی کتاب ہو جو مذکور بالا نمبر ۲ یا ۳ ہے۔

(۷) "تواقیات الحکم" (تذکرہ حاجی فلسفہ)

(۸) "الفیوضات الربانیہ فی الادوار العادسیہ" - مجموعہ ادعیہ (مطبوعہ کاکہرہ مصر)

(۹) مجموعہ خطب مشہورہ بیچہ الاسرار و دیگر مسالجات :- (اس کا نام تمام قلمی نسخہ انداز یا آفس کی فہرست میں نمبر ۲۲۲ ہے۔ فارسی مؤرخین اس کا ذکر عام طور پر ملفوظات قادریہ کے نام سے کرتے ہیں) تمام تصانیف مذکور بالا میں (حضرت) شیخ من حیث المعصنات ایک زبردست فقیہ اور ایک پُر ذہن و استبانہ اور فصیح و بلیغ نظر آتے ہیں۔ ان فتنیہ میں بہت سے اعلیٰ درجہ کے خطبے شامل ہیں اور اسلام کے تہذیبی فرقوں کے حالات بھی درج ہیں جو دس ابواب پر منقسم ہے۔ اس میں اکثر مشہور شخصوں کا ذکر ہے مثلاً سیر و اور قدما کے مفسرین اور اولیاء اللہ کے حالات بھی مندرج ہیں۔ اس کتاب سے (حضرت) شیخ کے مذہبی اعتقادات ایک پورے پیر و شریعت کے ایسے معلوم ہوتے ہیں جو طرز بیان من اولہ اثنی آخرہ ثنائت سے نمایاں نہیں۔ البتہ بعض آیات قرآنی کی تفسیر و توضیح میں مقبوضات تاویل سے کام لیا گیا ہے اور پوشیدہ معنی بیان فرمائے ہیں۔ اس کے ساتھ بعض اولاد کا بھی ذکر ہے جن کو سچا سچ یا سونو مرتبہ پڑھنے کی تاکید ہے۔ کتاب نمبر (۲) مذکورہ بالا میں بعض خطب ایسے ہیں جو ادب اسلامی میں بے نظیر ہیں۔ ان میں مذہبی رواداری اور انسان دوستی، برہنہ ائمہ پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطیب کا دل چاہتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان پر دودخ کے دروازے بند اور بہشت کے دروازے کھول دیے جائیں۔ اصطلاحات صوفیہ بہت شاذ و نادر استعمال ہوئے ہیں اور مطالب ایسے عام فہم طریقہ سے بیان فرمائے ہیں کہ معمولی قاریت کے پڑھنے والے بھی اُس سے اچھی طرح بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ بھی مشہور ہے کہ (حضرت) شیخ کے ایک شاگرد کا قول ہے کہ میں اُس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ خطب کا لب لباب اور عام مفہوم یہ ہے کہ ابتدائی مراحل سے گزرنے کے لیے جو ایسے حق کو لازم ہے کہ دنیوی عیش و آرام لذات و ثنات کو فریاد کے بعد کو جب اس قابل ہو جائے کہ دوسروں کو اپنے دائرہ ارادت میں سے سکے تو پھر عود کرے۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی کہ ہر چیز جو خواہ اس عالم سے تعلق رکھتی ہو یا دوسرے عالم سے وہ درمیان طالب و مطلوب کے

ایک جانب ہے اور طاب کمرۃ اللہ علی نقابی الشوب ہونا چاہیے، بہت خوبی اور ترست و سب سے بیان کیا گیا ہے۔ سامعین یا قارئین وعظ کو براہیت ہے کہ وہ اپنے احوال سے ولایا، اللہ کی خدمت کریں اور انہیں اپنے اہل خانہ ان پر ترجیح دیں۔ خطبوں میں خود خطیب اپنی بہت اٹارہ بہت کم کرتا ہے اور یہاں کہیں ہے وہ بھی زیادہ اتنا آخر کے لہجہ میں نہیں۔ مثلاً جس جگہ اپنے تئیں اہل عالم کی کسوٹی ڈالایا ہے تو مراد اُس سے صرف اتنی ہے کہ میں اہل حق اور اہل باطل میں سے ہوں اور مسنون جو یا ہے حق میں تجویز تیر و تفریق کر سکتا ہوں۔ مگر اسے ساتھ سپر ہن : وہ دیا گیا ہے کہ میں جو کچھ کتابوں فرمان الہی کے مطابق کہتا ہوں۔

(حضرت) شیخ کے حالات جو آپ کے مریدین عبد اللہ بن محمد ابن ادی اور عبد المحسن البغدادی اور عبد اللہ بن نصر النعمانی نے لکھے ہیں جن کا نام "انوار المناظر" ہے اور ہیئت الاسرار کے مصنف (۱۰۹۰ھ) نے ذکر کیا ہے، افضل ہم کو نہیں مل سکتے۔ سمجھانی نے اپنی لغت کتاب الاسباب میں (حضرت) شیخ کا اسم "جیل" لکھ کر اُس کے آگے کچھ جگہ چھوڑ دی ہے۔ آپ کے حالات سمجھانی کے مراجعہ زاد نے بھی کچھ قلمبند کیے ہیں۔ جن میں تہذیب و سائنس تو ضرور ہے مگر ارادت سے خالی ہیں۔ پھر آپ کے کچھ حالات موفّق الدین عبد اللہ البغدادی نے بھی جمع کیے ہیں (حضرت) شیخ کی آخر عمر میں ۵۰ دن تک آپ کی خدمت میں برابر حاضر رہے۔ ان کا بیان ہے کہ اہل بغداد (حضرت) شیخ کی بڑی عزت کرتے اور بہت مانتے تھے اور کشف و کرامات کے بھی قائل تھے مگر میں نے ان کا کشف و کرامت (حضرت) شیخ کی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ مقدسی نے ذکر اور ایک شخص کا زمانہ ذکر میں (حضرت) شیخ کے تھما تلامذہ تھے۔ محی الدین ابن عربی (ولادت ۵۶۰ھ) نے بھی اپنی کتاب "نہج" میں حضرت شیخ کا ذکر کیا ہے۔ کہیں لکھتے ہیں کہ "وہ ماول ہیں" اپنے زمانہ کے قلمبند ہیں۔ ان زمانہ کے باب اول صفحہ ۱۶۳۔ امام طریقت ہیں "اہل طاعہ کے سند قاضی سر "راجہ حال دوم صفحہ ۴۴۔ "نورۃ العینیہ سے تھے" (جلد سوم صفحہ ۳۳) کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ (حضرت) شیخ بغان اور میں عرواٹ تھے۔ دور یہ کہ ان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ان کے سب سے بالا تر ہیں۔ صاحب ہیئت الاسرار (مستوفی) نے (حضرت) شیخ کی اکثر کرامات کا ذکر کیا ہے اور ایک زبردست سلسلہ شواہد پیش کیا ہے۔ جس وجہ سے ابن تیمیہ (مستوفی) نے

کا قول ہے کہ شواہد مذکور کا فی طور سے اطمینان بخش ہیں۔ مگر بعض کے نزدیک کتاب مذکور قابل اطمینان نہیں۔ مثلاً ذہبی اُن کو تصدوہی قصوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ابن الورودی نے "تاریخ" مبدعہ ویم صفات، ۷۰۷ء میں، اُسکی نقل کی ہے۔ بعض جملے اس قسم کے بھی آپ کی طرف منسوب ہیں جو تقاضا میر ہونے کی وجہ سے بعض کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بیہ الا سرا میں اُن اشخاص کی پوری فہرست دی ہے جنہوں نے (حضرت) شیخ کو فرماتے ہوئے سنا "قد می بدو علی قریۃ" ل دی اللہ (میرا پانچواں ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے) اسی طرح یہ جملہ بھی آپ کی طرف منسوب ہے کہ ستر ابواب علم مجھ پر کشادہ ہیں جن میں سے ہر ایک اتنا وسیع ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان کا فاصلہ۔ متعین متاخرین (حضرت) شیخ کے (مثلاً صاحب رسالہ "مخازن قادریہ" فارسی تلمیذ کنجہ برٹش یوزیم نمبری ۱۲۴۰) ایک طرف تو جملہ مقدم الذکر کی علومیت کو محدود کرنا چاہتے ہیں مگر دوسری طرف اس کے بھی قائل ہیں کہ (حضرت) شیخ اس قسم کے ادعا کے ہر طرح مجاز ہیں اور یکدل مستفین مثل و تیری کے اس قسم کے جملوں سے صرف (حضرت) شیخ کی فضیلت استنباط کرتے ہیں (دوسری جلد اول صفحہ ۲۰)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے جملے (حضرت) شیخ کی مستند تصانیف میں نہیں پائے جاتے۔ البتہ اس قبیل کی باتیں اُن نظموں میں ملتی ہیں جو آپ کی طرف منسوب ہیں۔ اور آپ کے پیروؤں اور مریدوں کے دُور جوش و اعتقاد کی دلیل ہیں۔ ان لوگوں میں آپ کی شہرت اور محبت خود پیغمبر سلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے بھی بڑھ کے پائی جاتی ہے۔ آپ سلطان الاولیاء کے لقب سے مشہور ہیں۔ اور کبھی بھی آپ کا نام نہیں لیا جاتا جب تک اُس کے سابقہ ذیل کے لقب نہیں شامل کیے جاتے؛ مثلاً ہاشم، امر اللہ، فضل اللہ، امان اللہ۔ نور اللہ، قطب اللہ، سلف اللہ، قرآن اللہ، برہان اللہ، آیات اللہ، غوث اللہ، غوث العظم۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس شہرت و فود کو آپ کے صاحبزادوں نے ترقی دی جن میں سے کیا رہ گئے نام جہۃ الاسرار میں اس طرح گنوائے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ (حضرات) اپنے پدر بزرگوار کے قدم پر چلتے تھے (۱) شیخ عیسیٰ متوفی ۵۷۳ھ مصر میں۔ (۲) شیخ عبد اللہ متوفی ۵۱۹ھ بغداد میں۔ (۳) شیخ ابراہیم متوفی ۵۹۲ھ و سط میں۔ (۴) شیخ عبد الباق متوفی ۵۹۳ھ بغداد میں۔ (۵) (۱۶) شیخ عیسیٰ و محمد متوفی ۵۹۳ھ بغداد میں۔ (۱۷) شیخ عبد الرزاق متوفی ۵۱۳ھ بغداد میں۔



(۸) سچ نمونی متوفی شمسہ رشتی میں (۹) شیخ عبدالعزیز جو سنجا رکے ایک کانوں میں رعلت کر گئے تھے جہاں جنت میں انتقال کیا (۱۰) شیخ عبدالرحمن متوفی شمسہ (۱۱) شیخ عبدالجبار متوفی شمسہ۔ بعض ارباب تاریخ اس فہرست میں کچھ اور نام بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ان میں سے شیخ عبدالوہاب اپنے پیر بزرگوار کے قائم مقام اور جانشین ہوئے۔ پھر اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے شیخ عبدالہام (شمسہ تاسلہ) اور اُن کے بعد اُن کے برادر عم زاد شیخ ابوسراج نصر بن عبدالرزاق (شمسہ نہایت شمسہ) ہوئے۔ خلیفہ ناصر بامر اللہ کے زمانہ حکومت میں (حضرت) شیخ کی اولاد اور سوتیلیوں کے کچھ لوگ تھوڑے غرض سے یہ بعد اوسے جاپان کے گئے اور بعض حضرات تاتاریوں کے مشہور حملہ میں شہید ہوئے مگر سلسلہ قادریہ کا مستقل مقام اور مرکز ہمیشہ بغداد ہی رہا۔

**فہرست اسناد** (حضرت) شیخ کی سوانح عمریوں کی ایک فہرست جرمن مستشرق البورو نے دی ہے۔ جن میں سے کتب ذیل شایع ہو چکی ہیں: — (۱) شطنونی "مختار الاسرار" (مطبوعہ قاہرہ شمسہ) (۲) محمد بن کینی تادانی "قلایۃ الجواہر" (قاہرہ شمسہ) (۳) محمد الداعی "مختار تحقیق" (مطبوعہ نیز شمسہ) جس کا ترجمہ دیسکار سالہ راکل ایشیاٹک سوسائٹی شمسہ میں چھپ گیا ہے۔ اُن کے علاوہ "غیبۃ الناظر" جو ابن حجر کی طرف منسوب ہے مگر ابورو کی فہرست میں داخل نہیں۔ اسکو ڈاکٹر ڈیزین راس نے نکلتے میں شمسہ میں ایڈٹ کیا تھا۔ شاید بہترین موجودہ سوانح (حضرت) شیخ کے ذہبی کی تاریخ الاسلام میں ملیں گے۔ جس کا ماخذ ابن النجار ہے اور رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی شمسہ کے صفحات ۱۲۶، ۱۲۷ میں شایع ہو چکی ہے۔ موجودہ زمانہ میں شیخ سنوسی نے بھی کچھ حالات (حضرت) شیخ کے تحریر کیے ہیں۔ (۴) کسی کو (حضرت) شیخ یا سلسلہ قادریہ کے متعلق پوری تحریروں سے فائدہ اٹھانا ہو تو کتب ذیل مطالعہ کرے: (۱) ان دن "مراۓ السیاح" (پیرس شمسہ) (۲) لے شاتیا "تاریخ التریہ اسلامی" (مجاہز) (پیرس شمسہ) (۳) پوپ اور کا پوانی "کانفریر بریو ریمو سے مسلمان" (الجیرس شمسہ) (۴) قرادیلوز "مذنی" (پیرس شمسہ)

(الناظر، دسمبر ۱۹۲۴ء) محمد عسکری

# تذکرہ صوفیہ کرام نمبر ۱

حضرت وانا گنج بخش علی الجویری اللاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

الہائیکہ قدیم قدردانوں کو یاد ہوگا کہ ایک رات میں ہمارے فاضل و عارف مقالہ نویس عبدالعزیز کے قلم سے تذکرہ صوفیہ کرام کے تذکرہ ان اوقات میں شائع ہوئے تھے۔ انھیں بزرگ نے اپنے شیخات قدیم کی تجویز پر بعض کا از سر نو عدد فرمایا ہے اور بطور قسط ادراک میں ذیل عنایت کیا ہے: انشاء اللہ اسی طبع اکابرانیت کے تذکرہ پر برابر نکلتے رہیں گے اور کچھ صد میں اردو میں ایک معقول و مفصل تذکرہ لکھا اور ان میں جو بیانیہ مضمون نگار صاحب نام نامی تشریف لائے ہیں ان کے لیے اچھی نہیں لیکن خالقانہ طریقت میں جب وہ قدم رکھتے ہیں وہ اپنی شخصیت کو فنا کر کے معضیہ بیت الہی کے قالیب میں جا رہے گرتے ہیں ہم بھی اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتے کہ ع ایک عاشق ہو اس پر وہ نگاری میں۔

دایہ طیر الناظر

سر جامعہ جلالہ قطاب محرم جمیع ابواب معشوق بہ اوصاف معنوی شیخ علی بن عثمان بن علی عزوی ندس سہ کل اولیٰ زمانہ سر تھے آپ کی کنیت ابوالحسن تھی۔ جو ترب کا وطن ہے جو مصافات غزنی سے ہے سلطان محمد غزنوی کے پہلے حملہ کے زمانہ میں شہزادہ مسعود کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور لاہور میں اقامت فرمائی اور وانا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ ہی کے تدوینیت لڑو کی برکت سے لاہور کے اطراف و اکنات میں اسلام پھیلایا۔ امراۃ الاسرار میں آپ کے پیرو مرشد کا نام نامی ابوالحسن غفری مرقوم ہے جو اصوات میں حضرت جنید کا مذہب رکھتے تھے۔ تفحات الانس میں ہے کہ کنیت سے ابوالحسن ست عالم دہانت بود و مرید شیخ ابوالفضل بن حسن خلی ست تو صحبت از شاخ دیگر یہ ست لبامراۃ الاسرار میں ہو کا تب ہوا کہ امراۃ الاسرار میں ہے کہ خواجہ احمد مادی سرخی جو اپنے زمانہ میں بیان کیا ملائے تھے ان کا اور حضرت کا بہت سا تھرا ہے۔ ایک روز آپ نے پوچھا کہ اسے خواجہ احمد آپ کے تورو کا باعث کیا ہوا۔ کیا واقعہ گذرا جو آپ نے پہلے پہل تو یہ کی اور تمام شاغل دنیاوی سے کنارہ کشی فرمائی۔ خواجہ نے فرمایا ایک زمانہ کا واقعہ ہے کہ سرخس سے میں نکل کر ایک سیاہان ہنیا

عجائب اونٹ چرا کرتے تھے اس مقام پر میں نے ایک عرصہ تک قیام کیا۔ ہمیشہ بھوکا رہتا اور اپنا  
 لکھنا دوسرے کو دیدیتا تھا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ جنگل سے ایک شیر نکلا اور ایک اونٹ کو لیکھا  
 اور ایک اونٹ کے ٹیلہ پر لیجا کر اُسے مارا۔ اور آواز دی۔ آواز کے سنتے ہی جنگل سے طح طرح کے درندے  
 گرگ۔ شغال و روبہ وغیرہ دوڑے اور اونٹ کا گوشت کھانا شروع کیا۔ جب یہ سب سر ہو چلے گئے  
 تو شیر خود آیا اور کچھ کھاتا چلا گیا۔ دور سے ایک لومڑی دکھائی دی۔ شیر لومڑی کو اتار دیکر ہٹ گیا اور لومڑی  
 کو کھانے دیا۔ جب یہ لومڑی کھا کر چلی گئی تو پھر خود آیا اور کھولا سا گوشت کھایا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ یہ سب  
 تماشا دور سے دیکھ رہے تھے۔ جب شیر جانے لگا تو مجھ سے گویا ہوا کہ اے ابوالقاسم! برا بھلا کتوں کا  
 کام ہے۔ مردان دین کا ایثار یہ ہے کہ جان پر کھیل جائیں۔ اُس سے یہ کلمات سن کر میں نے تمام  
 مشغولوں سے کنارہ کشی اختیار کی۔

نعمات اللہ میں ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ علی الجویریؒ نے حضرت شیخ الشافعیؒ ابوالقاسم گرگانی  
 سے دریافت کیا کہ درویش راکتہ چیز بایا اسم نقرہ ساز دار گرد حضرت شیخ الشافعیؒ نے فرمایا کہ تم میں  
 چیزیں (۱) پارہ راست بتواند وخت (۲) سخن راست بتواند گفت و شنود (۳) پاسے راست بر زمین  
 بتواند زد۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے ساتھ درویشوں کی ایک جماعت تھی۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر  
 ہم نے کہا آؤ ان کلمات کے شرح میں ہر اک کچھ کچھ بیان کرے ہر اک نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق بیان  
 کیا۔ لیکن جب شیخ علی الجویریؒ کی نوبت آئی تو انھوں نے فرمایا کہ پارہ راست درویش آن بڑا  
 دوزندہ بزمیت۔ سخن راست آن باشد کہ بجاں شنود و بزمیت۔ یعنی از روئے تحقیق ہونا چاہیے نہ کہ  
 از روی تصور و بحث و جدوران لغت کنندہ بہزل و بزندگانی مآثر انہم کنندہ بعقل و پاسی عدالت زمین  
 مردن آن باشد کہ بوجد بزمین زندہ بہاد۔ شیخ علی الجویریؒ کے اس کلام کو لوگوں نے شیخ الشافعیؒ  
 ابوالقاسم گرگانی کے سامنے بیان کیا آپ نے فرمایا۔ اصحاب علی جبرہ اللہ تعالیٰ۔

حضرت داتا گنج بخشؒ علی الغزالیؒ ثم الجویریؒ ثم اللاموریؒ رحمۃ اللہ علیہ صاحب دیوان تھے۔ ایک مرتبہ  
 ایک صاحب آپ کے دیوان کو مانگ کر لے گئے اتفاق سے صرت وہی ایک نسخہ تھا۔ ان حضرت نے اس  
 دیوان کو الٹ پلٹ کر دیا۔ اور حضرت شیخ کا نام نکال کر اپنے نام سے اسے منہور کر دیا چنانچہ اس نسخہ کو آپ  
 خود کشف المحجوب میں بیان فرماتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے تصوف میں ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا



نام نہاج الدین تھا۔ ایک دوسرے صاحب اس کو عاریتاً مانگ کر لے گئے اور سر نہ کر کے اپنے نام دو گون میں شائع کیا: افسوس ہو کہ یہ دیوان اور کتاب اب کہیں نہیں ہو اس کے بعد پھر آپ نے ایک اور کتاب تصنیف فرمائی جو آج تک اہل کتب تصوف میں شہرہ کی جاتی ہو اس کا نام کشف المحجوب ہو اس کتاب کے بعض مضامین پر انشاء اللہ تعالیٰ آگے بحث کی جائے گی۔

ابو سعید سجوریؒ نے آپ سے دریافت کیا کہ تصوف کے طریقہ کی تحقیق کیا ہو اور اہل تصوف کے مقامات کی کیفیت ان کے اقوال و مذاہب۔ ان کے رموز و اشارے۔ خدائے بزرگ و برتر کی محبت و حقیقت۔ دلون پر اس کے اظہار سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہو اور اسکی ماہیت تک پہنچنے میں عقول کے محجوب ہونے کا سبب کیا ہو نفس اسکی حقیقت سے کیوں متنفر ہو اور شرح کو اپنی پاکیزگی و صفائی سے کیا آرام پہنچتا ہو اور روح کی پاکیزگی کس شے میں ہو۔ ان سوالوں کے جواب میں غالباً کشف المحجوب تصنیف فرمائی گئی ہے آپ کہتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں یہ علم حقیقت پرانا ہو گیا ہو اسلئے ملک نفاسی خواہشوں میں مبتلا ہو رہے ہیں انہی کے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ عام علما نے جو طریقت کی صورت بیان کی وہ اصل کے خلاف ہو۔ عام کہتے ہیں کہ ہم حق کو پہچانتے ہیں اور خواہشوں کی آرزو و محبت نفوس اور سیلان سرگوریت کا شوق اور محبت کی سوزش سمجھ کر آسودہ خانہ میں مریدوں نے مجاہدہ سے ہاتھ اٹھا لیا ہو اور معلول ظن کا تام شاہد رکھا ہو۔ زمانہ کی اس حالت کو بیان کر کے آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اس مضمون پر پہلے کئی کتابیں لکھیں مگر یہ سب عنایہ ہو گئیں۔ جھوٹے مدعیوں نے لوگوں کو بھانسنے کے لیے اس میں سے بعض اقوال کے لیے اور باقی کو ترک کر دیا اور زیادہ کر دیا بعض پڑھنے کے لیے بیٹھے مگر یہ سب نہیں بعض نے پڑھا مگر سمجھا نہیں۔ دل میں کسی کے طالب کا درد نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو اپنی دربان کی ضرورت نہ جھوڑتا۔

فصل فی فوائد و بحال طالب شینا یوانق الیہا

چونکہ کسی کو در طلب نہ تھا اس لیے ان کتابوں کو ضائع کر دیا

مفت بینا یہ آپ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام اسرار الخرق و الامانات ہو اس زمانہ میں وہ میں اسکا رولج تھا مگر اب کہیں نظر نہیں آتی۔ اسے حضرات میں ایک جگہ حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دارالافتاء میں آئے وہاں فقرا سے ماسیہ میں سے ایک کی صحبت میں بیٹھ کا مجھے اتفاق ہوا ایک دفعہ انھیں خوش پا کر میں نے سوال کیا کہ بھائی صاحب ان فقرا سے اور پریشان احوال سے آپ کا قصہ کیا

انہوں نے فرمایا کہ لوگوں سے پیچھا چھوڑنا زمین نے کہا کہ لوگ بہت ہیں اور غم کم ہر۔ آپ ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے پھر خود ہی کیوں نہیں پیچھا چھوڑ دیتے۔ تاکہ ان تمام مشاغل سے آپ کو نجات مل جائے۔ یہ بیان کر کے آپ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ بہت ہوتے ہیں جو لوگوں میں مشغول ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ لوگ ان کی طرف مشغول ہیں۔

حضرت خود ایک مرتبہ کا اپنا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے ایک واقعہ پیش آیا جسکے حل کی میں نے بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی آخر شیخ بایزید بسطامیؒ کے مزار اقدس پر مجاوری شریف کی۔ آخر کار وہاں حل نصیب ہوا۔ لیکن اس کے بعد پھر ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے حل کرنے کے لیے تین ماہ میں مزار شیخ بایزیدؒ پر مجاوری کرتا رہا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ حل ہونے کی امید پر ہر روز زمین دفعہ نہاتا اور تیس دفعہ دنیو کرتا تھا۔ جب یہ سب کام نہ آیا تو وہاں سے اٹھا اور خراسان کا رخ کیا جہاں کہ شہر کش کے ایک گاؤں میں پہنچا۔ وہاں ایک خانقاہ میں صوفیوں کی ایک جماعت مقیم تھی میری حالت یہ تھی کہ ایک گدڑی بدن پر تھی اور ہاتھ میں عصا اور چمڑے کا ایک لوٹا، وہ بس اس جماعت نے مجھے بہت حقیر اور ذلیل سمجھا مجھے ایک بالاخانہ پر جگہ ملی اور وہ جماعت صوفیہ اس سے بلند تر درجہ بالاخانہ پر مقیم ہوئی۔ وہ خود اچھا اچھا کھانا کھاتے تھے حتیٰ کہ میرے ناک میں پڑا تو تکی اور مجھے صحن ایک سوکھی روٹی جو پڑے پڑے سبز ہو گئی تھی۔ کھانے کو دسی اور خجیر طرز اور طنے پھینکنے لگے جب وہ کھانا کھا چکے تو خربزے کھانے لگے اور میری حقارت اور اپنی خوش طبعی کے طور پر چھلکے میرے سر پر پھینکتے جاتے تھے۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ اے اللہ اگر میں ان لوگوں میں سے ہوتا جو تیرے دوستوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں تو میں ان سے الگ نہ ہوتا جس قدر وہ لوگ مجھ پر زیادہ طرز و طعنہ کرتے تھے اُسی قدر اپنے نفس کی تحقیر دیکھ کر میں خوش ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک طعنوں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے وہ عقدہ جسکے حل کے لیے میں سرگرداں تھا حل ہو گیا اور اس وقت میں نے جانا کہ بزرگوں نے کس لیے جابلوں کی حرکتوں کو رد رکھا ہوا ہے کس لیے ان کے بوجھ اٹھائے ہیں۔

اپنے پیروں و مرشد کے حال میں کشت المحبوب میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ کو دفعتاً کرار ہوا تھا انہی پر باتیں ڈال رہا تھا کہ یہ سے ولیم آیا کہ جب سب کام تقدیر اور قسمت سے ہیں تو کیوں حصول کرامت کے لیے لوگ اپنے ہم جنوں میں سے پرہیز کرتے ہیں جیسے دل کے اس خزانے سے مطلع ہو کر آپ نے فرمایا

کہ ہر حکم کے لیے ایک سبب ہوتا ہو۔ جب خدا سے بزرگ و بڑتر جانتا ہو کہ سختی کرے تو اسے اور ظالم ہے کہ مالک کا  
 تاج عطا فرمائے تو پہلے اُسے تو یہ بخشتا ہو اور اپنی ایک دوست کی خدمت میں مشغول کرتا ہو تاکہ یہ خدمت  
 اُس کے لیے آراستہ کا سبب ہو۔ پھر حضرت آگے تحریر فرماتے ہیں کہ وفات کے وقت میرے پیروں میں  
 حضرت ابو الفضل حسن خٹائی کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ اس نے دوست میں سے ایک شخص سے میرے  
 دل میں کچھ رنج تھا۔ شیخ علیہ الرحمۃ میرے اس حال سے مطلع ہو گئے اور فرمائے گئے کہ بٹا کیا اعتقاد کا ایک  
 مسئلہ میں ہمیں تباہ کن۔ اگر اپنے تئیں اس پر مستحکم رکھو گے تو سب رنجوں سے چھوٹ جاؤ گے۔ یاد رکھو کہ  
 ہر محل کے نیک و بد تمام احوال خدا سے جل و علی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ خدا کے فعل  
 پر خصوصیت نہ کرو اور دلیلیں کو لی رنج نہ رکھو۔

حضرت شیخ علی الجوری داتا گنج بخشؒ نے جن شاخ کو دکھایا اور ان کی صحبت میں رہے ان کے  
 نام نامی یہ ہیں حضرت شیخ ابو الفضل حسن خٹائیؒ۔ ابوالقاسم عبدالکریم قیسریؒ۔ ابوالعباس احمد بن محمد شستانیؒ  
 ابوالقاسم علی بن عبدالعزیز الکرماتیؒ۔ ابوالاحمد مظفر بن احمد بن حمدان۔ ان بزرگوں کے علاوہ حضرت شیخ نے  
 کشف المحجوب کے باب ہفتم میں ان شاخ کے نام گنا سے ہیں جو ان کے تہ نصرت اور جو گناہ قوم اور ارباب معانی  
 میں سے تھے۔ ان کی تعداد ۴۲ ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ ابوالعباس احمدؒ سے میری بڑی دوستی تھی بلکہ بعض علوم میں وہ  
 میرے استاد تھے۔ میں ان سے زیادہ شیخ کی تعظیم کرتا ہوں اور موجودات سے قطع تعلق کرنے والوں میں  
 دیکھا۔ آپ کا قول تھا کہ وہ نیستی جو دیدار میں ہو اس بہت بہتر ہے جو حجاب میں ہو اور جب خدا وہی  
 ہو جس پر عدم جائز نہیں تو پھر اگر وہی ایسا نیست ہو جائے کہ میری نیستی کو پھر نیستی نصیب نہ دے تو کیا مضائقہ ہو۔  
 آپ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت شیخ ابوالقاسم علی بن عبدالعزیز الکرماتیؒ کے سامنے بیٹھا ہوا  
 تھا اور انہی دار و اتون کا تذکرہ کر رہا تھا تاکہ حضرت کھرے کو لکھو گئے سے الگ فرما دیں۔ آپ میرے حال  
 کو بہت توفیر کے ساتھ سمجھ فرما رہے تھے میرے دل میں یہ خیال گذرا کہ شاید اب بتاؤں آپ کا گذرا اس کو چہ  
 میں نہیں ہوا ہے شیخ علیہ الرحمۃ کو میرے باطن کا حال معلوم ہو گیا اور فرمایا یہ فرد تنی دنیا زندقہ سے  
 لیے نہیں ہو بلکہ اُس کے لیے ہر جس نے یہ حال تمہیں بخشتا تھا۔ اس میں تمہاری خصوصیت نہیں بتام  
 طالبوں کے لیے یہ عام ہے۔ میں یہ سن کر حجب نہ کیا۔ شیخ نے پھر فرمایا کہ بٹا اس طریق میں آدمی کو صرف



اسی قدر نسبت حاصل ہو کہ جب اس ظرفیت کو اس سے متعلق کرتے ہیں تو وہ اس کی یافت کے پندار کو اختیار کرتا ہو اور جب اُسے معزول کرتے ہیں تو پندار کی صفت عبارت ہی عبارت باقی رہ باقی ہو یعنی انشاء عدم و وجود دونوں پندار میں داخل ہیں۔ اس قید سے آدمی کو کبھی رہائی حاصل نہیں ہوتی۔ اس سے چاہیے کہ بندگی کی یہ اختیار کرے اور مردانہ دشی اور فرما برداری کے سو تمام نسبتیں گم کر دے۔

ایک مرتبہ حضرت داتا گنج بخشؒ حضرت خواجہ ابو احمد مظفر بن احمد بن حمدانؒ کی خدمت میں بیٹھے تھے اور میثاق پر کیا ایک مدعی بھی پاس بیٹھا ہوا اپنی عبارت میں یہ کہہ رہا تھا کہ فانی ہو گا اور پھر باقی رہے خواجہ مظفرؒ نے فرمایا کہ فنا پر بقا کی صورت کیونکر ہو سکتی ہے اس لیے کہ فناست نیستی مرد ہو اور بقا هستی کی ذات دلالت کرتی ہے، فنا سے ہر ایک اپنے صاحب کے غمی کرنے والا ہوتا ہے پس فنا فنا سے معلوم ہے جب معلوم نیست ہوتا ہے تو عین باقی رہتا ہے نیست نہیں ہوتا کیونکہ وہ شے دیگر ہے اور یہ روا نہیں ہے کہ تین تین فنا ہو جائیں۔ فنا صفت کے لیے مخصوص ہے اور سبب کا فنا ہو جانا جائز رکھا گیا ہے پس صفت و سبب جب فنا ہو جاتے ہیں تو موصوت اور سبب باقی رہتا ہے جس کے ذات پر فنا کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا حضرت خواجہ ابو احمد مظفرؒ کے اس بیان کی تشریح آپ یوں فرماتے ہیں کہ بندہ کا اختیار بندہ کی صفت ہے اور اپنے اختیار میں بندہ جناب باری تعالیٰ کے اختیار سے محبوب ہے پس بندہ کی صفت اس کی اور حق کے درمیان میں حجاب بنجاتی ہے۔ جناب باری عز اسمہ کا اختیار ازلی وابدی ہے اور بندہ کا اختیار حادث جو شے ازلی وابدی ہے وہ فنا پذیر نہیں ہو سکتی اور حادث ثانی و غیر باقی ہے۔ چنانچہ جب خدا جل جلالہ کا اختیار بندہ کے حق میں بقا پاتا ہے تو اس وقت بندہ کا اختیار فانی اور اس کا تصرف منقطع ہو جاتا ہے۔

گرمی کے موسم میں ایک دن آپ پریشان حضرت خواجہ ابو احمد مظفرؒ کی خدمت میں آئے! انھوں نے فرمایا ابو الحسن کیا حال ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے سسر دیا ہے حضرت خواجہؒ نے اسی وقت ایک آدمی کو بلا بھیجا اور نوال اور نیز اہل عشرت کی ایک جماعت کو طلب فرمایا۔ عشق کی آگ، ارادہ کی قوت اور بنائین پڑنے کی کوشش نے سماع کے چند کلمہ کے بعد ہی مجھے سبقت قرار کر دیا۔ اور کچھ عرصہ بعد جب حشر میں کمی ہوئی تو حضرت خواجہؒ نے مجھے پوچھا کہ اس سماع میں تمہارا کیا حال ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ بہت خوش ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ اس سماع اور کونے کی آواز تمہارے پیے برابر ہوگی۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ سارے کمال اسم و وقت تک قوت ہوتی ہے جب تک شاہد نہ ہو جب



میں نے اس کی کیا کیا حال ہو فرمایا گیارہ سال ہوئے کہ میرا دل وہاں تک پہنچا ہوا اور اس جگہ سے  
میں نہیں گزر سکتا۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مرد میں تھا۔ وہاں حدیث کے ایک امام تھے جنھوں نے  
کہا کہ میں نے سوائے کی بات میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں نے کہا خائب ہوا جناب نے جو امام ہیں ایک  
لوگو جو گناہوں کے اہل حلال کیا ہو انھوں نے فرمایا اگر تم خود حلال نہیں سمجھتے ہو تو کیوں سوائے  
ہو۔ میں نے عرض کیا اس کی کئی صورتیں ہیں یعنی اگر دل میں حلال کی تاثیر ہو تو سماع حلال ہو اور اگر  
حرام کی تاثیر ہو تو حرام ہو۔ اور اگر سماع کی ہو تو سماع ہو۔ جس چیز کو بظاہر اسباب گناہ کہا جاتا ہے اور باطن  
س کی رفتار کئی وجوہوں پر ہو تو ایک چیز پر اس کا اطلاق کرنا محال ہوتا ہے۔ یعنی سماع میں جو کوئی سبب کو عموماً  
دیکھتے اور خطا کو خطا اس کے لیے سماع حلال ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ شیخ مسلم ناری سے میں نے سنا ہے  
کہ ایک ویش سماع میں بہت بقیہ اسی ظاہر کرتا تھا۔ ایک شخص نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ بیچہ جیسا  
جو تھیں بیچہ ریح پر داز کر گئی ہر دو سماع کے غلبہ میں اس قدر حال چاہیے کہ اس کا سماع گھنگاروں کو  
ست چھڑائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک ویش کو دیکھا ہے جو آذر با نجان کے پھاڑوں  
میں فکر میں لودبا ہوا یہ اشعار پڑھتا جاتا تھا۔

والد ما طلعت الشمس والغرب  
والادانت فی قلبی ودر سو اسی  
ولا تلبست الی قوم احد ثم  
الادانت حدیثی میں جلسا لی  
ولا ذکرک محزوناً ولا تسلماً  
الادھبک مفردناً بالناسی  
ولا تمست بشری الماء من عطش  
ووقدرت علی الانیان زر تکم  
سحباً علی الوجہ وشیاً علی الراسی

وہ ویش ان اشعار سے ایسا متغیر و متاثر ہوا کہ ایک چھر پر بیٹھ گیا اور ریح پر داز کر گئی۔ آخر میں آپ  
فرماتے ہیں کہ میں نے علی بن عثمان جلالی اس کو زیادہ دوست رکھتا ہوں کہ اپنے مریض کو سماع میں پڑانا  
دون تا کہ ان کی طبیعت پریشان نہ ہو کیونکہ اس میں بڑے خطرے اور بڑی آفتیں ہیں۔

صاحب مرآۃ الاسرار کی روایت کے بموجب آپ کا سنہ وفات ۷۷۷ھ خمس ستین ہجری ۱۳۷۵ء  
مور لاہور میں حضرت کا حراز مبارک ہے جو حج خاص عام اور خود حضرت خواجہ غریب نواز خواجہ معین الدین بھٹی



مہاراجہ جی رستمہ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

آپ کے چند کلمات طیبات دہج ذیل کیے جاتے ہیں تاکہ تازگی بخش ارداخ طالبین جون  
آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں علم ہیقت پر نا ہو گیا ہے خاص کر اس ملک میں کہ سب  
لوگ نفسانی خواہشوں میں پڑے ہوئے ہیں اور دنیا سے انہی کے راستہ سے الگ ہیں۔ مہمیان زمانہ اور  
علمائے دنیا نے طریقت کی صورت اس کے اصل کے خلاف پیدا کر دی ہے پس ہمت کر دے اس چیز کے لیے  
کون صانع حق کے سوا عوام کی دست رسی و امان تک نہیں ہے۔ ابنا سے زمانہ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے  
آپ فرماتے ہیں کہ خداے جلّ علیٰ نے ہمیں اس زمانہ میں پیدا کیا ہے جس میں لوگوں نے حرص و دلچ کا  
نام سرپرست بن کر جاہ و ریاست کی طلب کا نام عزت اور علم۔ اور ریا کا نام ذہن الہی۔ اور کمینہ پوشیدہ رکھنے کا  
نام علم آپس میں لڑائی جھگڑے کا نام بحث و مباحثہ۔ لڑائی بھڑائی اور کمینہ پن کا نام غلط افغان کا نام زہرہ  
خواہش نفسانی کا نام ارادت۔ ہر پان طبع کا نام معرفت۔ اور نفسانی حرکات قلب کا نام محبت۔ خدا کے  
است سے پھرنے اور بیدیں ہونے کا نام فقہری۔ جان بوجہ کر انکار کرنے کا نام صفائی۔ زندقہ و بدعتی  
اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام فتنائی۔ اللہ پر غیر خدا صمد کی شریعت ترک کر دینے کا نام مہر ہیقت۔ اہل زمانہ  
کے آفت کا نام۔ حالہ رکھا ہے آپ فرماتے ہیں کہ علم اسی قدر سیکھنا فرض ہے جس سے عمل درست ہو۔  
اور کہ بفائدہ علم سیکھنے والوں کی حق تعالیٰ نے نذرت فرمائی ہے۔ و من تعلم موت کا بغیر صمد و لا ینفعہ  
اور آئندہ بت عملی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اعدا و بائعہ من علم لا ینفع۔ علم باعمل ہونا چاہیے غیر خدا  
صمد سے فرمایا ہے کہ المنتخب بدافقہ کا شمار فی الطاحون۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو جبری القول اور قدری الفعل ہونا چاہیے تاکہ قدر اور جبر میں اسکی رفتار  
برست آئی۔ حضرت ابو بکر راق ترمذی رستمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ التوحید و النجود فوق القدر  
فقر و غنا کے باب میں آپ فرماتے ہیں کہ غنا کا نام خاص خداے جلّ علیٰ کے لائق ہے لوگ اس  
نام کے متبع نہیں ہو سکتے اور فقر کا نام لوگوں کے لیے ہے خداے بزرگ و بزرگ کے لیے ردائیں۔  
مجازاً ایک شخص کو غنی کہا جاتا ہے مگر حقیقتہً وہ غنی نہیں ہوتا۔ غنا و جو اسباب سے متعلق ہے ہم قبول  
اسباب غنا کی حالت میں اسباب کے محتاج ہیں اور حق تعالیٰ اسباب الاسباب ہے۔ غنا سے جتنی چیزیں  
ملی بخت۔ جو یہ ہر کہ ایک کس کی حاجت نہیں بقیل مسایشام و حکیم مایرید۔ کوئی اسکی مراد کو

رفع نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی اسکی قدرت کو رد کر سکتا۔ جو وہ حقیقت موجودات کو الٹ دینے اور خلق خدا پر قادر ہو ہمیشہ اسی صفت سے رہا ہو اور رہیگا۔ غنا سے مجازی بنی خلق کی صفت ہو اسباب مذہبی کا بافرست و فراغت حاصل ہو نا یا کسی بلا سے چھوٹنا یا کسی مشاہدہ سے آرام پانا ہو۔ یہ سب حادث و غیر طلب و حسرت کا سلسلہ اور عاجزی اور خواہش کا مقام ہو۔ یا ایھا الناس انتم الفقراء الى الله واللغو الحیید فقر ما سواہ سے دل کی فراغت ہو اور غنا ما سواہ کی طرف دل کا شغول ہونا جب فراغت حاصل ہوگی تو فقر غنا سے بہتر نہیں اور غنا فقر سے بہتر ہے۔ غنا تنہا کی کثرت ہو اور فقر تنہا کی قلت۔ اور متاع سب مذکور خدا ہے۔ جب غنا اپنے ملک کے ترک کی خواہش کی تو شریعت و ریاضات سے اٹھ گئی اور دونوں اسموں سے فارغ ہو گیا۔ اس گروہ کی بہار تون میں عدم و فنا سے مراد بڑے اسباب اور ناقابل تعریف عفت کی پسندیدہ عفت اور مستودہ اسباب کے طلب میں ترک کر دینا ہے۔

صوفی اس کو کہتے ہیں جو اپنی معاملہ اور اخلاق کو مہذب بنائے اندیت کی آفتون سے کنارہ کرے۔ یہ اسم بطور اسماء اعلام کے ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں بہت لوگوں کو تصوف اور اہل تصوف سے حجاب میں رکھا۔ اور پس کوئی تو یہ خیال کرتا ہے کہ یہ طریق صرف ظاہری اسباب کی ورزش ہو اور باطن کے مشاہدہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بے حقیقت اور بے اصل رسم ہو یا نیک کہ علماء نے ظاہر نے تصوف سے انکار کیا ہے اور باطن کی صفائی کی خواہش کو دل سے دور کر دیا ہے اور گزشتہ بزرگوں اور اصحاب کے طریق کو ترک کر دیا ہے۔

ان الصفات صفتہ الصریق ان اردت عموداً علی التھمت

صفائی کی جڑ خدا ہے جل و علی کے سوا سب سے دل کو ہٹا لینا ہے اور شاخ بیو نادنیاسے غلطی اختیار کرنا ہے آپ فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں تین قسم کے آدمی ہو کرتے ہیں۔ صوفی تصوف۔ اور مستصوف۔ صوفی وہ ہے جو اپنے آپ سے قافی ہو اور حق تعالیٰ کے شوق میں باقی ہو بلبلیتوں کی قید سے آزاد اور حقیقتوں سے وابستہ ہو۔ مستصوف وہ ہے جس میں درجہ کے باہر کا طلبکار ہو اور طلب میں اپنے تئیں لٹکا رہا ہو۔ درست رکھتا ہو اور مستصوف وہ ہے جس نے مال و مرتبہ اور دنیا کی نگاہ رکھنے کے لیے اپنے تئیں ان لوگوں کے مانند بنایا ہو اور ان دونوں کے معاملات سے بچ کر ہو۔

آپ تصوف کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ تصوف حقیقتہً لارسم ہے۔ اس لیے کہ رسم معاملات بندہ سے

متعلق ہر اور اسکی حقیقت خدا سے وابستہ ہے جب تصوف خلق سے منہ پھیرنا ہوا تو یقیناً اس کے لیے کوئی رسم نہیں ہو سکتی۔

آپ فرماتے ہیں کہ رضا در طرح کی ہوتی ہے۔ ایک حق تعالیٰ کی رضا ہر بندہ سے اور دوسرے بندہ کی رضا ہر حق تعالیٰ سے رضی اللہ عنہم و رضوانہ علیہ۔ حق تعالیٰ کی رضا یہ ہے کہ بندہ کو نعمت اور ثواب کی کراست کرنے کا ارادہ فرمائے اور بندہ کی رضا یہ ہے کہ خدا سے بزرگ و برتر کے فرمان پر قائم رہے اور اس کے حکم سے سربانی نہ کرے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رضا قضا کے وارڈ ہونے سے پہلے درست نہیں ہوتی۔ حضرت سرور کائنات علیہ السلام نے دعا فرمائی ہے کہ لا اصرار فی استیلاء الرضا بعد الاستیلاء یعنی اسے اللہ (جل جلالہ) مجھے اس نعمت پر رکھے کہ جب میری طرف سے قضا آئے تو اپنی وارڈ ہونے پر مجھے راضی رہے۔ رضا کا ارادہ عین رضا نہیں اس لیے قضا کی پہلی ہی رضا ظاہر کرنا ہیمنی ہے۔ اہل خدا سنا سکتے ہیں کہ رضا احوال میں سے ہے اور اہل عواقب کہتے ہیں کہ رضا مقامات میں سے ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ حال وہ حقیقت ہے جو خدا سے بزرگ و برتر کی طرف سے انسان کو دل میں آئے اور کسب و فتح کی جاسکے اور تکلیف سے حاصل نہ ہو سکے اور مقام طالب کا راستہ اور اسکی قدمگاہ ہے اور راہ حق میں بندہ کی کسب کا درجہ ہے۔ حال خدا کی عطا ہے اور مقام مجاہدہ سے قائم ہوتا ہے۔ ایک گروہ حال کا دایم رہا رکھتا ہے اور دوسرا نہیں رکھتا۔ ساول الذکر میں شیخ عارف محاسنی کا گروہ ہے۔ اسی لفظ سے ان کو احوال میں شمار کرتے ہیں۔ ثانی الذکر میں حضرت جنیدؒ کا گروہ ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں "الاحوال کا لبروق فان بقیت فدیث النفس"۔ یہ لوگ رضا کو مقاموں میں سے شمار کرتے ہیں۔

سکرہ صحو کے بیان میں آپ فرماتے ہیں کہ خدا کی محبت کے غلبہ کو سکر کہتے ہیں اور مزاج کے حصول کو صحو کہتے ہیں۔ ایک گروہ کے لوگ جنہیں حضرت ایزید بن ابی مہنیؒ کہتے ہیں سکر کو صحو سے افضل سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ صحو آدمیت کے عفت کے اعتدال اور تکین پر جو سالکوں کا ایک مقام ہے حاصل ہوتا ہے اور یہ خدا کی طرف سے بہت بڑا احباب ہے۔ اور سکر آفت کے جاتے رہنے صفات بشریت کے دور بہت۔ تدبیر اختیار بندہ کے اٹھ جانے۔ بندہ کے نصرت کے فنا فی الحق ہونے اور جو توبہ بندہ میں اس کی بندگی کے خلاف ہر اسکی فنا ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرے گروہ کے لوگ صحو کو سکر پر فضیلت دیتے ہیں۔ ان کے امام حضرت جنیدؒ ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سکر آفت کا محل ہے۔ یہ ذکر و احوال



پریشانی اور صدمت کا چا اجاتا اور اپنے سرشتہ کا کم کرنا ہر طالب اگر صحیح الحال میں ہر توحیق کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اس لیے کہ اہل حق کا دل تمام وجودات سے تنہا ہونا چاہیے۔ لوگ اشیاء کو جیسے کہ وہ ہیں نہیں دیکھتے اس لیے اس کی ماسوا میں پھنسے رہ جاتے ہیں۔ اشیاء کا دیکھنا اور طرح پر ہونا جب ایک بقا کی افتاد۔ دوسرے فنا کی نظر سے۔ بقا کی نظر سے دیکھنا یہ ہر کہ کل موجودات کو اپنی بقا میں ناقص پائے اور فنا کی نظر سے دیکھنا یہ ہر کہ کل اشیاء کو خدا عز و جل کی بقا کے مقابلہ میں ناقص پائے اور دراصل ان دونوں کا نقطہ اتصال ایک ہی ہے یہ نہرت ایک ہی مقصد کو رکھتی ہے۔ درجہ اول میں ہر وہ علم کے بیان میں حضرت شیخ علی البحریری در تان گنج بخش کی راست بنید یون کی رائے کے موافق ہر پاپ کئے ہیں کہ صاحب سکر کے حال کا کمال صحو ہوتا ہے۔ سفرات مودتی علیہ السلام صاحب سکر تے ایک تجلی کے بر داشت کی طاقت نہ رکھی۔ اور ہوش جاتے رہتے۔ جس در سر در کائنات نسلی اسد عایدہ وسلم صاحب سحر تھے۔ کہتے تھے قاب تو زمین تک عین تجلی میں تھے اور ہر شے زیادہ ہوشیار اور زیادہ بیدار ہوتے جاتے تھے۔

### شریت الراح کا سائبند کا س فساد الشراب و مارویت

سکر سب فنا کی پنداشت ہر اور بقای صفت کا عین ہر اور یہ حجاب ہر اور ہر سب صفت کے دنیا میں بظاہر دیدار ہر اور یہ عین کشف ہر سکر کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ مودتی اور محبتی مودتی باعث ہوتا ہے کیونکہ اس کا پیدا ہونا نغمت کے دیکھنے سے ہوتا ہے اور محبتی بے علت ہوتا ہے کیونکہ اس کا پیدا ہونا نغم کے دیکھنے سے ہوتا ہے اسی طرح ہر سکر کی دو قسمیں ہیں غفلتی اور محبتی غفلتی بہت بڑا حجب ہر اور محبتی امانت اور کشف ہر غفلتی اگرچہ صحو ہو مگر سکر ہوتا ہے اور محبتی اگرچہ سکر ہو مگر صحو ہوتا ہے در حقیقت یہ دونوں سالکوں کے قدموں میں اور سلطان حقیقت جب جلوہ دکھاتا ہے تو صحو و سکر کے دونوں ایک ہی وسیلے نظر آتے ہیں۔

### اذا طلع الصبح بنجم راح نساوی فی سکران و صراح

آپ فرماتے ہیں کہ ایشار کی حقیقت یہ ہے کہ صحبت میں اپنے ساتھی کا حق نگاہ رکھے اور اپنا سہی کرے اور باقی کے آرام کے لیے خود رنج اٹھائے۔ اسکی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں ایک ایشار جو صحبت میں ہوتا ہے اور دوسرا جو محبت میں ہوتا ہے۔ ایشار محبت وہ ہے جسکا ذکر و ایشار محبت وہ ہے جس میں رنج و زہد کا نام

ہر اور سب راحت ہی راحت ہو۔

نفس اور روح کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں لطیف چیزوں میں سے ہیں۔ لیکن  
 - طالع صوفیہ میں ایک خبر کا محل ہر اور دہ سراسر کا۔ جیسے کہ آنکھ بینائی کا مقام ہر اور کان شنوائی کا۔  
 نفس کی مثال شیطان کی سی ہر اور روح کی فرشتہ کی سی۔ اور نفس کی خلاف ورزی کی تلقین قرآن  
 میں فرمائی گئی ہے۔ وَنَحْنُ أَنْفُسُ الْهَوَىٰ فَاغْلِبْهُ الْغَنَىٰ ۚ هَٰذَا نَفْسُ الْكَافِرِ ۚ  
 معرفت رب طالبوں پر فرض ہے۔ بندہ معرفت باری تعالیٰ پر مکلف کیا گیا ہے۔ پس جب بندہ خدا سے  
 جمل و علیٰ کی معرفت پر مکلف ہے تو اسکو اپنی معرفت بھی حاصل کرنی چاہیے۔ اپنی سے ہر اور انسانیت  
 کی معرفت ہے۔ اس میں لوگوں کے مختلف، قوال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ انسان سے مراد صرف روح  
 ہر اور یہ بدن اس کی زرہ، و شکل ہر اور اس کا گہرا دریا ہے پناہ ہر تاکہ طبیعتوں کے خلل سے حفاظت  
 میں رہے۔ مگر یہ خیال باطل ہے اس لیے کہ انسان کا اطلاق مردہ پر بھی ہوتا ہے اور چارپائی میں بھی جان  
 ہوتی ہے گروہ انسان نہیں کہلاتا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ نام روح اور بدن پر ایک جگہ میں واقع ہوتا ہے  
 اور جب ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے تو یہ نام ساقط ہو جاتا ہے مگر یہ خیال بھی باطل ہے اس لیے  
 کہ اسد جل شانہ فرماتا ہے۔ شَلَّىٰ اِلٰی عَلٰی الْاِنْسَانِ جَبِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۚ اَوْدَمَ كِي سَجَارَ  
 طی کو بھی قبل روح انسان کہا ہے۔ ایک دوسرا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ انسان ایک جزو لای تجزی ہر اور اس کا  
 محل دل ہے مگر یہ خیال بھی باطل و محال ہے کیونکہ اگر ایک آدمی کو مار ڈالیں اور اس کا دل باہر نکال لیں  
 تب بھی انسانیت کا نام اس پر عام کیا جاتا ہے ایک اودا ہل باطل دلا بیون کا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ کھانے  
 پینے والا اور جو تغیر ہونے والا ہو وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ انسان سرالہی ہر اور یہ جسم اس کا لباس ہے۔  
 اس خیال کی غلطی بالکل یقین ہر اور اس لیے کہ مجنوں کا فروں اور ناسقون کو بھی انسان کہتے ہیں۔  
 اور ان میں کوئی سرالہی نہیں ہر اور سب تغیر پذیر اور کھانے پینے والے ہیں۔ خود اسد بزرگ و برتر  
 فرماتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نَظْفَةً فِيْ قَرَارٍ ۚ وَكَلَّمْنٰهُ ثُمَّ اَنشَاْنَا النُّفُوْةَ  
 حَلَقَةً فَنَخْلَقُنَا مِصْبَغَةً فَنَخْلَقُنَا الْمِصْبَغَةَ عِظًا ۙ مَا فَكْسُوْنَا الْعِظَامَ لِحِمًا ثُمَّ اَنشَاْنَا خَلْقًا  
 آخر فتبارک اللہ حسن الخالقین۔ پس انسان وہ ہے جو جس مخصوص صورت میں ہر اور تغیر پذیر ہو وہ  
 (ایسا) ہی ہر جو زندہ رہی اسے باری قبول کرتا ہے کیونکہ موت اس اسم کو صورت مہرور اور آلہ موسومہ دینے

جنون عقل سے ظاہر آیا باطن زائل نہیں کر دیتی۔ انسان کی کارل ترین ترکیب قین معنوں سے  
 ہوتی ہے۔ ایک روح۔ دوسرا نفس۔ تیسرا بدن۔ ان تین سے ہر ایک کے لیے ایک صفت مخصوص  
 ہے۔ جو عین کی وجہ سے قائم ہے۔ روح کے لیے صفت عقل ہے۔ نفس کے لیے ہوا اور بدن کے لیے  
 جس اور آدمی کل عالم کا نثر ہے۔ عالم سے یہ جہان اور آخرت کا دوسرا جہان دونوں مراد ہیں۔ اس جہان  
 کی نشانی پانی۔ خاک۔ ہوا اور آگ ہے۔ اور بلغم۔ دم۔ صفرا۔ اور سودا سے اسکی ترکیب ہے اور اس جہان کی  
 نشانی بہشت۔ دوزخ اور میدان قیامت ہے۔ جان بہ باعث لطافت کے بہشت کے مانند ہے۔ اور نفس  
 بہ باعث آفت و دشت کے بنزائے دوزخ کے ہے۔ اور جسم گویا میدان قیامت ہے۔ بہشت خدا کی رضا کی  
 تاثیر ہے۔ اور دوزخ اُس کی ناخوشی کا نتیجہ۔ مومن کی روح راحت و معرفت سے ہے اور اس کا نفس  
 حجاب و گمراہی سے مرکب ہے پس جب تک مومن دوزخ سے خلاصی نہ پائے اور بہشت میں نہ پہنچے  
 اتنا ہی اُن کی حقیقت سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے کہا گیا ہے روح نفس و تعالیٰ طالب خدا کے  
 لیے عقل مدبر کامل ہے۔ اور روح چونکہ بنزائے بہشت کے ہے اس لیے اپنی معنوی شریک کی طرف  
 ہر مومن کو ہناتی ہے۔ اور نفس اپنی شریک معنوی کی طرف بلاتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ نفس کی مخالفت  
 کی جائے۔ اور روح و عقل کو مدد پہنچانی جائے۔ غرض کہ نفس کی مخالفت بڑا مجاہدہ ہے۔ آپ فرماتے  
 ہیں کہ من طلب و جداد من۔ و جد طلب من جو اختلاف ہر وہ محض ظاہر معنوں میں ہے حقیقت میں  
 کوئی اختلاف نہیں اس لیے کہ مقصود مشاہدہ ہے جو ایک عقل سے زبانی ہے۔ اگر مجاہدہ سے حاصل ہوا  
 تو کہنا چاہیے کہ توفیق اُنہی نے مجاہدہ کی راہ بتائی۔ اور اگر بغیر مجاہدہ کے حاصل ہوا تو یہ سمجھنا چاہیے  
 کہ توفیق اُنہی اس لیے مجاہدہ میں ملے گی۔ لیکن یاد رہے کہ مجاہدہ میں مجاہدہ کی رویت آفت ہے  
 مجاہدہ کے لغوی کریم الوہد نے عین مجاہدہ کے نفسی مراد نہیں لی۔ بلکہ رویت مجاہدہ کے لغوی مراد لی ہے  
 اس جہان تک ہو سکے اپنے فعل کو در بیان میں مست لاؤ۔ اور کسی طرح نفس کی پیروی نہ کرو۔ کیونکہ  
 نفس نفس کی وصفوں کا فنا کرنا ہے نہ کہ صین نفس کا اور اسی کو حقیقی فنا کہتے ہیں ورنہ فقار  
 حیدر حجاب میں ہو جائے گا۔ وہ دوزخ کا ذنب لا یتقاس بہا و ذنب۔

فزا و بقا کے لغت میں اؤر معنی ہیں اور حال کی زبان میں اور معنی ہیں حال کی زبان میں بقا و بقا  
 سے یہ مراد ہے کہ جب جبل فانی ہو تو ضرور علم باقی ہوگا۔ جب گناہ فانی ہو تب من و طاعت باقی رہنے والی ہے



ان الحکمت یذہبن السیئات۔ اسی طرح جب بندہ علم و طاعت کو حاصل کرتا ہے اور غفلت سے فانی ہوتا ہے تو دوسری بقا سے باقی ہوتا ہے اور یہ دوسری بقا بڑی صفیون کو دور کرنے اور نیک صفیون کے قیام کرنے میں ہوتی ہے، لیکن اہل طریقت فنا و بقا کی اصطلاحوں کو اہل دلایت کے کمال کے درجہ کے سوا اور کسی میں استعمال نہیں کرتے۔ جو لوگ مجاہدوں کے رنج سے آزاد و مقاموں کی قید و احوال کے تیر سے فارغ اور طلب مقصود میں رسیدہ۔ قابل دید چیزوں کو دیکھے اور قابل سمع چیزوں کو سنے ہوئے اور دل کے جاننے کے لائق تمام باتوں کو جانے ہوئے۔ بھید کے سب بھیدوں کو پائے ہوئے ہیں انھوں نے اپنے بھیدوں کے پائے میں اپنی یافت میں خود بینی کی آفت کو دیکھا۔ اور سب سے ٹھہ موڑ لیا۔ مراد میں ان کا ارادہ فانی ہوا۔ رسیدہ ہونے کی وجہ سے دعویٰ کو ترک کر دیا۔ عین مراد میں مراد سے بے مراد ہوئے کل سے اپنی شرب کو الگ کر کے دنیاوی اشیاء سے دل کو ہٹا لیا۔ پس جب اس طرح پر بندہ وجود صفات کی حالت میں عادات صفات سے فانی ہو گیا تو مراد کی فنا میں مراد کی بقا سے باقی ہوا اس لیے قرب و بعد۔ وحشت و محبت۔ صحو و سکر۔ فراق و وصل۔ ظلم و مظلوم۔ اسم و علم نقوش در قوم کی قید سے آزاد ہو گیا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کسی شے سے فنا اس چیز سے محبوب ہونے کے سوا درست نہیں ہوتی۔ مگر یہ غلط خیال ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کو اگر درست رکھتا ہے تو کہا جائے کہ وہ اس سے باقی ہے۔ یا اگر اسے دشمن رکھتا ہے تو کہا جائے کہ وہ اس سے فانی ہے اس لیے کہ یہ دونوں صفاتین طالب کی ہیں اور فنا میں نہ محبت ہے اور نہ عداوت اور بقا نہ محبت کی رویت ہے نہ نفرت کی۔ نہ فنا کے معنی ذات میں گرہ بستے اور وجود کے نیست ہونے کے ہیں اور نہ بقا کے معنی بقا اس کے بندہ سے ملنے کے ہیں اس لیے کہ کلیت کی فنا نہیں ہو سکتی اور نہ کسی ہرشت کے اجزاء کا فنا ہونا اور ان کا بالکل منقطع ہونا جائز سمجھا گیا ہے بندہ کے اپنے فنا صورت خدا کے جلال کے دیکھنے اور دلیر اس کی عظمت کے کشت ہونے سے ترس رہتی ہے۔ اس کے جلال کے غلبہ میں ہر شے عاقبت فراموش ہو جاتا ہے اور اس کی بزرگی کے سامنے احوال و مقام فقیر نظر آنے لگتے ہیں۔ اس حال میں فانی ہوتا ہے اور اس فنا کے میدان میں بندہ زبان حق سے ناطق اور تن عاجزی و فروتنی کر رہا ہوتا ہے۔

فانی فانی فنا فانی      فانی فانی و جدت انت  
محوت اسمی در سم و سمی      نسلت عتی ثقلت انت

منصور غنیت کے معاملہ میں آپ فرماتے ہیں کہ حضور سے مراد حضور دل بہ دلالت یقینی ہوتا کہ  
غیبی حکم اس کے لیے بینی حکم کی طرح ہوا اور غنیت سے مراد اس واسطے دل کا غائب ہونا ہوا جس کو کہ اپنے  
سے بھی اور غنیت سے بھی غائب ہو۔ جو اپنے سے غائب ہوا وہ حق کی درگاہ میں حاضر ہوا اور جو اپنے سے  
حاضر ہوا وہ حق کی درگاہ سے غائب ہوا لیکن جب جذبات الہی طالب کے دلوں پر مقہور کر دیتا ہے تو غنیت حضور موجود جاتی ہے  
اور ان بات باقی نہیں رہتی ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بنو نصر ابو بکر شیبانیؓ ابو جہلہ بغدادیؓ اور سمنونؓ غنیت کو حضور  
پر تقدم دیتے ہیں اور حارث محاسنیؓ جانیہؓ سہل قسریؓ ابو حفص صدادؓ ابو حمزہ و ابو قتادہؓ ابو مہدیؓ حریریؓ  
حصریؓ اور محمد بن خنیفؓ حضور کو غنیت پر تقدم سمجھتے ہیں۔

جمع و تفرقہ کی تعریف میں آپ بیان کرتے ہیں کہ الجمع ما جمع باوصافہ والفرقہ ما فرق بافعالہ یہ  
ارادہ کا قطع کرنا اور خدا تعالیٰ کے ارادہ کے ثبوت میں لوگوں کے اعتقاد کو ترک کرنا ہے مگر ان الفاظ  
کے استعمال میں لوگوں نے مختلف راہیں اختیار کی ہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ اس کا تعلق توحید سے  
ہے اور اس کا ایک درجہ خدا کے بزرگ و برتر کی صفات سے متعلق ہے اور دوسرا بندہ کی صفات سے  
اول الذکر میں بندہ کا کسب شفع ہے یعنی حق تعالیٰ کی صفات میں تدبیر میں اور اس میں ہیں۔ ایک  
دوسرا گروہ ہے جو علم سے متعلق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ الجمع علم التوحید و التفرقہ علم الاحکام۔ مگر اہل تصوف و  
لفظ تفرقہ سے مراد کما سب اور لفظ جمع سے مراد ہوا ہے لیتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی خصوصیت بندہ کے لیے  
جمع ہوتی ہے اور بندہ کی عبودیت حق تعالیٰ کے لیے تفرقہ کہلاتی ہے۔ لیکن جمع و تفرقہ پر ہر ایک جمع سارے  
دوسری جمع تکسیر جمع سالم یہ ہے کہ جو حق تعالیٰ علیہ السلام قوت و جداد و خلق شوق میں ظاہر کرتا ہے اور خود  
بندہ کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے ظاہر حال پر اپنا زبان جاری فرماتا ہے اور گناہ رکھتا ہے کہ بندہ اسے ادا  
کرے اور جمع تکسیر یہ ہے کہ بندہ ہونے کی مشیت سے بیہوش و بخونہ کی طرح یعنی معذور ہو۔ لان التفرقہ  
فصل الجمع بصل بعض لوگ کلام کو شکل اور دقیق بنانے کے لیے جمع الجمع کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں  
حضرت شیخ علی اللہ جویریؒ فرماتے ہیں کہ بہر یہ ہے کہ توحید الجمع نہ کہی جب جمع ایک مرتبہ کے تفرقہ کے  
مع ہوئی اور پھر اپنا احوال سے تجاوز نہیں کرتی تو پھر جمع الجمع کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ  
لفظ جمع کے محل میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ جو جمع کے محل میں ہوا اس کو اپنے سے اوپر بیچے اور باہر  
دیدار نہیں ہوتا چنانچہ جب معراج میں حضور سرور کائناتؐ کو دونوں جہان اکھائے گئے تو آسمان

اسی کی ثابت توجہ نہ فرمائی۔ کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جمع بین جمع تھے اور جو جمع کے محل میں ہو وہ تفرقہ کو نہیں دیکھتا۔  
۱۰: اِنَّا بَصَرُ وَمَا طَفَا۔

آپ فرماتے ہیں کہ معرفت و دلچسپی پر ہر ایک علمی اور دوسری حالی علمی معرفت دنیا و آخرت کی بنیاد پر معرفت دل کی حیات ہر اور اس سے انحراف کرنا ہر علما و فقہا کہتے ہیں کہ خدا سے بزرگ و برتری کی معرفت سے مراد صحت علم ہر اور شاخ طریقت فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت صحت احوال میں ہر اور یہ معرفت علمی معرفت سے زیادہ افضل ہر اس لیے کہ حال کی سمجھتا اسی وقت ممکن ہر جب علم کی صحت حاصل ہو جائے یعنی جسے خدا جل و علا کا علم نہ ہو وہ غارت ہو ہی نہیں سکتا مگر عالم ایسا ہو سکتا ہر جو غارت ہو۔ اہل اعتزال کے نزدیک خدا سے بزرگ و برتری کی معرفت عقل سے ممکن ہر اگر اہل سنت و اہل امامت کے نزدیک عقل کی سمجھتا اور نشانی کو دیکھنا معرفت کا ذریعہ ہر نہ علت اور علت محض خداوند تعالیٰ کا راڈ اور عنایت پر منحصر ہو حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے جب لوگوں نے معرفت کی نسبت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا عنفت اللہ باللہ و عنفت ما دون اللہ بنور اللہ جب خداوند جل و علا نے بندہ کو اپنی تعریف سے واقف فرمایا تو اس نے پہچانا مگر اس شناخت کے ذریعہ سے نہیں جو سب سے معمول ہوتی ہر بلکہ اس کے ذریعہ سے جس میں بندہ کا وجود ساریت کے طور پر ہوتا ہر۔ آپ فرماتے ہیں کہ الہام سے معرفت ممکن نہیں اس میں بندہ کا یقین کبھی زیادہ ہوتا ہر اور کبھی کم لیکن اصل معرفت میں کمی بیشی نہیں ہوتی اس لیے معرفت کی زیادتی بھی نقصان میں داخل ہر۔ آپ فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کی شناخت پر تقلید کرنی نہیں چاہیے۔ اور اس کو اس کے کمال کی سمجھنا اس سے پہچانا چاہیے۔ مابن کے لیے سبب کا ثبوت معرفت میں کفر ہر اور اسوا کی طرت توجہ کرنا شرک میں داخل ہر من التفت الی الاغیاء و معرفتہ اثبات اللہ جل و علا صبط چاہتا ہر بندہ کو اپنی طرت راستہ دیکھاتا ہر اور در معرفت اس پر اکتفا ہر حتیٰ کہ معرفت میں اس درجہ تک بندہ پہنچ جاتا ہر کہ عین معرفت اس کو غیر دکھلائی دیتی ہر اور معرفت کی صفت اس کے لیے آفت ہو جاتی ہر۔ حضرت ذوالنون مصریٰ فرماتے ہیں ایاک ان تکون بالمعرفۃ مدعیاً معرفت کی نیقت صحت خدا سے بزرگ و برتری کو تمام اشیاء میں متصرف ماننا اور بنانا ہر آپ فرماتے ہیں کہ توحید میں کسی ہر ایک تو خدا کی توحید ہے خدا کے لیے اور یہ ان کی



اس کا علم ہو۔ دوسری خدا کی توحید مخلوق کے لیے ہو اور یہ بندہ کے لیے توحید پر خدا کا حکم ہو اور بندہ کے دل میں توحید کا پیدا ہوتا اور قیصری لوگوں کی توحید خدا کے لیے ہو اور یہ لوگوں کا علم ہو خدا سے جل و علی کی وحدانیت پر چونکہ توحید کسی شے کی وحدانیت پر حکم کا نام ہو اور علم کے سوا کوئی علم نہیں لگایا جاسکتا۔ اس لیے اہل سنت والجماعت نے تحقیق کی مدد سے خدا سے جل و علی کی وحدانیت پر یقین کیا ہو جو کوئی توحید کو بندہ کا فعل کہتا ہو تو چونکہ بندہ کا فعل خدا کے کشف کے واسطے علت نہیں ہو سکتا بلکہ ایک طرح کا حجاب ہو۔ اور بندہ اپنی صفات کے لحاظ سے غیر ہوتا ہو۔ اس لیے اگر وہ اپنی صفت کو حق جانے لگا تو صفت کے ساتھ موجودت کو بھی حق جانتا پڑے گا۔ اس وقت مومن توحید اور اعتقاد میں ایک دوسرے کے وجود کی علت ہو جائیں گے جو نصاریٰ کے ثالث ثلاثہ کے مشابہ ہو گا جو باطل محض ہو اس لیے کہ جب تک کوئی صفت طالب کے لیے اپنی فنا سے توحید میں مانع ہوتی ہے۔ اس وقت تک وہ محبوب رہتا ہو اور جب تک محبوب ہو موحد نہیں ہوتا بلکہ کل شئی ما خلا اللہ باطل حقیقت یہ ہو کہ خدا کی توحید بندہ کے اسرار میں سے ایک سر ہو اور عبارت میں ظاہر نہیں ہوتی۔ عبارت اور عبارت بنائے والا غیر ہوتا ہو اور توحید میں خیر غیر خیرات ماسوا کہلایا جاتا ہو۔

آپ فرماتے ہیں کہ اہل تصوف میں سے بعض کہتے ہیں کہ قول تصدیق و عمل ایمان ہے ان لوگوں میں حضرت فضیل بن عیاضؒ بشر حافیؒ خیر ساج سمون محب بابہ ہزد بغدادی اور محمد حبیبی دین۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بعض لوگ جن کی جماعت زیادہ بڑھی ہو کہتے ہیں کہ ایمان سے مراد صرف قول اور تصدیق ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ و اہل بیتؑ ذوالنون مصریؒ بایزید بسطامیؒ سلیمان دارانیؒ حارث محاسبیؒ جنید بغدادیؒ سہیل بن عبد اللہ تستریؒ شیخ بلخیؒ حاتم ہرمؒ اور محمد بن فضیل ثقفیؒ ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ ایمان کی اہل تصدیق قلبی ہے اور اس کی امر انہی کی رعایت کرنی ہو۔ ایمان میں جبروت و تدبیر کو دخل نہیں اس لیے کہ طریق توحید ماسوا جبر و فوق القدر ہے۔ ملا مرہبینؒ کا مرید۔ ایمان کی حقیقت نیچا داری توکل ہو۔ و علی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین۔

آپ فرماتے ہیں کہ طہارت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری۔ اور دوسری باطنی جس طرح بدن کی پائیزگی اگر نہ ہو تو ناز و دست نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر دل کی پاکیزگی نہ ہو تو معرفت و دست نہیں ہوتی۔ طہارت ظاہری نہ ہو تو بدن کی طہارت پانی سے ہوتی ہو۔ اور دل کی طہارت توحید سے ہوتی ہو جو طہارت ظاہری پر

مردمت کز اہر فرشتے اُسے دوست رکھتے ہیں اور جو طہارت باطنی یعنی باطن میں توحید پر قیام کرتا ہو، خدا سے تعالیٰ اُسے دوست رکھتا ہو پس لازم ہو کہ ظاہری اور باطنی دونوں طہارتوں میں موافقت رہے۔ یعنی وضو کے لیے ہاتھ دھوئے تو دل کو دنیا کی دوستی کو چھوڑا لے جب پانی سے وہیں صاف کرے تو لازم ہو کہ دہن کو غیر کے ذکر سے خالی رکھے اور جب مہنوں میں پانی ڈالے تو شہوان کو اپنے اوپر حرام کرے۔ اور جب منہ دھوئے تو لازم ہو کہ تمام اشیاء مالمونہ سے منہ پھیر کر خدای بزرگ برتر کی طریقت منہ کرے۔ اور جب ہاتھ دھوئے تو تمام نصیبوں سے کنارہ کرے اور سر پر مسح کرے تو اپنے امر کو خدا سے جل دے اور کبر کے سپرد کرے اور جب پاؤں دھوئے تو علم الہی کی موافقت کی نیت کرے جب یہ کرے گا تو ظاہر و باطن دونوں کی پاکیزگی ان اُسے حاصل ہو جائیں گی۔

حیث شریعت میں ہو کہ اندم توبہ یعنی پیشانی توبہ ہو۔ اس قول میں توبہ کی سب شرطیں موجود ہیں۔ جب دل میں مذمت ہوتی ہو اور وہ دغلم ہوتا ہو۔ نفس کو ذلت ہوتی ہو اور عادیہ گناہ سے احتراز ہوتا ہو۔ توبہ کے متعلق شاخ و برگ کے اقبال مختلف ہیں حضرت سہل بن عبد اللہ سمری فرماتے ہیں التوبۃ ان لا تنسی ذنبتک اور حضرت حنیدہ فرماتے ہیں کہ التوبۃ ان تنسی ذنبتک اول الذکر میں دوام توبہ مقصود ہو اور آخر الذکر کا مطلب یہ ہو کہ توبہ کرنا واجب ہوتا ہو اور جب کے لیے مشاہدہ ضروری ہے اور شاہد میں گناہ کی ذکر کرنا حقا میں داخل ہو۔ اہل تصوف کے نزدیک توبہ تین طرح ہوتی ہے۔ ایک ظلاً سے عوَابِ پر و الذین اِذَا فَعَلُوا اٰثَامًا حَسَنَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاَسْتَغْفَرُوا لِذُنُوْبِهِمْ اور اصواب سے زیادہ صواب کی طرف۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہر تبت الیک یا تیسرا تبتی ذکا سے حق تعالیٰ کی طرف جیسے حضرت سرور کائنات صلم دراتے ہیں انی کنت لاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ نِیْ کُلِّ یَوْمٍ صَبْعَیْنِ مَرَّةً

آپ فرماتے ہیں کہ نازمین داخل ہونے کے واسطے حسب ذیل شرطیں چاہئیں :-

(۱) ظاہری پلیدی سے صفائی اور نجاست باطنی یعنی شہوات سے پاکی

(۲) کپڑے کی پاکی ظاہری تو کہ اس میں نجاست لگی نہ ہو اور باطنی یہ ہو کہ حلال کا ہو۔

(۳) جگہ کا پاک ہونا۔ ظاہر میں چا دھون اور آفتون سے اور باطن میں فساد و گناہ سے۔

(۴) قبلہ رخ منہ کرنا۔ ظاہر میں کعبہ کی طرف منہ کرنا اور باطن میں عرش اور عرش کا مشاہدہ کرنا۔

(۵) قیام۔ ظاہر قدرت کے حال میں اور باطن تبارک و تعالیٰ میں۔ پہلا شرطیت ہو دوسرا

(۶) خلوص نیت اور توجہ۔

(۷) ہدیت و فنا کے مقام میں تکیہ کرنا۔ دہل کے محل میں قیام کرنا۔ عقل سے قرآن پڑھنا۔ دل کی عاجزی سے رکوع و سجود کرنا۔ اجتماع کے موافق شہد کہنا۔ رفاہی صفت سے سلام کہنا۔ کان رسول اللہ صلی علیہ وسلم و فی جوفہ اذیہ کا زبیر اللہ جیل

آپ فرماتے ہیں کہ نازا مرتبہ ناکال حضور غیبت۔ اور کسی جیسٹر کے لیے آئینہ نہیں ہوتا حضور کی علت صین حضور جوتی ہو اور غیبت کے علت عین غیبت

آپ فرماتے ہیں کہ روزہ کی نیقت اساک ہر مینی پیٹ کو اکل و شرب سے بچانا آٹو کو شہوت کی نظر سے بچانا۔ کان کو غیبت کے سننے سے۔ زبان کو بہیدہ کہنے سے تن کو دنیا کی پیروی اور گمراہی کی مخالفت سے بچانا ہر۔ اذا ضمت فایضم سمعک و بصرک و لسانک و یدک و کل عضو منک۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا میں نے اسے ایسا کیا کہ اس صینی یا رسول اللہ آپ نے فرمایا احبس حواسک یعنی اپنے حواس کو خدا کی نیت میں مقید کر۔ حواس کو بند کرنا پورا مجاہدہ ہو کیونکہ کلیت عازم کا حاصل ہونا انھیں پانچ دروازاں سے ہو ہر ایک سامع باصرہ ذائقہ شامہ۔ الامسہ سے ان میں حواسے لامر کے جس کا محل تمام اعضا میں ہر ایک کے لیے ایک ایک محل مختص ہے ہر پس روزہ دار کو چاہیے کہ ان دروازاں میں سے جو شے مخالف شریعت و فرمان الہی داخل ہوتا چاہے اسے رفت و رنہ رب سامع لیس لہ من مرمہ الا الجوع و العطش

آپ فرماتے ہیں کہ حج کے احکام میں یہ کہ بیعتات میں احرام باندھے بیعتات میں قیام کرے۔ اور زیارت کے وقت طواف کرے۔ یہ سنت ابراہیمی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقام ہیں ایک تن کا اور ایک دل کا تن کا مقام کواظہ ہر اور دل کا مقام غفلت۔ لوگ عموماً تن کا ارادہ کرتے ہیں لیکن جو کوئی دل کے مشام کا ارادہ کرتا ہے وہ باشیاء موفہ سے روگردانی۔ لذت کو ترک۔ ذکر غیر سے انحراف دنیا سے ارض کرنے والا ہوتا ہے۔ پھر معرفت کے عنایہ قیام کر کے الفت کے مزدلفہ کا ارادہ کرتا ہے وہ ان سے اپنے ہیکل حرم الہی کے طواف کے لیے بھیجتا ہے حرم و اندیشہ اسے فاسد کے کنکریوں کو نمایاں ہینکنا اور نفس کو مجاہدہ کے مقام میں قربان کرتا ہے اس لیے مقام غفلت میں ہینکنا طبیعت کے اندیشہ سے



اسی طرح امان پاتا ہر جہل حرم کعبہ میں دشمن دشمن دشمن سے امان پاتا ہر۔  
 آپ فرماتے ہیں کہ حج دو طرح پر ہوتا ہر ایک غلبت میں اور ایک حضور میں جو ملک میں ہوتا ہر وہ  
 غلبت میں ہوتا ہر اور جو شاہدہ میں ہوتا ہر وہ حضور میں ہوتا ہر حج کا مقصد و گدگد کا دیر نہیں ہوتا بلکہ  
 شاہدہ حق ہوتا ہر اور شاہدہ حق یا قدرت حق وہ شے جو حسین دل کی زندگانی جو جسے معرفت کے ہر  
 سے بھی موسوم کیا جائے تو مضائقہ نہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ مشاہدہ کی حقیقت دو طرح پر ہر ایک یقین کی صحت کے ساتھ اور دوسرے  
 غلبہ محبت سے جب دوست کی محبت کا غلبہ اس حد تک پہنچ جاتا ہر کہ محبت کی کلیت سب حدیث  
 محبوب ہو جاتی ہر تو دوست کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ حضرت محمد بن واسع فرماتے ہیں ہر ماہر بیت  
 شیئاً تظا الا درایت اللہ فیہ ای بعثۃ الیقین۔ اور حضرت شیخ شہر فرماتے ہیں ہر ماہر بیت  
 شیئاً تظا الا اللہ۔ یعنی بغلیات المحبت و غلیان المشاہدہ محبت یقین سے پہچاننے والا ہر کو بیانیہ  
 اور محبت رکھنے والا غیر ہر نظر نہیں آتا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہر کہ معراج کی بات آنحضرت  
 صلعم نے خدا کو دکھا اور حضرت عائشہؓ مدیقہؓ سے روایت ہر کہ میں دیکھا۔ لوگ اس اختلافت میں پڑ گئے  
 مگر حقیقت یہ ہر کہ حضور صلعم نے ایک سے جو یہ فرمایا کہ میں نے دیکھا تو آپ کی مراد یہ تھی کہ میں نے  
 سب کی آنکھ سے دیکھا۔ حضرت ابن عباسؓ اہل باطن سے تھراؤن سے آپ نے اس لفظ سخن فرمایا  
 اور حضرت سنانا عائشہؓ اہل ظاہر سے تھیں ان سے آپ نے اہل باطن کی زبان کی زبان میں کلام  
 نہیں فرمایا۔ بہید کی آنکھ سے دیکھنے کے معنی حضرت جبریلؑ کی اس حکایت سے واضح ہو گا۔ حضرت  
 ایک بار فرمایا کہ اگر خداوند تعالیٰ مجھے کہے کہ مجھے دیکھ تو میں کہوں گا کہ میں نہیں دیکھتا۔ اس لیے کہ  
 آنکھ دوستی میں غیر اور بیگانہ ہوتی ہر اور غیریت کی خیریت مجھے دیدار سے باز رکھتی اور بڑی بات یہ ہر کہ بیگانہ  
 میں اُسے آنکھ کے واسطے کے سوا دیکھا کرتا تھا تو عاقبت میں کیوں واسطہ بناؤں

وانی لاحسن ظری علیک فاغض طرفی اذا نظرت الیک

مشاہدہ کی تعریف یہ بھی کی گئی ہر کہ المشاہدہ تصور اللسان بخور الجنان اس لحاظ سے زبان باہر ہر کہ  
 واردات قلبی کو بیان کر سکے۔ سکوت مشاہدہ کی علامت ہر اور گویائی کسی چیز پر گواہی دینے کا نشان  
 ہر اور ان دونوں میں بڑا فرق ہر۔ الاحصی ثناء علیک انت کما انشیت علی نقیبک

سراسر شاہد کی حالت کا پتہ لیتا ہر یعنی حضور پر نور صلعم کا منشا مبارک یہ ہو گا کہ زبان کو اس مانق میں نہیں  
دیکھتا کہ میرے حال کو بیان کر سکے اور بیان کو اس کا مستحق نہیں جانتا کہ میرے حال کو ظاہر کرے  
اس لیے تیرا کہا ہوا میرا کہا ہوا ہوا اور تیری ثنا میری ثنا ہر سے

تمنیت من اہوئی سلما راہیتم بہت فلم انک لسانا ولا طرف

”عبداللہ“

(الناظر، جون ۱۹۲۳ء)

## حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر مسعود اجداد و مہنی چرتہ علیہ

آفتاب انوار ولایت، پیشوا عالم ہدایت، پیر الطریقت، شمس الحقیقت، عمدة الانبیاء، قدوة الانبیاء، سلطان السالکین، شمس العارفین، ربان العاشقین، فرید الحق والشرع والدين، قدس سرہ، لہزہ اپنے زمانے کے سرعلیہ و، صلمان حق تھے۔ صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ ”ویرا ورن طریق بقایت شائے بزرگ است۔ وجمع مشارح برکمال عشق و عرفان و احوال و متفق اندوہ یافت و نجابت و ترک و تجرید و فقر و شوق کہ ویرا دست داد و پور پنج یکے ازین طائفہ را مجموع کمالات سورمی و معنوی در یک شخص واحد سیر شد۔ و در کشف و کرامات و وجد و حال و ہمت و شجاعت بے نظیر و کتب پرور۔“

آپ کے والد ماجد کا نام تاجی جمال الدین بن سلیمان تھا جو کتبہ (د. ق. لمان) کے قاضی تھے۔ اور والدہ ماجدہ و ملا حبیب الدین غنیمتی کی دختر نیاک اختر تھیں۔ آپ کے والد ماجد قاضی شعیب کی اولاد میں سے تھے جن کا سلسلہ ”نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ سید محمد کرمانی کتاب ”سیرالہ“ لیا میں فرماتے ہیں کہ فرخ شاہ عادل والی کابل آپ کے اجداد میں سے تھے۔ کابل کی سلطنت حوالہ شدہ روزگار سے غزنی کی سلطنت میں منہم ہو گئی لیکن فرخ شاہ کی اولاد چنگیز خاں کے خروج تک کابل ہی میں رہی۔ فقید تاجدار کے بعد آپ کے جد قاضی شعیب تمام خیال و اطفال کو لے کر لاہور آ گئے۔ گرد ہاں چند روز قیام کر کے قصور کا ارادہ فرمایا۔ قاضی قصور نے آپ کی بڑی قاصر توانی کی اور بادشاہ وقت کو آپ کے حالات سے مطلع کیا۔ بادشاہ نے تعبیہ کتبہ کی قضاۃ جو لمان کے قریب واقع ہے آپ کو عطا کی۔ چنانچہ آپ نے وہیں اقامت و سکونت اختیار فرمائی۔

آپ کی والدہ ماجدہ اپنے زمانہ کی بڑی بزرگ بی بی تھیں۔ حضرت سلطان جی کے امور و مسائل میں اکثر آپ کی کرامات کا ذکر ہے۔ آپ کا نام قرسم خاتون تھا۔

سفینۃ الاولیاء میں ہے کہ آپ کی ولادت با سعادت قصبہ کھول وال میں جو لمان کے قریب



میں سے ہے اور آج کل مشائخ کی چاؤلی کے نام سے مشہور ہے، مسند پانوا نعت ہجری میں واقع ہوئی۔ یہ موضع پاک پٹن (وجود میں) اور ہمارے ضلع لمٹان کے درمیان واقع ہے۔ اپنے شیخ کے وصال کے بعد اکتیس (سی ویک) سال قید حیات میں رہے۔ ۱۰ اور پچانوے سال کی عمر میں شنبہ کے دن پانچویں محرم ۸۶۷ھ چھ سو چوٹھ ہجری کو اس عالم فانی سے عالم باورانی کی طرف رحلت فرمائی۔ مرآۃ الاسرار میں تاریخ وفات چھ سو اڑسٹھ (۶۶۸) درج ہے یعنی ہجرت ۱۰۷۱ھ سے چار سال کا تفاوت آتا ہے۔ لیکن غمزدوں نے شنبہ پچانوے (نود و پنج) سال لکھی ہے۔ آپ کو نصب وجود حق میں جو آپ پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے دفن کیا گیا۔ مزار مبارک آج تک بنے نہ مٹا، برکات ہے۔ یزار و قبرگ۔

صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ بچپن ہی سے عشق الہی آپ کے دل میں موجزن تھا اور عنفوان شباب ہی میں تمام دنیاوی مرادوں سے دست کش ہو کر گھر سے ظلم ظاہری و باطنی کی طلب میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

سیر العارفین میں حضرت سلطان المشائخ سے منقول ہے کہ تلش ظم میں آپ گھر سے نکل کر لمٹان پہنچے۔ وہاں مولانا سناج الدین ترمذی کی مسجد میں اترے۔ علم فقہ میں ایک کتاب ہر نافع نام، اسی کا مطالعہ فرما رہے تھے کہ حضرت قطب الاسلام و المسلمین خواجہ بختیار کاکی اس مسجد میں تشریف لائے۔ انھیں دیکھا کہ ایک پاک صورت نیک سیرت ایک کتاب ہاتھ میں لیے پڑھ رہا ہے۔ آپ نے پوچھا: کونسی کتاب پڑھ رہے ہو؟ انھوں نے کہا: تاریخ۔ آپ نے فرمایا: تم سمجھتے ہو کہ اس سے تمہیں نفع پہنچے گا؟ حضرت گنج شکر نے اتنا س کیا کہ سیر النفع حضرت کی نظر گھبرا اٹھی ہے۔ یہ کہہ کر قد بوس ہوئے۔ خواجہ قطب الاسلام نے بہت نوازش فرمائی، اور جب لمٹان سے دہلی جانے لگے تو حضرت گنج شکر تین منزل تک ہمراہ آئے۔ بعد ازاں حضرت قطب الاسلام نے یہ لہجہ نصرت کر دیا کہ ابھی چند ایام ظلم ظاہری کی تحصیل میں مشغول رہو۔ اسکے بعد دہلی آکر ہمارے پاس ٹھہرا۔ حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ الہی فرماتے ہیں کہ اس وقت حضرت گنج شکر کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

مرآۃ الاسرار میں دو وفات شنبہ درج ہے اور ہجرت ۱۰۷۱ھ میں شنبہ۔ لیکن دونوں میں پانچویں محرم کی تاریخ وفات بیان کی گئی ہے۔

خواجہ قطب الاسلام سے رخصت ہو کر آپ تہذیب کی طرف متوجہ ہوئے اور پانچ سال  
 ہال : ہاں تحصیل علم میں مشغول رہے۔ اس کے بعد بغداد کی طرف ارادہ فرمایا۔ یہاں تمام مشائخ وقت  
 سے ملاقات فرمائی خصوصاً شیخ شہاب الدین عمر ہروردی قدس سرہ العزیز کی ملازمت بھی حاصل کی چنانچہ  
 خود فرماتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین ہروردی ارادہ کا گودیدہ است و سعادت قدوسی حاصل کر دتہ  
 حضرت گنج شکر فرماتے ہیں کہ بغداد میں شیخ اہل شیرازی سے بھی ملا تھا۔ بہت بزرگ و با عظمت پیر  
 تھے۔ جب ہاتھ جوڑنے کے لیے بڑھا تو آنکھوں میں آنسو بھرنے لگا اور فرمایا: بھائی! اے شکر عالم نیک  
 آدمی! چند روز ان کی خدمت میں بھی رہا۔ کسی کو نہیں دیکھا کہ ان کی خانقاہ سے محروم کیا ہو۔ مجھے  
 بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے رزق میں برکت عطا فرمائے۔ بغداد سے نکل کر جب سیدانوں میں چوچا  
 تو ایک درویش کو دیکھا زار و نزار۔ جسم پر سرت استخوان و پوست باقی رہ گیا ہے۔ میرے دل  
 میں یہ خطرہ گذرا کہ اس جنگل میں یہ صاحب کب سے ہیں اور کیا لکھاتے پتے ہیں؟ اس خطرہ پر  
 مطلع ہو کر انھوں نے فرمایا کہ اسے فرزند چالیس سال سے اس غار میں مقیم ہیں اور سوا اسے خس و  
 فاشاک اور میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ چند روز ان کی خدمت میں رہا۔ پھر وہاں سے بخارا کی طرف  
 روانہ ہوا جہاں شیخ سیف الدین باختری رحمۃ اللہ علیہ سے قدوسی حاصل کی۔ بڑے با عظمت  
 بزرگ تھے۔ ان کی خدمت میں رہا ہوں۔ جب میری طرف نظر فرماتے یہ کہتے کہ یہ لڑکا مشائخ روزگار  
 میں سے ہوگا۔ اور تمام عالم اس کے مریدوں اور فرزندوں سے بھر جائے گا۔ ایک سیاہ و گلیم  
 آپ کے دوش مبارک پر تھی اتار کر مجھے دے دی اور فرمایا: اپنی بی بی سے چند روز کے  
 یہاں سے بھی رخصت ہوا۔ ایک مسجد میں چوچا۔ وہاں سے نزدیک ایک صومعہ تھا وہاں ایک  
 باہیت درویش کو دیکھا کہ غلام تفکر میں کھڑا ہوا ہے اور آنکھیں آسمان کی طرف ہیں۔ چار  
 روز بیہوش عالم صحو میں آئے اُس وقت میں نے سلام کیا۔ جواب سلام عطا فرمایا اور کہا کہ میری  
 وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی، بیٹھو۔ انھوں نے اپنا حال بیان فرمایا کہ میں حضرت شمس العارفینؒ  
 کے پوتوں میں سے ہوں اور تیس سال سے یہاں مشغول ہوں۔ سوا اس ہیت و حیرت کے اور کچھ  
 نصیب نہیں ہوا۔ پھر فرمایا کہ ایں راہ راستی است ہر کہ دریں راہ راستی قدم نہ زندہ دست  
 نہ رسد۔ بعد ازاں اپنے احوال و مقامات بیان فرمائے اور کہا خوشن سے بگناہ ہو جاؤ تاکہ

اُس کے ٹیکہ نہ بنو۔۔۔ ات بھر خدمت میں رہا صبح کو خفصت ہوا۔  
آپ فرماتے ہیں کہ بدخشاں میں بھی بہت سے بزرگوں سے کیا حاصل ہوا جو ایسے تھے کہ انکی  
تعریف نہیں بیان کر سکتا۔

اس تمام دورہ و سفر کے بعد آپ قتان کی جانب واپس ہوئے۔ اور شیخ بہاء الدین  
زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات فرمائی۔ وہاں سے مراجعت کر کے دہلی تشریف لائے اور خواجہ  
قطب الاسلام بقیہ راوشی قدس سرہ الغریز کی خدمت میں رہنے لگے۔ خود فرماتے ہیں کہ  
”نہتہ کہ در سے دیدم آن نعمت در حد و صفت در بیان نیاید پس خود را دو پاپا، ایشان بستم  
و بشارت بیت مشرف شدم۔ سوم روز تر نعمت بن رواں کرد و این سخن ہم فرمود کہ  
مولانا فرید کار خود تمام کرد و بودی انگاہ بن آدمی۔“

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت گنج شکرؒ نے جب یہ بیان ختم کیا تو فرمایا مارا اورین شبانہ  
روز عالم استغراق میں بے خود رہے۔ اسکے بعد جب ہوش میں آئے تو فرمایا مردان خدا نے یہ  
کیا ہے جب کسی مقام پر پہنچے ہیں۔ اُس راہ میں جب تک کوئی سہ قہ دل سے سفر نہ کرے گا  
ہرگز ہرگز کسی مقام پر نہ پہنچے گا۔ پھر یہ آیات زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمائے جامی  
توراہ نہ رفیع و ترا نہ نمودند      ورنہ کہ زواہیں در کہ بد و نکشوند  
جاں ز درہ دوست ازا اگر میخواستی      تو نیز جہاں شوی کہ ایشان بودند

لہذا اس امکان میں حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ جب میں خواجہ قطب راہیام کے شرف  
ارادت سے بہرہ مند ہوا تو چار کلاہ ترکی میرے سر پر رکھی اور بہت شفقت فرمائی اور ارشاد  
فرمایا کہ شیخ میں اتنی ذاتی قوت اور تصبیح خاطر ہونی چاہیے کہ اگر کوئی اُس کے پاس مُردہ ہوئے  
کو آئے تو باطنی نظر کی قوت سے اُس کے سینہ کے نگار کو جو آلودگی دنیا کی وجہ سے جم گیا ہے  
کودے تاکہ کوئی کہ ورت اور آلائش باقی نہ رہے۔ اسکے بعد ہاتھ پکڑ کر نہ ایک چو پٹا دے۔  
شرف بیت کے بعد حضرت گنج شکرؒ غزنی دروازہ کے متصل جو برٹا ہے اسکے نیچے ایک حجرہ  
بنا کر مشغول رہتے ہوئے۔ وہاں سے ہر دو ہفتے کے بعد خواجہ قطب الاسلامؒ کی خدمت میں حاضر  
ہوتے۔ خواجہ صاحب نے آپ سے کہنے کے روزے مکھواٹے اور فرمایا کہ تین روز کے بعد جو



میب سے ہم پہنچ جائے اُس سے افطار کرو۔ تیسرے روز ایک شخص کے یہاں سے کھانا آیا جو شراہی تھا۔ آپ کے مدد سے قبول نہیں کیا۔ خواجہ صاحب کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ دو تین روز اور سٹے کرو۔ چھٹے روز اس قدر ضعف ہوا اور ایک گھڑی بات گزرنے کے بعد بھوک کی اس قدر حرارت معلوم ہوئی کہ چند سنگریزے زمین پر پڑے ہوئے تھے حالت انتظار میں ان پر ہاتھ ڈالا۔ جس وقت وہ ان مبارک میں پہنچے شکر ہو گئے۔ آپ نے فوراً تھپک دیا کہ کہیں گرنے ہو۔ کئی بار اسکی نوبت آئی اور سنگریزے شکر ہو گئے۔ یکا یک حضرت خواجہ صاحب سلام فرمایا ارشاد دیا دپڑا کہ جو کچھ غیب سے لے افطار کرو۔ اس خیال کے آتے ہی آپ نے خواجہ صاحب الہی خیال کر کے چند سنگریزے منہ میں ڈال لیے جو شکر ہو گئے۔ خواجہ سنائی نے اسی شیئوں کو نظم فرمایا ہے

سنگ در دست تو کھسکر دو      زہر در گام تو شکر کرو

صبح ہوتے ہی خواجہ قطب الاسلام سے اس واقعہ کو عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا کیا کہ جس سے افطار کیا۔ غیب سے جو شے پہنچی وہ اچھی ہی ہے۔ انشاء اللہ شکر کے مانند تم شیریں رہو گے۔ اسکے بعد جو آپ کو دیکھتا تھا گنج شکر کے نام سے خطاب کرتا تھا۔ لیکن سفینۃ الاولیاء میں گنج شکر کی یہ تسمیہ دوسری ہی لکھی ہے۔ صاحب سفینۃ الاولیاء لکھتے ہیں کہ سات روز گز گئے کہ آپ نے افطار نہیں کیا تھا۔ ضعف غالب تھا۔ اسی حالت میں اپنے پیرومرشد کی خدمت میں روانہ ہوئے اثنائے راہ میں ضعف سے پیر لڑکھڑایا اور آپ زمین پر گر پڑے۔ وہاں مبارک میں کچھ مٹی پٹی ہو گئی جو تمام شکر ہو گئی۔ وہاں سے اٹھ کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت شیخ نے فرمایا فرید گئے کہ بہشت رسیدہ شکر شدہ حق تعالیٰ وجود ترا گنج شکر گردانیدہ است ہوا رد شیریں خواہی بود۔

پیر کی خدمت سے جب باہر آئے دیکھا کہ جو شخص دیکھتا ہے گنج شکر کے لقب سے آپ کو یاد کرتا ہے۔ سیر العارفین لکھتے ہیں کہ روزے سے بندہ خواجہ ہی آبدار ضعف و یا صحت پائش بلغزید بہ زمین اُنا د پامہ گل بہ وہن رسید شکر شد ازاں وقت گنج شکر گویند۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی بخارا و خیابریں ایک دوسری حکایت لکھتے ہیں کہ ایک سوداگر جو چند گاؤں شکر بار کے کہیں جا رہا تھا۔ حضرت شیخ

فرید الدین گنج شکر نے اُس سے تھوڑی شکرانی اُس نے جواب دیا کہ یہ تمہارے بیٹے نے فرمایا کہ تمہارے بیٹے ہوگا۔ چنانچہ سوداگر نے جب بوجہ کھولے تو تمام نمک نظر آیا۔ شرمندہ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نہایت عاجزی کی۔ آپ نے فرمایا اچھا شکر ہوگی۔ اس کے بعد جو دیکھا تو تمام شکر تقی۔ ایک عزیز نے اس مضمون میں چند شعر خوب کہے ہیں۔

کاش نمک جہاں شکر شیخ بھر دے      لا شکر نمک کند وز نمک شکر  
اس کے بعد حضرت خواجہ قطب الاسلام قدس سرہ العزیز نے چارہ سلکوں کے لیے آپ کو حکم فرمایا کہ ایسے مقام پر جاؤ جہاں مسجد ہو اور اُس مسجد میں ایک کنواں ہو اور اُس کنوئیں کے منہ پر ایک درخت ہو اور اُس مسجد میں ایک ایسا مؤذن ہو جو متدین لایق اور درویشوں کی صحبت کے قابل ہو۔ وہاں چالیس شب اپنے پاؤں کو سینے سے ملا کر سرنگوں کوئیں میں ٹکوا اور یاد الہی میں مصروف رہو۔ حضرت گنج شکر نے کوشش فرمائی تو ایسا مقام خطا اُچھ میں ملا جہاں اسی طرح کی ایک مسجد۔ کنواں اور درخت تھا اور خواجہ رشید الدین ینالی مؤذن تھے۔ آپ نے اس ارادہ کا اُن سے ذکر کیا اور اخلاص سے راز کی تاکید کی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر آپ وہاں جاتے اور رات بھر اسی حالت میں ٹکے رہتے۔ صبح کو خواجہ رشید الدین آتے اور آپ کو کنوئیں سے باہر نکالتے۔ آپ نماز فجر ادا کر کے اُسی مسجد میں مراقب رہتے۔ اسی طرح چالیس راتیں گزر گئیں اور چالیس دن تمام ہوئے۔ خواجہ نظامی :

دار و دوسراں ہشتہ کیے بجز و گرنماز      نہیں سوچے عجز آد و دواں سو ہماز

امیر حسن دہلوی :

ہر دل کہ در و ہر قو آوینتہ شد      آوینتہ شد عاقبت از کنگرہ عشق

اس طرح نماز سلکوں حضرت سرور کائنات علیہ الف الف تحیۃ والسلام سے بھی مروی ہے۔ حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پڑھی ہے۔ سلسلہ چشتیہ میں خواجہ ابو محمد چشتی نے نماز سلکوں بہت ادا فرمائی ہے۔

حضرت سلطان الشائع قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواجہ بزرگ حسین الحنفی مدنی قدس سرہ العزیز دہلی تشریف لائے اور خواجہ قطب الاسلام قدس سرہ العزیز کے مکان پر ٹھہرے۔

حضرت گنج شکر اس وقت وہیں قیام فرماتے - خواجہ بزرگ نے انہیں دیکھ کر مسر مایہ  
 "بابا بختیار! میں جو ان راجہ در مجاہد و خواہی سوخت، چیزے بخشش کن" خواجہ  
 قطب الاسلام نے عرض کی کہ "مرا چہ بجال کہ در نظر آں حضرت عطا ئے تو اہم کرد" آپ نے  
 فرمایا تمہیں سے اس کا تعلق ہے - اسکے بعد خواجہ بزرگ قبلہ رو مجروح میں کھڑے ہو گئے - خواجہ  
 قطب الاسلام نے بھی موافقت فرمائی اور حضرت گنج شکر کو بلایا - خواجہ بزرگ نے انہیں اپنے  
 در خواجہ قطب الاسلام کے درمیان کھڑا کیا - پھر دونوں بزرگوار حضرت گنج شکر کے حق میں جہت  
 دیر تک دعائیں مانگتے رہے اور اتنی نوازش فرمائی کہ بیان سے باہر ہے - اور یہ ارشاد فرمایا کہ  
 "فرید شمعے ست کہ خانوادہ درویشاں روشن خواہد کرد" میر سید محمد کرماتی نے سیرالاولیاء میں خوب کہا ہے

بخشش کو نین ازینین شد در باب تو بادشاہی یافتی زین بادشاہان جہاں  
 مملکت دنیا و دیں گشتہ سلم مر ترا عالم کن گشت اطلاق تو لے شاد جہاں

سفینۃ الاولیاء میں ہے کہ "ایشاں نجد مت حضرت خواجہ حسین الدین چشتی نیز رسیدہ اور دند حضرت  
 خواجہ حسین الدین در باب ایشاں می فرمودند کہ بختیار عظیم شاہ با ز سے رہا بقید آورد و دست کہ جو یہ  
 سدرۃ المنتہی آشاں گیر در دیں شمعیت کہ خانہ درویشاں روشن و منور سازد" آپ اپنے زمانہ کے  
 قطب وقت و غوث زمان ہوئے اور اتنے خوارق عالیہ آپ سے ظاہر ہوئے ہیں کہ اس سلسلہ میں  
 ہر شکل کسی سے ظہور میں آئے ہوں گے -

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ خواجہ قطب الاسلام کے وصال کا وقت جب قریب پہنچا  
 اس وقت حضرت گنج شکر قصبہ ہانسی میں تھے - قاضی حمید الدین ناگوری اور بدر الدین غزنوی کے  
 دلوں میں گدرا کہ خرقہ و سجادہ ہمیں عطا ہوگا - لیکن خواجہ صاحب نے فرمایا کہ میں اپنا خرقہ و  
 عصا اور چوبی غلیں فرید الدین مسعود کو دوں گا، وہی میرے خلیفہ اور جانشین ہوں گے - یہ امانت  
 قاضی حمید الدین کے حوالہ کر کے جاں بحق تسلیم ہوئے - ہانسی میں یہ امر حضرت گنج شکر کو معلوم ہوا  
 آپ دہلی کی طرف روانہ ہوئے اور خواجہ قطب الاسلام کی وفات کے چوتھے روز آپ کے مزار  
 پاک پر پہنچ کر شرف زیارت سے مشرف ہوئے - قاضی صاحب نے وہ تمام نعمتیں آپ کے سپرد  
 کیں - حضرت گنج شکر نے بے نظیر خرقہ پہنا اور جس گھر میں خواجہ قطب الاسلام رہتے تھے اُسی میں



قیام فرمایا۔

خواجہ قطب الاسلام اژدہام غنائی کے خیال سے ایک دربان رکھا کرتے تھے۔ حضرت گنج شکر نے اپنے پیر کی سنت سجدہ کر اس دربان کو برقرار رکھا۔ اتفاقاً ایک دن ایک مجذوب سرہنگا نام جو ہانسی میں حضرت گنج شکر کی خدمت میں بہت آیا جایا کرتا تھا اور بہت قلوب و محبت رکھتا تھا آیا۔ دربان نے روکا اور اندر نہیں جاتے دیا۔ دستور کے موافق حضرت گنج شکر جب جمعہ کے روز باہر تشریف لائے تو سرہنگا مجذوب روتا ہوا پیروں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ ہانسی میں روز آپ کو دیکھتا تھا، یہاں تین روز سے آیا ہوا ہوں اور باہر نہیں ملتا۔ حضرت گنج شکر نے فرمایا کہ میں نہیں رہوں گا۔ حاضرین نے کہا بھی کہ خواجہ قطب الاسلام نے یہ مقام آپ کو عطا کیا ہے مناسب نہیں کہ کہیں اور تشریف لے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو نعمت خواجہ صاحب نے مجھے مرحمت فرمائی ہے وہ کیا شکر کیا بیابان سب جاگے میرے پاس ہے۔ اسکے ہی دہلی سے روانہ ہو کر ہانسی میں تشریف لائے۔ جیسے شیخ جمال الدین ہانسی کو شرف ارادت حاصل ہوا۔ یہ آپ کے محبوب ترین مُرد تھے۔ ہانسی میں بھی جب بہت بھیڑ بھاڑ ہوئی تو وہاں سے بھی روانہ ہوئے اور قصبہ کھنویس جو آپ کے آباؤ اجداد کا وطن تھا قیام اختیار کیا۔ یہ مقام لٹان سے قریب تھا اور دہلی اور ہانسی کی طرح یہاں بھی ہجوم ہونے لگا تو آپ نے لاہور جانے کا ارادہ کیا۔ اس زمانہ میں لاہور چنگیزی مغلوں کی تاخت و تاراج کی وجہ سے بہت خراب اور ویران ہو گیا تھا مگر آخر کار آپ نے اجودھن میں جو اب پاک پٹن کہلاتا ہے قیام فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال اور بعض کہتے ہیں کہ چوبیس سال آپ اجودھن میں رہے۔ یہ آپ کی عمر کا آخری زمانہ تھا۔ صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ اس مقام پر وجود مبارک دسے قبل ہندوستان، خراسان گشت و مار روز قیامت خواہم سے

برزینے کہ نشان کعب پائے تو رسد  
 سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہم بود  
 حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی فرماتے ہیں کہ اجودھن میں آپ نے کئی شادیاں کیں اور بچے ہوئے۔ جامع مسجد کے پاس آپ کا مکان تھا وہیں سب اہل و عیالی رہا کرتے تھے۔ او خود کبھی مسجد میں مشغول رہا کرتے تھے اور کبھی جنگل میں درختوں کے تلے بسر کرتے تھے۔ اور قناعت

پر نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک نوکر ایک دانگ کانک فرض لایا جب  
جب انظار کے وقت آپ کے سامنے کھانا آیا تو آپ نے فرمایا اس میں اسرہفت کی بو آتی ہے۔  
اس کھانے کو میں نہیں کھاؤں گا۔ ایک مرتبہ آپ کے ایک صاحبزادے گرنگی سے ہلاک  
ہو گئے۔ آپ کی بیوی صاحبہ نے عرض کی تو آپ نے فرمایا کہ مسعود بندہ کیا کر سکتا ہے اگر خدا کی  
جی مرضی ہے اور وہ مر گیا ہے تو ایک پیر میں رسی باندھ کر باہر پھینک دو۔ سبحان اللہ۔ یہ کس قدر  
استغراق، افتاء، قناعت، استقامت اور بلند ہیئت تھی۔ یہ زمانہ سب گزر گیا اور فراغت  
کا زمانہ آیا اور آپ کی عظمت و شہرت کی شہرت تمام عالم میں ہوئی اور ہر طرف سے فتوحات  
آنے لگیں اُس وقت بھی یہی حال تھا۔ یہ تمام فتوحات مجاورین و مسافروں کے کام آتی تھیں۔  
حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ صبح سے ایک گھڑی رات تک جو کوئی آتا طرح طرح  
کے کھانے آپ کے باورچی خانہ سے کھاتا۔ اور ہر پانچ رات کو آپ کے پاس سٹھائیاں آتیں  
اور اُنکے انبار لگائے جاتے اور نقد بھی موجود رہتا۔ جو کوئی ماہ نوکی مبارکباد کو آپ کے پاس  
ماہر ہوتا اُس میں سے مزدور کچھ نہ کچھ اُسے عطا ہوتا۔ کسی کو شیرینی اور کسی کو نقد روپیہ۔ کسی کو  
دروں۔ جس کا جو حال ہوتا اُسی کے مناسب اُسے عطا ہوتا۔

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ آپ اکثر سائم رہتے اور شربت سے انظار فرمایا  
کرتے۔ ایک پیالہ میں چند مویز بھگو دیے جاتے اُسی کا شربت بن جاتا۔ نصف یا ثلث حاضرین  
پر تقسیم ہوتا باقی خود نوش فرماتے بلکہ اُس میں سے بھی بچا کر کسی کو مرحمت فرماتے۔ بعد ازاں  
نماز کے پیلے دو گلی چٹری روٹیاں لائی جاتیں۔ ایک حاضرین کو تقسیم فرماتے اور ایک خود  
تناول فرماتے بلکہ اُس میں سے بھی کسی کو دیدیتے۔ اسکے بعد سرخ و ستر خوان بچھایا جاتا اور طرح  
طرح کے کھانے چنے جاتے اور لوگ کھاتے۔ خود بہت کم شاذ ہی کبھی ارادہ فرماتے بلکہ اُسی  
ایک روٹی میں سے کچھ بچا کر دوسرے روز کے انظار کے لیے رکھ دیتے۔ سلطان المشائخ فرماتے  
ہیں کہ آپ اکثر زمیل کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ انظار کے وقت اسی نان زمیل کے دو ایک  
کڑے سامنے لائے جاتے۔ کبھی مکان میں دونوں دفعہ زمیل کی روٹی تقسیم ہوتی لیکن ادب  
کو اکثر دن کے وقت نان زمیل اور رات کے وقت ستر خوان پر کھانا لٹا تھا مصرعہ

### برتنک حوصلہ تائیتہ برائی نسبت

صاحب مراد الہ سرالہ ولایا کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جب سلطان تاملالین بن سلطان شمس الدین التمش آچہ اور تمان کی طرف لشکر کشی کی تو حضرت گنج شکر کی ملاقات کو بھی اجازت آیا۔ ملازمت کے بعد کچھ زر نقد اور چا، گانوں کا فرمان آلف خاں کے ہاتھ خدمت مبارک میں پیش کیا۔ زر نقد تو آپ نے لیکر اسی وقت درویشوں کو تقسیم کر دیا اور فرمان واپس کر دیا کہ یہ گانوں کسی مستحق کو دیئے جائیں مجھے ندرت نہیں۔ آلف خاں کے دل میں یہ خیال آیا کہ سلطان کے کوئی اردکانیں ہے کیا اچھا ہو اگر حضرت کی توجہ سے وہی کی سلطنت اس کے بعد مجھ مل جائے۔ اس خیال پر مطلع ہو کر آپ نے دوبیت زبان فیض ترمان سے ارشاد فرمایا :

فریدون فرخ فرشتہ ز بود ز خود و ز غیر سرشتہ ز بود

ز داد و دہش یا نہ نیکوئی تو داد و دہش کن فریدون توئی

سلطان تاملالین کی وفات کے بعد ہی آلف خاں باو شاہ ہوا اور سلطان غیاث الدین بہمن کے کام سے مشہور ہوا۔

حضرت سلطان ہشام فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ کی محاسن مبارک سے ایک بال اڑ کر نیچے گرا۔ فدوی نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو میں یہ بالوں اور تنوید بنا کر رکھوں۔ فرمایا اچھا۔ جب میں وہی گیا تو یہ تنوید اپنے ساتھ لے آیا جس کسی کو کوئی حاجت ہوتی اور مجھ سے تنوید مانگتا تو میں یہ دے دیتا اور یہ شرط کر لیتا کہ جب کام نکل جائے تو مجھے واپس کر دینا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ کام نکلنے والا نہ ہوتا تو ہر چند تلاش کرتا تنوید نہ ملتا۔ سبحان اللہ جب ایک سو سے مبارک میں یہ عظمت و کرامت تھی تو دیگر خوارق عادات کا کیا ذکر۔

آپ کے چند اقوال سیرالہ ولایا، راحت القلوب، اسرار الادلایا، مرآۃ الاسرار و اخبار الانبیاء سے انتخاب کر کے ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں :-

آپ فرماتے ہیں کہ خدا سے بزرگ و بڑے کے ساتھ معاملہ رکھو۔ سب جیتے ہیں اور وہ دیتا ہے اور جو وہ دیتا ہے اسے کوئی نہیں لے سکتا۔ اپنے سے بھاگنا (یعنی اپنے نفس کے کمرے بچنا) خدا کے لئے ہے۔ ہر شخص کا کھانا مسکافہ۔ لیکن ہر شخص کو کھانا کھلائے۔ مستحقین کو کہنی فراوانی مت کرو۔



قباس پر باتیں نہ کیا کرو اور دل کو شیطان کا کھلونا نہ بناؤ۔ جس قدر تم اپنے ظاہر سے واقفیت رکھتے ہو اُس سے زیادہ باطن سے واقفیت رکھو۔ ظاہری آرایش کے پیچھے مت پڑو۔ پُراسنے ٹھراؤں کی عزت کرو۔ جنگ کی جگہ صلح سے کام لیا کرو۔ اور کسی دشمن سے گود، تم سے خوش نظر آئے بے خوف مت رہو۔ جو تم سے ڈرے اُس سے تم بھی ڈرو۔ اور اپنے زور بازو پر بھروسہ مت کرو۔ شہوت نفسانی کے وقت تمام اوقات سے زیادہ خوشن و داری سے کام لینا چاہیے جب اہل دولت کے پاس بیٹھو تو اپنے دین کو رست بھول جاؤ۔ عزت و حشمت عدالت و انصاف میں سمجھو۔ تو نگری کے وقت ہمت بلند رکھو۔ دینے وقت اپنی ذات کو درمیان سے اٹھا لو۔ اپر نظر نہ پڑے۔ دشمن کو نیک مشورہ سے شکست دو اور دوست کو تو امانع سے غلام بناؤ۔ اپنے عیبوں پر نظر رکھو۔ دشمنوں کی سخت کلامی سے برا نگینہ مت ہو۔ اگر آسودگی چاہتے ہو تو حسد سے بچتے رہو۔ اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہو کہ موت کے بعد زندگی نصیب ہو۔ زندہ دل وہی ہے جس میں محبت اور اشتیاق ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ درویشی پر درویشی کا نام ہے۔ درویش کو لازم ہے کہ ان چار چیزوں سے دور رہے۔ یعنی لوگوں کے عیب نہ دیکھے۔ نہ سُنے کے لائق باتیں نہ سکے۔ نہ کہنے کی باتیں زبان سے نہ کہے اور جہان با آنا سب نہ ہو و اس نہ جائے۔ نیز درویشی قناعت کا نام ہے۔ جو کچھ تجھے ملے اس پر قناعت کر اور یہ نہ کہ کہ ایسا ملتا چاہیے تھا۔ اسراف اُسے کہتے ہیں کہ جو بے بے نیت دے اور اللہ تعالیٰ کے نام پر نہ دے۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو کوئی میرے پاس آئے اور کوئی چیز نہ لائے تو مجھ پر واجب ہے کہ اُسے کچھ دوں۔ درویشی کا کوئی مقام خوف و امید سے خالی نہیں۔ ہر مقام کی مصیبت اُس کی آزمائش کے واسطے ہوتی ہے۔ اگر ذرا بھی چون و چرا کی تو پھر کبھی وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ درویش مصیبتوں میں صابر اور خوش رہتا ہے اور اٹھارہ ہزار عالم کی پروا نہیں کرتا۔ دُنیا بندہ اور مولا کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہے یعنی دنیا سے مراد یہ ہے کہ خدا سے غفلت قنیا کو پہلے عیب سے بڑا حجاب ہے، حب الدنیا میں کل غلیظہ۔ قال اہل العرفۃ من ترک الدنیا ملک و من اخذ بالملک۔ دل مردہ بھی ہوتا ہے اور زندہ بھی۔ پس مردہ دل کو ذکر الہی سے زندہ کرو۔

جب دل دنیاوی لذتوں، شہوتوں، ماکولات اور شروبات میں مشغول ہو جاتا ہے تو غفلت طاری ہو جاتی ہے اور خواہشات نفسانی غالب آ جاتی ہیں اور دل میں ہر طرف سے خطرات آنا شروع ہوتے ہیں جو اُسے سیاد کر دیتے ہیں اور جب دل سیاہ ہو جاتا ہے تو گو یا مردہ ہو جاتا ہے اسے اندیشہ اتنی اور ذکر اتنی سے زندہ کر دو۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو درویش دنیا کے کاموں میں مصروف ہوا اور مال و مرتبہ و ترقی جاد کا طلبگار رہا وہ درویش نہیں بلکہ مرتبہ طریقت ہے۔ اس راہ میں بڑا اصول حضور ہی دل ہے جو بغیر حقہ طلال کھائے اور دنیا سے پرہیز کیے حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک دوست کی شناخت حاصل نہ ہو ہزار سال بھی عبادت کرے تو بھی ذوق حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ طاعت کس کے لیے کر رہا ہے۔ اہل سلوک نے فرمایا ہے کہ جو ہر اہل سنت و جماعت کے طریق پر کاربند نہیں اور اُس کے اقوال و افعال، حرکات و سکنات حدیث و قرآن مجید کے مطابق نہیں اس راہ میں راہزن ہے۔ بارگاہِ اتہی میں مومن کے دل کی بڑی قدر و منزلت ہے لیکن لوگ دل کی اصلاح سے غافل ہیں اسی واسطے گمراہی میں پڑتے ہیں۔ سلوک کا اصل رسول ہی دل ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ فقیر کے لیے دولت مند کی صحبت سے بڑھ کر کوئی چیز مضر نہیں۔ جب فقیر گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے تو اُس کے دینی و دنیوی کام اپنے آپ بنے چلے جاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا شیخ کامل نہ ہو تو اہل سلوک کی کتاب کو پیش نظر رکھے اور اُس کی متابعت کرے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو کوئی زمت یا تکلیف ہو سمجھو کہ اُسے گناہ سے پاک کر رہے ہیں۔ بندہ کو سمجھنا چاہیے کہ سب درد و مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور اپنے نفس کا طبیب خود بنا چاہیے۔

اُسے بسا در و کلاں ترواد و دست اُسے بسا شیر کا پی ترواد و دست  
آپ نے فرمایا کہ آدمی کو درویشوں کے حق میں بیشک لگان رکھنا چاہیے تاکہ اُنکی حمایت نصیب ہو۔ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے کام میں ہوتا ہے اللہ جل شانہ اُس کے کام میں ہوتا ہے۔ جو شخص دوست کی رضا کا طلبگار ہوتا ہے تو دوست بھی اُسکی رضا کا جو بندہ ہوتا ہے۔ طالب کو

ہر حالت میں مطلوب کے عشق و محبت اور اُسکی یاد میں رہنا چاہیے تاکہ متقدمین کے مانند ہو جائے۔  
 طریقت کی راہ رضا تسلیم ہے۔ اگر کوئی گردن پر تلوار مارے تو اُسی پر رانی رہے۔ یہی حالت  
 بودہ درویش ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اگر عابد سے کوئی ور دیا طاعت فوت ہو جائے تو اُسی کو اُسکی موت کہا  
 جاتا ہے۔ صاحبِ ورد کو چاہیے کہ جو وظیفہ ہے اگر دن کو پورا نہ کر سکے تو رات کو پورا کرے۔ ہر حال  
 ترک نہ کرے۔

آپ نے فرمایا کہ اپنے تئیں کسی کے پتہ باندھ لینا اچھلے اور یہ شعر پڑھا جو حضرت شیخ تلمب  
 الدین بختیار کاکی قدس سرہ کی زبان مبارک سے سنا تھا۔

گر نیک تو ام مرا از یشاں گیسرند      و ر بد با شتم مرا بذیشاں بخشتہ  
 بچے فرمایا کہ جب لوگ کھانا کھائیں تو چاہیے کہ طاعت بھی کر دکھائیں کیونکہ طاعت  
 کے لیے کھانا بھی طاعت ہے۔ ہوائے نفس کے لیے کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ سعدی  
 خوردن برے زستین ذکر کردن ست      تو معتد کہ زستین از ہر خوردن ست

آپ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو علم کا درجہ معلوم ہو جائے تو تمام کام چھوڑ کر علم ہی تکمیل کیا  
 کریں۔ علم ایک ایسا بادل ہے جس میں رحمت ہی رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ انیسویں علمائے ظاہر  
 علم سے غافل ہیں کیونکہ آنھوں نے دنیا کو اپنا بت بنا رکھا ہے اور شریعت کو کھیل سمجھ رکھا ہے۔  
 قیامت کے دن ان علماء کے لیے جو دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ انھماک رکھتے ہیں اور علم سے  
 جو مقتود ہے اُس پر عمل نہیں کرتے علم ہو گا کہ انھیں آگ کے طوق پہنا کر دوزخ میں لیجائیں۔  
 پھر فرمایا کہ حق تعالیٰ کی ذات سب سے بزرگ تر ہے۔ پھر لوگ کیوں ایسی نعمت سے محروم رہتے ہیں  
 اور اپنی ساری عمر اُسکے ذکر و فکر میں صرف نہیں کرتے۔ کوئی ذکر کلام الہی سے بڑھ کر نہیں اُسی  
 کو پڑھنا چاہیے۔ اس کا پھل تمام طاعتوں سے بڑھ کر ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ انوار و اسرار کے لیے وسیع حوصلہ چاہیے۔ اسرار و انوار الہی جو عاقل  
 بہ متغلی ہوتے ہیں اگر اُنکے نور کا ذرہ بھر! ہر نظر آ جائے تو تمام جہان منور ہو جائے۔ اس راہ  
 میں صدق کی ضرورت ہے تاکہ دوست کے تمام اسرار سے واقفیت حاصل ہو جائے۔ راہِ خدا



میں ایسے مرد بھی ہیں کہ ایک ساعت میں دوست کے، سرار کے لاکھ دریائی جاتے ہیں۔ اور ذرہ بھر اثر کا ہر نہیں ہوتا۔

آپ فرماتے ہیں کہ فقر اہل عشق ہیں اور علم اہل عقل۔ لیکن واقعہ کار وہی لوگ ہیں جنہیں یہ دونوں چیزیں پائی جائیں۔

در کفے جام شریت در کفے سندان عشق  
ہر ہوسنا کے مذاذہ جام و سندان عشق  
تریت عاشقان اور طاقت نہانی  
پوشیدہ در اندر خود آتا سنجہ خجل نہانی  
جہاں محبت آتی ہے وہاں دوئی اٹھ جاتی ہے۔ محبت کے معاملہ میں لگانا ہوتا چاہیے تاکہ فنا  
وصال محبت کے معاملہ میں باہر حاصل ہو سکے۔

تا نفس من ز عشق دوست زدم  
فاست از ما بے دوئی خبر دوست  
عشق کی آگ ایسی ہوتی ہے کہ درویش کے دل کے سوا کہیں اور قرار نہیں پکڑ سکتی۔ درویشوں کو  
عشق کی خاک اور انوار تجلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ عشق کی یہ بے جانمت کسی فرشتہ کو بھی نہیں ملی  
مرت آدمی کو ملی ہے جیسا کہ خود فرمایا ہے ولقد کرّمنا بنی آدم۔ جس وقت عشق پیدا کیا گیا تو  
اُسے حکم ہوا کہ جا اور اندوہناک آدمیوں کے دل میں قرار پکڑ۔ وہی مقام تیرے رہنے کے  
قابل ہے

گفتم منما گر تو جانا منی  
اکنوں کے نگاہ ہی کنم جان منی  
مرتد گر دم اگر ز من بر گزری  
اے جان جہاں تو کفر و ایمان منی  
اے درویش تجھے قدر ہی نہیں معلوم کہ تیرے دل کے اندر ایسی خوبصورت نعمت مقام کیے ہوئے؟  
آپ فرماتے ہیں کہ متبداً ان لوگوں کو کھنا جاتا ہے جن کا ظاہر و باطن حق سے آراستہ ہو  
اور کسی قسم کی ریا، حسد، بغض اور کھوٹ ظاہر و باطن میں نہ ہو۔ جو طاعت کریں خالصہً لوجہ اللہ  
کریں۔ پھر فرمایا کہ درویشوں نے دنیا ہی میں بحالت زندگی اپنے نہیں مردہ بنا لیا ہے اور تمام  
خواہشات نفسانی سے اپنے تئیں باز رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مومنوں کے دل پاکیزہ زمین کے  
مانند ہیں۔ اگر محبت کا بیج اس میں بویا جائے تو رنگ رنگ کی نعمتیں پیدا ہوں گی۔ پھر فرمایا کہ  
جب تک تو انہی کی طرح کینچلی نہ آئے گا کبھی محبت حق کے دعوے میں صادق نہیں ہو سکتا۔

کامل مال درویش ہے جو کسی اور کی حاجت نہیں رکھتا اور اسرار الی نعمت سے آنے والوں کو اُن کا حصہ دیتا اور اُن کا مدعا پورا کر کے رخصت کرتا ہے۔ مرد خدا وہی تھے جو ذرہ برابر راہ خدا سے باہر نہ ہوئے اور رزق کی خاطر کبھی مشوٹ نہیں ہوئے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ توبہ کی چھ قسمیں ہیں۔ دل و زبان سے توبہ کرنا۔ آنکھ۔ کان۔ ہاتھ۔ پاؤں اور نفس کی توبہ۔ اس کی تشریح یوں بیان فرمائی کہ جب تک دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار نہ ہو توبہ درست نہیں ہو سکتی۔ ایسی چیزوں کے دیکھنے سننے سے توبہ کرنا جو دیکھنے اور سننے کے قابل نہیں ہیں ایسی چیزوں کے چھوٹے اور مدد کرنے سے۔ ہاتھ سے مواد اور پاؤں سے قطع کرنا۔ توبہ کرنا جو اس قابل نہیں کہ انکی مدد یا اُن کا قصہ ہاتھ پاؤں سے کیا جائے۔ اور نفس کو تمام ذہنیات ماکولات و شہوات سے باز رکھا جائے۔ اور ان سب سے توبہ کی جائے اور نفس کی خواہش کے مطابق کام نہ کیا جائے۔

توبہ کی سبالت زمانہ اور تین قسمیں بیان فرمائیں۔ حال، ماضی و استقبال۔ حال۔۔۔۔۔ یعنی کیے ہوئے گناہ سے ندامت حاصل ہو۔ ماضی یہ کہ تلافی گناہوں کے مثلاً دشمن کو رخصت کرنا کسی سے اگر کوئی شے لے لی ہے تو اُسے واپس کرنا یا اُس کا معاوضہ کرنا۔ اور استقبال یہ کہ آئندہ گناہ سے بچنے کا معصم ارادہ کرنا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اسے درویش جس نے سعادت حاصل کی ہے بزرگوں کی خدمت سے حاصل کی ہے۔ جو کچھ انسان کرے اُسے یہی سمجھنا چاہیے کہ سب خدا کی مرضی سے ظہور میں آیا رہا ہے اور خود وہ در بیان میں نہیں ہے۔

تلاوت قرآن کی آپ بہت تاکید فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ سے کلام کرنا چاہے وہ کلام الہی پڑھا کرے۔ نیکیخت بندہ وہ ہے جو اپنے دوست اور مولا سے ہمکلام ہو۔ اس ہمکلامی کی سعادت تلاوت قرآن مجید سے حاصل ہوتی ہے۔ عاشق و مستحق میں لغت باہم گفتگو سے بڑھتی ہے۔ پس راہ سلوک میں تلاوت قرآن سے بڑھ کر کوئی شے نہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں غلوت میں آیا وہاں میں مشتعل تھا۔ جب سورہ اخلاص پڑھنا چاہا تو مجھ پر عالم تجلی سے اسرارہ انوار نازل ہونا شروع ہوئے۔ ان انوار نے عشق و محبت کے سحر میں

جھے جا پھینکا۔ جب وہاں سے نکلا تو اللہ جل شانہ کے عشق و محبت کے دریا میں غرق ہوا سات دن رات میری یہی حالت رہی پھر عالم صحو میں آیا۔

آپ فرماتے ہیں اے درویش خرقہ پہن لینا تو آسان ہے مگر اُس کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے اگر صرف خرقہ پہن لینے سے نجات ہوتی تو تمام لوگ خرقہ پہن لیتے اور نجات حاصل کر لیتے۔

در کوہ و دشت ہر پہی صوفی نے بُرے گریہ و سوز مند بُرے صوفی پیدا کیا خرقہ خرقہ پوش کی وجہ سے قابل اعتبار ہوتا ہے۔ اس کا بطور خود کوئی اعتبار نہیں جب درویش صوفی پہن لے تو اُس پر واجب ہے کہ گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرے اور دو ہمت مندوں سے ملتا جلتا چھوڑ دے۔

پھر فرمایا کلام مجید میں ہے اَلْمُيَانُ لِلَّذِينَ آمَنُوا اِنَّ تَخْشَعُ قُلُوبُهُمْ لِعِنِ اللّٰهُ جَلَّ شَانُہُ فَرَمَا ہے کہ اے میرے بندو کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ میرے خوف سے تمہارے دل نرم ہوں یا کوئی تم میں سے ایسا ہے جو ہم سے صلح کرے یعنی توبہ کرے اور ہم اُسکی توبہ قبول کریں۔ پھر فرمایا کہ خائف اُس شخص کو کہتے ہیں جس میں تیرے باتیں پائی جائیں۔ اول روزہ کی خاطر کم کھانا۔ دوم نماز کی خاطر کم بولنا۔ سوم ذکر کی خاطر کم سوتا۔ اور جس طرح یہ باتیں درویش کے لیے ضروری ہیں اسی طرح خوف۔ اُمید۔ اور محبت بھی ضروری ہیں

آپ نے فرمایا کہ قلند وہ شخص ہے جو سب کاموں میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرے اور کسی سے کسی طرح کی اُمید نہ رکھے۔ پھر فرمایا اہل توکل پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اگر اس وقت انہیں آگ میں پھینک دیا جائے یا زخمی کیا جائے تو انہیں مطلق ثبوت ہوگی۔ نیز فرمایا کہ جو شخص۔ اہل توکل میں حق تعالیٰ کے کرم پر بھروسہ کرتا ہے اُسے عالم غیب سے روزی پہنچتی ہے اور جو کچھ وہ طلب کرتا ہے اُسے مل جاتا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اے درویش لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو دنیا سے نفرت کرتے ہیں اور ہر وقت اُسی کی یاد و طلب میں رہتے ہیں۔ ایسے بہت ہیں۔ بعض اُسے دشمن سمجھتے ہیں اور محبت نہیں کرتے۔ بعض نہ اسے دوست سمجھتے ہیں نہ دشمن۔ یہ تیسری قسم کے لوگ پہلی دو قسموں سے بچے ہیں۔ پھر فرمایا کہ جو شخص میں قدر اللہ تعالیٰ سے قائل ہے اُسی قدر دنیا میں مبتلا ہے۔



پھر فرمایا کہ میں نے خواجہ بختیار اوشی سے سنا ہے کہ دنیا میں تین کام سب کاموں سے افضل ہیں۔ اول دنیا کو پہچانتا اور اُس سے بچتا۔ دوسرے حق تعالیٰ کی طاعت کرنا اور ادب ملحوظ رکھنا۔ تیسرے آخرت کی آرزو رکھنا اور اُس کی طلب میں کوشش کرنا۔ اس راہ میں مرد وہی ہے جو ان تین باتوں پر عمل کرے یعنی (۱) دنیا سے بچا رہے (۲) مرتے سے پہلے گور کے لیے تیاری کرے (۳) حق تعالیٰ کو دیکھنے سے پہلے اُسے خوش کیے۔ پھر فرمایا جو شخص معتد زیادہ موت سے غافل ہو گا اُسی قدر دنیا کا ذکر اُس کے دل میں محکم ہو گا۔ سلوک کے بارے میں لکھا ہے اکثر و اکثر یاد ادم النفس و یاد اللذات۔ جو شخص ہمیشہ موت بویا در کتاب اللہ جل شانہ اُس سے خوش ہوتا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کا اپنے پیر کے حق میں نیاک عقیدہ نہیں وہ مرید نہیں۔ پیر میں اتنی قوت ہوتی چاہیے کہ جب کوئی مرید ہونے کی نیت سے اُسے تو اُس کے حسن عقیدت کو دیکھ۔ اگر اُس فرمان حق میں راسخ پائے تو کھدے واپس چلا جائیگا اور وقت نہیں آیا۔ آپ نے فرمایا کہ مذہب۔ تصوف و سلوک کے مطابق وہ شخص مومن و سادک نہیں ہے جو یاد حق میں نہیں۔ کیونکہ جس دم وہ یادِ الہی سے غافل ہوتا ہے اُسے نہیں سلام اُس وقت کن کن نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے یادِ الہی سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اہل تصوف صرت اُسی دل کو زندہ سمجھتے ہیں جو یادِ حق میں متفرق ہو اور ایک دم بھی یادِ الہی سے غافل نہ ہو۔ جو یادِ الہی سے غافل ہیں وہ مردہ ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ ہمارے خواجگان نے سلوک کے پندرہ مراتب مقرر کیے ہیں جن میں سے پانچواں مرتبہ کشف و کرامت کا ہے۔ اگر سالک اس مرتبہ میں کشف و کرامت ظاہر کر دے تو اچھا نہیں۔ پورے پندرہ مراتب طے کر کے کشف کا اظہار کرنا چاہیے۔

آپ کا ارشاد ہے مرید کو چاہیے کہ پیر کا فرمان دل و جان سے بجالائے۔ فرمایا کہ حب انسان پر رنج و مصیبت نازل ہو تو اُس کے سبب پر غور کرنا چاہیے اور تنبیہ حاصل کرنا چاہیے۔ جو شخص ہر وقت طاعت میں رہتا ہے اُسے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچتی۔ اسے درویش و لوگ مصیبت میں مہر کرنے میں اللہ جل شانہ ان کے گناہوں کو لمبا سیٹ کر دیتا ہے۔ یہ سخاوت ہے

جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ اسے درویش۔ اس راہ میں عاشقوں سے درو و بلا کو اپنی خوراک بنایا ہے۔ جس دن اُن پر بلا نازل نہیں ہوتی وہ باقر کرتے ہیں کہ آج ہمیں دوست سے یاد نہیں آیا اور جب کسی درو و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں تو یاد آوری کے شایانے بجاتے ہیں۔ اسے درویش راہ محبت میں صادق دہی شخص ہے جو بڑی خواہش سے درو و بلا کی تمنا کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اسے درویش ہم مسافر ہیں، بلا کے سر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ بلا دنیا ہے۔ ہماری عمر کی بساط ایک ایک پیرٹ دی جائے گی اور قبر ہمارا مقام و منزل ہوگی۔

جہانِ حیات گزرتی رنگ ۱ و  
 سچے نہ بینی دریں باغ کس  
 دریں چار سو بیچ بیکانہ نیست  
 درو و ہر دستے تو برے می رسد  
 جہاں گر چہ آرا مگاہے خوش است  
 دو درو واد و این باغ آراستہ  
 در آرزو سے باغ بنکر تمام  
 اگر زیر کی باغ کے خوش گیسر  
 دریں دم کہ دادی بخاری پیچ  
 کیے را در آرد ہنگامہ تیز  
 نکاحی سبک باش یا راں شدند  
 راہی بچنگ آرا از چنگ ۱ و  
 تماشا کن ہر یکے ہر نفس  
 کہ کسیر بر مرد خود کا نہ نیست  
 کیے می رود دیگرے نی رسد  
 شتابندہ را نفس در آتش است  
 درو و نہ این ہر دو برخاستہ  
 ز دیگر درے باغ بیرون خرام  
 کہ باشد بجا ماند نفس تا گزیر  
 کہ آئندہ در زیر پیچ دست و پیچ  
 دگر را از ہنگامہ گوید کہ تیز  
 تو ماندی بہ غم غمسا راں شدند

آپ کا ارشاد ہے کہ تغیر جب جامہ پہنے تو یہ سمجھے کہ جامہ نہیں بلکہ کفن پہنا ہے۔

صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ آپ کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں لیکن پوتے پوتیاں اور نو سے نوایاں بہت ہیں۔ آپ کے سب سے بڑے صاحبزادہ کا نام شیخ نصیر الدین قدس سرہ ہے۔ صاحب مرآۃ السراۃ سیر الاولیاء سے نقل کرتے ہیں کہ ”ہو صاف سینہ و اخلاق مرضیہ ہو صوفی ہو۔ روزگار بے باوت باری تعالیٰ وہ کسب زراعت بہت لقمہ حلال گذرانید و عمر عزیز در رضا سے حق تعالیٰ بسر برد و رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ کے دوسرے صاحبزادہ کا نام شیخ





حضرت گنج شکر کے پوتے شیخ علاء الدین بن شیخ بدر الدین شیمان بن گنج شکر قدس سرہ تمام پوتوں اور نواسوں سے زیادہ ممتاز تھے۔ ایک بار کھیلے کھیلے آئے اور اپنے دادا کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔ شیخ عیسیٰ ایک درویش نے ہٹانا چاہا مگر حضرت گنج شکر نے فرمایا: ”بگذازا نشست باشد۔“ ان انقاس متبرکہ کی برکت سے تقریباً دو قرن شیخ علاء الدین اپنے دادا کے سجادہ پر متمکن رہے۔ اور چون سال حق سجادگی ادا کیا۔ سلطانی فیروز شاہ و بادشاہ دہلی آپ کے مریدوں میں تھا۔ شیخ رکن الدین جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے تھے حیب دہلی سے ملتان کی طرف مسافرت فرماتے تو شیخ علاء الدین سے ضرور ملتے اور فرماتے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو ایسی استقامت بخشی جو کہ کوئی شخص اس جگہ سے آپ کو جنبش نہیں جو سے سکتا۔ جب آپ کا وصال ہوا تو حضرت گنج شکر کے جوار میں آپ کو دفن کیا گیا۔ اور سلخان تہذیبیت نے جو آپ کا مرید اور متفقہ تھا ایک بڑا گنبد مزار پر تعمیر کیا۔ تیسرا دیکھا۔

”عبداللہ“

(الناظر، نومبر ۱۹۶۲ء)

## حضرت محبوب الہی محمد نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ

اسے آتشِ فردقت دلا گیا ہے۔

سیلابِ اشتیاق تباہی و خرابی کر رہا ہے۔

اربابِ شاہد کے سردار۔ (صاحبِ بچاؤ کے سالار۔ خواجہ بہار۔ ایک فخر و اساکیت۔ سلطانِ شائع و لہجہ میں۔ قلب و قوتِ جمع اسناد و ارشاد۔ حقہ اللہ علی العباد و بین فرغ و اصول۔) جاتِ معقول و معقول۔ وارثِ انبیاء و مرسلین شیخِ نظام الحق و المشرق و الدین قدس سرہ العزیز۔ آپ کا اسم مبارک محمد بن احمد بن علی البدایونی البخاری ہے۔ صاحبِ نعمات الانس نے آپ کو خالہ لکھا ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت خالہ کون تھے جن کی طرف آپ کی نسبت کی ہے۔ صاحبِ غنیۃ الدار آپ کا نسب یوں لکھتے ہیں: امام ایشاں محمد بن احمد بن دانیال بدایونی مست۔ صاحبِ مرآۃ الاسرار نے بچاؤ دانیال کے علی لکھا ہے۔ دانیال مکن ہے کہ اس کے چل کر اس سلسلہ میں کسی کا نام ہوگا گشتِ دادا کا نام علی صحیح ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب سید بلال الدین مخدوم جاتیوں گشت سے ملتا ہے۔ آپ کے اجداد بخاری تھے لیکن ہندوستان شریف لا کر بدایوں (روہیلکھنڈ) میں سکونت اختیار کی اس لیے بدایونی کہے جاتے ہیں۔

شیخ عبد الرحمن چشتی مرآۃ الاسرار میں آپ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ وہ محبوبِ خدا و سرمدِ اولیاء اہلِ مفاہتے و عشقِ کمال، شوقِ دائر و عیدِ صادق، قویِ حال اور بلند ہمت رکھتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد اس قسم کے صوری و معنوی تصرفات اس ظائفہ میں کسی کو میرہ ہوئے۔ آپ تمام مقامات غوثی و قطبی و فروانیت سے گزر کر مرتبہ محبوبی پر پہنچے۔ آپ کے اقوال و افعال جمیع مشائخ کے لیے محبت کا طبع ہیں اور اس فن میں الٰہی یونہی سب آپ کی پس روی کرتے ہیں اور جب تک عالم ہے کیے جائیں گے۔ اس پادشاہک و سعت آباد ہندوستان کو نورِ ولایت سے ہمپنے منور فرمایا اور ایک عالم کے لیے سببِ ہدایت ہوئے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو سلطانِ الملک کے خطاب سے ممتاز فرمایا اور کراست کا تاج آپ کے اور آپ کے پیروؤں کے سر پر رکھا۔ آپ کے تصرفات انہیں انہیں میں اور کوئی ان سے انکار نہیں کر سکتا۔

میر سید محمد کرمانی قدس سرہ نے آپ کے مفصل حالات کتاب سیرالاولیاء میں لکھے ہیں۔ وہ کاتب حروف کی نظر سے نہیں گزری۔ دوسری کتابوں میں اس کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ ادھر چھپ کر مرآۃ الاسرار۔ اخبار الاخبار۔ فتح الاسرار۔ مرآۃ النبیانی۔ راحت القلوب۔ فوائد العواد۔ فضل العواد اور غنیۃ الاولیاء میں نظر سے گذرا ان سے یہ مختصر کلمہ سہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

دل خواست کہ در عبارت آرد و صفت رخ او بہ استعارت

شیخ رخ او ز بانہ زو ہم عقل بسوخت ہم دیارت

آپ کے ارپہ آدھے بچا رہے تشریف لا کر لاہور میں سکونت اختیار فرمائی۔ وہاں سے آپ کے دادا خواجہ علی اور تانا ذاجہ عرب مع اہل و عیال بدایوں تشریف فرما کر سکونت پذیر ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں میں باہم قرابت واقع ہوئی۔ خواجہ عرب کی ایک صاحبزادی بی بی زیبا تھیں وہ خواجہ امجد بن علی کے نکاح میں آئیں۔ خواجہ امجد زیور دیات و صلاح سے بدرجہ کمال آراستہ تھے۔ ایسے سلفی و عہد نے بدایوں کی تفتاح آپ کے تنولین فرمائی۔ آپ کا مزار پاک بدایوں میں اس وقت تک زیارت خاص و عام ہے۔ صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ انہاں دو صدف پاک دیر بمان کرامت و سرمایہ عشق و محبت سلطان المشائخ را بہ وجود آرد۔

آپ کی ولادت مبارک ۲۷۔ صفر ۱۰۷۵ھ ۱۶۶۴ء چھ سو پچیس ہجری کو بگرام بدایوں واقع

ہوئی۔ ابھی آپ صغیر سن ہی تھے کہ آپ کا ساہرے اٹھ گیا

آفریں از خداے برادرے کہ اذواذ ایں پیش پیرے

غرض کہ اس درختیہ نے اپنی ماں کے گود میں پرورش پائی شروشا کی۔ جب کسی قدر بڑے ہوئے تو کتب میں بٹھایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے قرآن پاک ختم کر لیا اور کتب سداوہ شروع کیں بارہ سال کی عمر میں علم لغت پڑھتے تھے۔ مولانا شمس الملک جو اس زمانہ میں کیا سے روز کا سمجھے جاتے تھے ان سے مقامات خزیری پڑھی اور سند حاصل کی۔ حدیث میں شارق لاؤ اور غلط ذوالی اندھین وقت سے گئے بھت لے گئے۔ علم تفسیر ہیئت، ہندسہ، فقہ اور اصول بھی اپنے زمانہ کے شاہیر سے حاصل کیا۔ سیرالاولیاء میں ہے کہ آپ علما اور فضلا وقت کی صحبت میں ہمیشہ رہتے تھے۔ اور نظام الدین سجاد کلمے جانتے تھے۔ لیکن باوجود اسکے آپ کا دل حق منزل ہمیشہ علوم باطن کی تحصیل کی طرف متوجہ رہتا تھا اور چاہتے تھے کہ اس صحبت سے نکل کر نور حقیقی کا نظارہ کریں۔

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں ابھی چھوٹا ہی تھا۔ کم بیش اذان بارہ سال کی عمر ہوئی کہ علم سنت پڑھتا تھا ابو بکر فراط، جنہیں ابو بکر قوال بھی کہتے ہیں، لکھتے میرے استاد



کی خدمت میں آئے اور چلے تیغ بہار الدین ذکر الہ کے کلمات بیان کیے، اگر میرے دل پر کچھ  
 ہے نہیں۔ اس کے بعد حضرت گنجشکرؒ کی بزرگی بیان کی۔ آپ کا نام پاک سنتے ہی میں بے اختیار ہلایا  
 اور آپ کی محبت میرے دل پر ستولی ہو گئی۔ منیٰ کہ ہر نماز کے بعد آپ کے نام کی تسبیح پڑھتا تھا۔ اور  
 دس بار شیخ فرید اور دس بار مولانا فرید نام لیکر سوتا تھا۔ جب سولہ سال کی میری عمر ہوئی تو اپنی والدہ  
 اور پھوپھی بھائی کے ساتھ وہلی کا ارادہ کیا۔ جب شہر میں داخل ہوا تو اتفاقاً شیخ نجیب الدین متوکلؒ  
 جو حضرت گنجشکرؒ کے بھائی تھے اُن کے پڑوس میں مکان لیا اور آپ کی محبت کی وجہ سے روز بروز حضرت  
 گنجشکرؒ کی پاؤسی بکرا اشتیاق بڑھتا جاتا تھا۔ گر تین چار سال اور شہر میں رہنا چاہا اور بڑی کوشش سے  
 تیرے تعلیم حاصل کی اور علم حدیث کی سند لی۔

سیر النارفین میں ہے کہ جب آپ کی تحصیل علوم ختم ہو گئی اور ملانے شہر میں امتیاز حاصل ہوا  
 تو ایک روز شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے پاس تشریف لے گئے اور الناس فاجتہ کر کے عزمین کی کہ دعا فرمائیے  
 میں کسی جگہ کا قاضی ہو جاؤں اور خلق کو نفع پہنچاؤں۔ شیخ نے فرمایا خدا نہ کرے تم قاضی ہو لگے تم  
 وہ ہو جاؤ جو ہم جانتے ہیں۔ اس کے چند روز کے بعد حضرت گنجشکرؒ کی پاؤسی کا شوق غالب ہوئے لگا۔  
 منقول ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ کا جب اخیر وقت قریب آیا تو آپ رونے لگے اور فرمایا  
 لگے کہ مجھے آپ کس کے سپرد کیے جاتی ہیں۔ آپ خاموش رہیں۔ دوسرے۔ ذعلی الصبارح آپ کو  
 بلایا اور ہاتھ پکڑ کر کہا اے اللہ میں تیرے سپرد کرتی ہوں۔ ومن یزل علی اللہ فہ حشر ان  
 اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ کل شیء قدرا۔

صاحب نفعات الامن فرماتے ہیں کہ آپ تحصیل تکمیل علوم دینی سے فارغ ہوئے کے بعد  
 ایک شب جامع مسجد وہلی میں مقیم تھے کہ نماز صبح کے وقت موزن سے منارہ پر چڑھ کر یہ آیت پڑھی  
 اَلَمْ یَاۤیْنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوْا اَنْ یَّخۡشَیَ قُلُوۡبُہُمۡ بِاَکۡرَامِہٖؕ یَاۤیۡہَۤ اَیُّہَاۤیُّکُمۡ کَرۡہَیۡہٗ اَیُّہَاۤیُّکُمۡ کَرۡہَیۡہٗؕ  
 ہوئی تو بے زاد و راحہ حضرت شیخ فرید الدین گنجشکرؒ کی ملازمت کی نیت سے چل کھڑے ہوئے۔ اس  
 وقت آپ کا سن مبارک تقریباً بیس سال کا تھا جن میں جوش و خروش و عروج شباب کا نام تھا کہ تمام  
 مرادات سے ہاتھ اٹھا کر اس راہ میں قدم ڈالا

راحت القلوب میں خود فرماتے ہیں کہ چار شنبہ کا روز جب کی دسویں شب ۵۵۰ھ پہنچیں چری  
 تھا کہ دنا گئے مسلمانان سلطان الطریقہ فی الامن کا ایک غلام نظام احمد بدوون جو اس مجاہد کا  
 کہنے والا ہے سید الداد بن حضرت شیخ فرید الدین گنجشکرؒ مسودہ جو دھنی قدس سرہ العزیز نے شرف قدس  
 سے بہرہ مند ہوا۔ اُسی وقت آپ نے کلاہ چار ترک کی جو سر مبارک پر تھی دعا گو کے سر پر رکھ دی ۱۱

فرقہ خاص و عقلمیں چاہیں نہ فرمائیں۔ الحمد للہ علی ذلک۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میں چاہتا تھا کہ  
نصرت سجاوہ اور ولایت ہندوستان کسی دوسرے کو دیں، لیکن تو راہ میں تھا۔ اس وقت میرے  
سر میں (ہذا نصرت) تھا کہ ٹھہرو نظامِ ہندوئی آتا ہے یہ ولایت اُسے دینا، مگر کوئی چاہا  
کہ پاپوسی کا اشتیاق جو حد سے زیادہ تھا کچھ اُسکا حال عرض کرے مگر ہشت سنو کی سقد خال  
ہوئی کہ کچھ عرض نہ کر سکا۔ یہ دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ تمہارا اشتیاق جتنا کہہ سکتے ہو اُس سے زیادہ  
ہے اور دعا گو کہ مناسب حال یہ بیت زبان مبارک سے فرمائی

اے آتشِ فراق و ابا کباب کردہ سلاطینِ اشتیاق جاننا خرب کردہ  
حضرت سلطان المشائخ اس رشتہ اپنے پیرِ شیعہ کی خدمت میں ہوا۔ رجبِ شمسہ حیرن سے  
۳۔ ربیع الاول شمسہ عری بمک یعنی سات مہینے اور ستواٹھارہ دن رہے۔ اس کل سات پر حضرت  
گنجشکر نے جو چند رشتائیں فرمائیں وہ سب راحتِ القلوب میں موجود ہیں جو حضرت بابا صاحب کے  
کے لغو کلمات ہیں اور حضرت سلطان المشائخ نے خود مرتب فرمائے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں تہاتھے خود فرماتے ہیں کہ دعا گو شمسہ  
مکس می راند گنجشکر بدارشند فرمود یا راں کجا اند گنتم قبولہ کردہ اند فرمود بیاتنا ترا چہے گویم۔ آواز  
کرد چو در دہلی بروے در مجاہدہ باشی بکار بودن اسح نیست روزہ را شتن نیے ما بہرست و اہمال  
و اگر چوں نماز و حج نیے را وہ ایک مرتبہ کا اور ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ نے فرمایا کہ "من از  
حق تعالیٰ خواستہ ام ہر چہ از حق بخواہی بیابی" ایک وقت کا حال بیان کرتے ہیں کہ حضرت  
گنجشکر سر رہنے۔ بشرہ مبارک تغیرِ جبرہ خاص میں یہ اشارہ پڑھ رہے تھے

خواہم کہ ہمیشہ در قاسے تو زیم قاس کے شوم و زیر پا سے تو زیم  
مقصود من بندہ ز کو نین توئی از ہر تویریم و از ہر اسے تو زیم

یہ ابیات پڑھتے اور سر مبارک سجدہ میں لیجاتے۔ میں نے یہ دیکھ کر سر قدسوں پر دکھایا۔ آپ نے  
کماں مہربانی سے فرمایا "ما گو کیا مانگتے ہو؟" میں نے استعانتِ طلب کی۔ شیخ نے عطا فرمائی۔  
ایک مرتبہ کا اور ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ نے میرے دہن میں اپنا سب مبارک دیکر حفظ  
کی وصیت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ نظام۔ اللہ نے دین و دنیا دونوں دے دیے ہیں جہاں سب  
موجود ہے۔ جاؤ ہندوستان کا ملک لو۔ اور خلافت دے کر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تجھے علمِ عقل و  
مشق عطا فرمایا ہے جس کسی میں تین مہینے ہوں وہی شایانِ خلافت ہے۔

نہ فکدہ دہریہ بیخ و بن لایاں شمسہ کو آپ کو نصرت نہایت وسیلہ حاصل ہوئی بکمال

راحت القلوب میں آپ خود اس طرح لکھتے ہیں "دوسری ریح الاول ششہ کو دوسرے قہر میں حاصل ہوئی۔ اس بندہ کو خلعت خاص مرحمت فرمایا، دوسرے اور عزیز اہل صفا بھی حاضر تھے زبان مبارک سے فرمایا نظام الدین کو ہم نے ہندوستان کی ولایت دی اور صاحب سجادہ کیا۔ آپ کے ارشاد پر میں نے دوبارہ سر جھکا یا اور نہیں۔ کی۔ حکم ہوا اسے جہانگیر عارف سرا تھا۔ آپ کے فرق مبارک پر حضرت شیخ قطب الدین کی دستار بستی وہ عمل فرمائی۔ عہدہ دیا۔ خرقہ اپنے ہاتھ سے پہنایا۔ پھر فرمایا کہ دو گنا ادا کر۔ جب میں رُود قبلہ ہوا تو ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا سمجھے خدا کو سونپنا۔

اسکے دوسرے روز آپ کو رخصت کیا اور فرمایا کہ پہلے ہنسہ جانا اور مثال غلام فست شیخ جمال الدین کو دکھلانا۔ اسکے بعد دہلی جانا وہاں قاضی منتخب کو بھی دکھلانا۔ چنانچہ آپ کی خدمت سے روانہ ہو کر میں پہلے اپنے چوچا رشیخ جمال الدین انسوی کو فلانت نامہ دکھلایا۔ آپ نے بہت ہنساشت و ملاطفت کا اظہار فرمایا اور یہ اشارہ پڑھے

خداے جہاں را ہزاراں پاس کہ گوہر سپارو بہ گوہر شاس۔  
اسکے بعد تقریباً ۱۲ سال حضرت گنجشکر اور اقبہ حیات رہے لیکن خود حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی سے جا کر تین مرتبہ عالم حیات میں قہر ہوس ہوا ہوں اور سات مرتبہ بعد وفات مزار مبارک کی زیارت کی ہے۔

حضرت سلطان المشائخ تربیت حاصل کرنے کے بعد سلوک و ریاضت میں مشغول ہوئے مگر ابھی علم کا شوق بانی تھا اس لیے ایک دن حضرت شیخ علیہ الرحمہ سے التماس کیا کہ اگر حکم ہو تو ترک تعلیم کر دوں۔ آپ نے فرمایا میں کسی کو تعلیم سے منع نہیں کرتا دو دن کام کیے جاؤ۔ ان میں سے جو غالب ہوگا وہ روز جائے گا۔ اسکے چند روز بعد شغل باطن میں آپ کو دستور استغراق ہونے لگا کہ تعلیم و تعلیم کا سلسلہ خود جاتا رہا۔

جائے کہ سلطان خیمہ زو غوغا زمانہ عام را

سیرالایا میں ہے کہ جب آپ حضرت شیخ کی خدمت سے واپس ہو کر دہلی پہنچے تو چند روز کے بعد ہی اس قدر ملائحت کا جہوم ہوا کہ تنگ آگئے خیال ہوا کہ کسی گوشہ محراب میں جا رہیں لیکن بازار دہلی اور اشارہ فیسی سے موئن نیاں پڑیں جو دریا سے بہتا ہے کنارے ہے چند جھوپڑیاں ڈال کر قیام فرمایا اور وہیں ساری عمر گزار دی۔ ثواب عباد الملک کے رکیل نذیر الدین نے آپ کے لیے ایک بڑی خانقاہ تیار کی اور آپ کے متعلقین کے لیے ایک حویلی تعمیر کرائی۔ لیکن اس سے پہلے



آپ پر سخت فتنہ و فساد کا زمانہ گذر رہا ہے۔ چنانچہ خود ایک مرتبہ کا خیال بیان فرماتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں ایک نئے خور و زور سے اوپنیشن کو لیتے تھے۔ ساری ہی نسل گذر گئی اور میں نے ایک پھل جی نہیں پکایا۔ اتفاقاً ایک روز ایک آدمی کوئی خور و زور سے، درویشیاں میرے پاس لایا۔ مجھے میں نے فتنہ و فساد، فحش و کثرت کیا۔ لیکن پھر ایک زمانہ، سیاتہ کائنات کے دروازے کھل گئے اور کائنات تیز رفتاری سے بدست بہار کی میں آئے۔ لیکن جو کچھ آپ شام تک صبر کرتے فرمادیتے اور جو لوگ کوئی چیز مانے اس سے بہتر انہیں خود عطا فرماتے۔

مسلک معراجین، قیادار جب زمانہ آیا تو اس نے بھی، اتفاق سے نیا پورا کپڑا اور اس کے قریب سکونت اختیار کی اس وجہ سے امیر امراء اور غلامان کا ہجوم اور بڑھ گیا۔ چونکہ اس سے آپ کو سخت نفرت تھی اس لیے ارادہ کیا کہ کہیں چلے یا چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اندیشہ میں تھا کہ ایک حسین جوان زبانا تھا اسی روز میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ آج روز کو کہہ شد ہی نہ می دوستی کا اگشت نامے مائے خواہی شد

امروز کہ زلفت دل تلے بر بود در گوشت شستنت نمی دارد سود  
پھر کہنا کہ پتہ نہ شور ہی نہ ہوتا چاہیے لیکن اگر مشہور ہو گئے تو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ قیادت کے روز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمندگی نہ ہو۔ یہ بھی فرمایا کہ یہ بھی کوئی حوصلہ ہے کہ خلق اللہ سے تیار کر کے گوشہ گیر ہی اختیار کی جائے۔ قوت و حوصلہ اس کا نام ہے کہ باوجود فساد و فتنہ کے مشغول بخت رہیں۔ انصاف میں گریہ میں نہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ تیسری مرتبہ میں رمضان مبارک شہدۂ (شہدۂ؟) میں آج امن گیا حضرت گنبد کربلا سے وہ آخری ملاقات تھی۔ جب وہاں پہنچے تو تیسری طرف سے آئے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ سبھی نیک بخت کرے، سعدک اللہ فی الدارین در زنگ اللہ ثمانا فدا و عطا مقبولاً اور فرمایا کہ تم ایسے درخت ہو گے جسک سایہ میں ایک خلق آرام پائیں گی۔ حصول استغاثہ کے لیے مجاہد ہوا کرتے تھے۔

وہاں بس آپ کا ایک گھر نہایت پور میں تھا اور ایک کیلا کھڑی میں۔ مہجرات کے دن کیلا کھڑی آتے جبہ کی نماز میں ادا کرتے۔ اس کے بعد غیاث پور جاتے۔ صاب و صابو اسرار کا اور صابو دبا، لکھتے ہیں کہ سلطان اشفاق نے آغاز جوانی میں تیس سال تک صفت تباہ سے کیے میں۔ اس کے بعد بھی انہیں قریب مجاہدوں کا سلسلہ رہا اور باوجودیکہ فتومات کثرت آتی تھیں اور دنیاوی امانتیں بے انتہائی تھیں لیکن ذات پاک ان سب تباہیوں سے محفوظ رہتی۔ بڑا چپ میں گرتی

برس سے سن مبارک گزر چکا تھا لیکن نماز جماعت کے لیے بالاسے بام سے نیچے تشریف لائے اور صوم و دام رکھتے اور افطار کے وقت ایک روٹی یا آدھی روٹی کچھ توکاری یا کسی قدر پانوں کا تبادل فرماتے۔ پھر بڑے دسترخوان پر تشریف لاتے اور سرشمنس کو دست مبارک سے کچھ نہ کچھ مرمت فرماتے۔

افطار کے بعد جب آپ بالاسے بام تشریف لیجاتے تو جو لوگ قدموں پہننا چاہتے یا شہر اطراف سے حاضر ہوتے سبز و عشا کی نماز کے وقت موقع پاتے اور چند ساعت اہل گنیمت بخش و ہدایت کے تشریف جمال و سعادت مجالست سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اس کے بعد طرح طرح کے میوہ جات تر و نشاب لطیف و لذیذ سامنے لائے جاتے، دران لوگوں کو تقسیم ہوتے۔ ہر ایک کی پٹ داری فرماتے اور پیش اوقات ان کا ساتھ دینے کے لیے کچھ آپ بھی تناول فرما لیتے۔ اور خود ہر ایک کا حال پوچھتے۔ اس کے بعد نماز عشا کے لیے نیچے جماعت خانہ میں تشریف لاتے اور بعد فرارح بھی اور تشریف لیجاتے اور ایک عرصہ تک شنول بحق رہتے۔ پھر صبح و ستراحت کے لیے چار پانی پتہ رکھتے تو آپ کے خادم خواجہ اقبال جنہیں پیار میں لالا کہا کرتے تھے تسبیح دست مبارک میں دینے اُس وقت سولے امیر خسرو کے کسی کو سامنے بنائے کی مجال نہ ہوتی۔ حضرت امیر خسرو طرح طرح کی باتیں کرتے اور آپ اُن کی خاطر سے سر مبارک ہلاتے جاتے۔ اور کبھی بھی خود پوچھتے کہ یہ ترک کیا چیزیں ہیں۔ خسرو اس قدر نہمت پا کر خوب گل نشانی کرتے۔ اسی وقت خورد و قرآن دار اور مولادادے جو محل میں ہوتے تہہ بوسی کے لیے حاضر ہوتے۔

تخت خسرو میں ازیں ہوس شہنا کہ وہ دیرکھت پائیت نہد بخواب شود پس جب امیر خسرو اور خورد و قرآن دار باہر آجاتے تو خواجہ اقبال و منو کے لیے آفتاب حاضر کرتے اور فدا ہر پلے جاتے۔ صاحب مرآت انا سرار فرماتے ہیں کہ دران محل پر ہشتا ہرہ جہاں راق کے دیگر نبودے۔ تمام شب چہ راز ہا وچہ نیاز ہا وچہ ذوق ہا احسن دانتے چنانکہ اس صیبت یہ زبان مبارک زانہ سے۔

کے اہل تہ پر توجہ کر کے نفل نمازیں اور صوم دہر شروع کرتے اور شردہلی سے غیاث پور تک صوفیاء اہل صفا کے سوا کوئی دوسرا فرقہ نظر نہ آتا۔ مسلمان ایک دوسرے سے شرم کرتے اور اصحاب دین اور عیش کا ذکر نہ کرتے۔

ذہن من مطلب لبند نامی کارنتم مشدہست برنظای  
صاحب مرآۃ الاسرار کہتے ہیں کہ حضرت سلطان ہشاغ نے اپنی وفات سے تین چار ماہ

تسل دس بڑوں کو مثال اجازت و خزانہ عطا فرمایا۔ اور میر حسین کو مانی کو علم دیا کہ ذہین خلافت پر اپنی ٹہری ثبت کریں۔ اور تمام خلفائے سے حضرت شیخ نصیر الدین محمود اودھی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ تم دہلی کی غمخواری کرو۔ بقول صاحب سیر المعارفین جب آپ کا سن مبارک چار سو سال اور آٹھ ماہ کا ہوا تو بیمار پڑے۔ چند ماہ بیمار رہے۔ مگر سید محمد کرمانی سیر الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ حضرت کی علالت چالیس روز سے زیادہ نہیں رہی۔ اور وہ بھی کل زمانہ تحیر و مشاہدہ ذات سلاق میں گزرا۔ علالت کا آغاز یوں ہوا کہ عہد کے روز آپ پر حالت وجد طاری ہوئی۔ نمازیں پڑھتے اور سجدہ و پر سجدہ فرماتے۔ اسی عالم تحیر میں سُبَّار اُکھا اور رقت طاری ہوئی۔ اور ہر روز چند مرتبہ بے خبری سی پیدا ہونے لگی۔ جب ہوش آتا تو استغفار فرماتے کہ کیا آج مجھے؟ میں نے نماز پڑھ لی ہے؟ لوگ کہتے کہ پڑھ لی ہے۔ آپ فرماتے کہ پھر پڑھوں ایک ایک نماز کروا دیا فرماتے اور یہ معرکہ زبان مبارک پر لاتے۔

میر و علم و میر و علم و میر و علم

حضرت امیر خسرو سوتت ہیں تھے بادشاہ کے لشکر کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اگر وہ ہوتے تو نہ معلوم یہ حالت اُن پر کس قدر شاق گذرتی۔ اسی عالم میں حضرت سلطان لہنا خان نے تمام اقربا و خدمتکار اور مریدوں کو طلب فرمایا اور خواجہ ربانی کو علم دیا کہ جو کچھ نقد و جنس ہو سب تقسیم کرو۔ ایک پیسہ بھی باقی نہ رہے۔ الغرض چالیسویں روز بعد طلوع آفتاب روز چار شنبہ اٹھارویں ماہ ربیع الثانی ۸۰۰ (سات سو پچیس ہجری) شاہد اُجھ میں جان تسلیم کی اور دہلی میں دفن ہوئے۔ اناشد و انما الیہ ارجعون

نظام دو گیتی شہر لدو طین      سراج دو عالم شہر البقین  
چوتارخ خوش بستم زلیب      خداداد اُفت فہشتاد دین

۴۰۰۲۵

مغنیۃ الاولیاء میں ہے کہ گو آپ کے خلفاء سب ہی ممتاز تھے لیکن چار کو سب پر ولایت ماسل تھی حضرت امیر خسرو، حضرت شیخ نصیر الدین محمود (جبرائیل دہلی)، حضرت برہان الدین غریب، اور امیر حسن علما و سنجری۔

آپ نے چونکہ عقد نہیں فرمایا تھا اس لیے کوئی اولاد ظاہری نہیں چھوڑی۔ سولہ ماہ بعد ازمن چشتی مرآۃ الاسرار میں فرماتے ہیں کہ آپ کے دو فتنہ ستر کہ کی خدمت چار فرزوں کے ذمہ ہے ایک خواجہ محمد اور خواجہ سوئی بن حضرت شیخ برہان الدین اسحاق قدس سرہ کی اولاد، دوم فرزند ان خواجہ



ربیع الدین ہارون اور خواجہ تقی الدین نوح جو آپ کے خواہر زادہ بنے۔ سوم خواجہ ابو بکر مصلوٰۃ  
کی اولاد۔ جنہیں قربت قریبہ بھی قائل تھی۔ چہارم فرزند ان خواجہ مبشر جو آپ کے خدمتگار و  
محرم ہسرار تھے۔

اب آپ کے چند کلمات لطیبات افضل الفوائد اور فوائد الفوائد سے تبرکات و تینا ذیل میں درج  
کیے جاتے ہیں

لفظ ستیں خواجہ راجہ مل ستیں گرفتہ ام  
گفتہ شیخ کرد و شد جمع اُمید آنکہ حق  
کس نہ رسد بہ چاہد غم جز پس ایں من  
در گذرانہ از کرم گفتہ بد کرد کردہ حسن  
(حسن سنجری)

آپ کا ارشاد ہے کہ مونی کے لیے چار چیزوں سے بچنا ضروری ہے اول دنیا صحبت اختیار  
دوم اسوی اللہ کی یاد اور اُس کا تذکرہ۔ سوم غیر کی طرف نظر کرنا۔ چہارم دل کا سیل۔ یعنی حب  
دنیا سے دل کو پاک و صاف رکھنا چاہیے۔ پھر آید یہ ہو کر فرمایا کیا ہی اچھا ہو اگر حجاب در بیان  
سے اٹھا دیں۔ عہد ظاہر کر دیں اور غیرت دور ہو جائے اور یہ آواز دیں کہ بی بی بصرہ بی بی صبیحہ  
ایک مرتبہ آپ نے زبان مبارک سے فرمایا کہ عیسا بندہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اُس  
سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اُسکی قربت میں مست ہو جاتا ہے تو اپنے نفس کو اور اسوی اللہ کو بھول  
جاتا ہے۔ اُس وقت اگر اُس سے پوچھا جائے کہ تو کیا چاہتا ہے اور کہاں جا رہا ہے تو وہ اس  
سے زیادہ جواب نہیں دے سکتا کہ اللہ۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ گناہ سے ایک مرتبہ توبہ  
کی جاتی ہے مگر طاعت سے ہزار مرتبہ۔ یعنی جس طاعت میں ریا کا سیل ہو وہ گناہ سے بھی بہتر ہے۔  
ایک مرتبہ فرمایا کہ جو شخص کسی شیخ یا عالم (دین) کی بے غرتی کرے گا وہ دنیا و آخرت میں منافق و لعنتی  
ہوگا۔ نو ذاب اللہ منہا۔

ایک مرتبہ اقامت حقوق ہدایہ کا ذکر تھا آپ نے فرمایا کہ جب ہماری قرض مانگے تو اسے  
دو۔ اگر اسے مونی ضرورت ہو تو پوری کرو۔ بیماری میں اُسکی عیادت کرو۔ مصیبت میں غمخواری کرو  
اور جب مر جائے تو اُسکے جنازہ کی نماز پڑھو اور میت کے ساتھ جاؤ۔  
آپ نے فرمایا شرط عیادت یہ ہے کہ تین دن بعد بیماری پرسی کہ جائے اور بیچارے کی نصیحت کرے  
کہ بیماری کفارہ گناہاں ہے۔ جس سے اللہ جل شانہ محبت نہیں کرتا اسے بیمار نہیں دالتا۔ بیمار کو  
صدقہ دینے کی ترغیب دینی چاہیے۔ جو بھی کفارہ گناہاں ہے۔  
ایک مرتبہ عشق کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی تو زبان مبارک سے یہ شعر نسر آیا۔

قلوب لا کم ما عرفنا احواس و لولا احواس ما عرفنا کم

یعنی اگر تم نہ ہوتے تو ہم عشق و محبت کو پہچانتے ہی نہیں، اور اگر عشق و محبت نہ ہوتی تو تمہیں بھی نہ پہچان سکتے۔ پھر غلبات شوق میں یہ رباعی زبان مبارک سے ارشاد فرمائی۔

گر عشق نہ بودے و غم عشق نہ بودے چندیں سخن نغز کہ گفتے کہ شنیدے  
و باد نہ بودے سر زلفش کہ بودے رخسارہ مشوق بہ عاشق کہ نہ بودے

پھر آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ عشق کا ٹھکانہ ایسا ہے کہ جس آنکھ میں ڈالا جاتا ہے وہ عرش سے فرش تک سب کچھ دیکھتی ہے۔

عشق آئینہ است کا در زنگے نیست امرادان را ازین محل رنگے نیست  
ایک مرتبہ شیخ برہان الدین غریب نے پوچھا کہ محبت کی اصلیت کیا ہے۔ فرمایا کہ دوستی کی صفائی۔  
مہمان حق دنیا و آخرت کے حاصل کرنے میں اپنا اثر نہیں جانتے بلکہ وصول حق کو اپنا اثر سمجھتے ہیں۔

حضرت امیر خسروؒ نے پوچھا کہ محبت میں مصیبت کیوں ہوتی ہے۔ فرمایا اس لیے کہ ہر ایک کہنے  
اسکا دعویٰ نہ کرے۔ پھر فرمایا کہ عشق میں صبر اس بات کا نام ہے کہ رنج و راحت و دونوں حالتوں  
میں اُسے آرام رہے۔ صوفی صادق دہی ہے جو معاف و ہوا و دونوں میں صوفت پہنے۔ جفا سے دنیا  
کا مزہ چلے۔ تمارک دنیا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ تمام چیزوں کی کتنی صبر ہے۔ ارادت  
میں صبر سے کام جتا ہے۔ جب ارادت درست ہو جاتی ہے تو ہر کونوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔  
ایک مرتبہ آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اہل محبت ایسے لوگ ہیں کہ انکے اور حق کے مابین  
کوئی خجاب نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ کیسے اچھے ہیں جو پہلے ہی روز باخبر ہو جاتے ہیں اور  
دوسرے تیسرے دن انکا نشان بھی نہیں رہتا۔ مگر کامل وہ ہے جو آغاز و انجام عشق میں قائم رہے  
اور اہل من مزید ہی پکارا رہے۔ جو شخص راہ محبت و معرفت میں کال ہے اُس سے ظاہر باطن  
میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ ہستی آپ سے پوچھا گیا کہ لوگ اس مرتبہ پر کس طرح پہنچتے ہیں۔ فرمایا  
جب سب سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور صرف اہل شانہ کے ہو رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب یہ  
کے دل میں نماز کے وقت دنیا کا خیال آئے تو از سر نو نماز پڑھتے ہیں اور اگر حاجت کا خیال  
آجائے تو سجدہ ہو سکا لاتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جو لوگ دوست کے عشق میں مستغرق ہیں وہ صبح سے شام تک  
بڑی آرزو سے بلا کے خواستگار رہتے ہیں۔ کیونکہ جو مصیبت دوست کی وفات سے ہوتی ہے وہ

صحبت نہیں ہوتی بلکہ مین نعت ہوتی ہے۔

ہر جا کہ بلائے تست بر جاغم باد چوں در دنا سے تست بر جاغم باد  
گر ہر سہر عاشقاں بلا پا باشد آہنگہ بلائے تست بر جاغم باد  
آپ نے فرمایا کہ اس راہ میں عاشق اُسی کو کہتے ہیں جسکی جو حالت حضور می میں ہو وہی غیبت  
میں ہو۔ ہر حال میں طالب وصال رہے۔ جو لوگ مرد کمال ہیں وہ خلقت میں رہ کر دوست  
کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اس راہ میں خواہنگی اور غلامی کی کوئی تمیز نہیں۔ جو عالم  
محبت میں راست آتا ہے اُسی کا کام بن جاتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مشق و عقل ایک  
دوسرے کی ضد ہیں۔ ملا اہل عقل ہیں اور درویش اہل عشق۔ ارشاد ہوا کہ جب تک اللہ جل شانہ  
کی محبت قلب کے غلات میں ہوتی ہے تب تک گناہ کا سدا رہنا ممکن ہے لیکن جب قلب کے گرد و  
نواح میں آجاتی ہے تو پھر ممکن نہیں کہ گناہ صادر ہو۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک بزرگ نے شیطان سے پوچھا کہ تیرے نزدیک کونسا  
کام افضل ہے؟ اُس نے کہا (۱) بھولی قسم (۲) زنا (۳) سو من سے شرارت کرنا۔  
آپ نے فرمایا کہ صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ صحبت اگر رہے تو نیک لوگوں اور اولیاء اللہ کی  
ابداں کم نشیں کہ صحبت بد گمراہی کی تر اچھید کنند  
آفتابے ہیں بزرگی و اقطار بر تاپہ کسند  
آپ نے فرمایا کہ دانا وہی شخص ہے جو پیش آئے والے سفر یعنی فوت کے لیے تیاری کرے اور اپنے  
ساتھ توشہ رکھ لے۔

ایک مرتبہ درویشوں کی دعا کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ فرمایا درویشوں کے پاس آگ بھی  
ہے اور پانی بھی۔ یعنی رحم بھی ہے اور تہ بھی۔

ایک مرتبہ آرزوئے نفس کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ آپ نے زبان مبارک سے فرمایا کہ  
حق تعالیٰ کے اولیاء اور دوستوں نے سالہا سال نفس کی آرزو پوری نہیں کی اور اسے بڑی  
طرح ادا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ طریقت میں عارف وہ شخص ہے جو ہر لحظہ عالم تنکر میں رہے اور آست  
جائے والے لوگوں اور خلق کی اُسے خبر نہ ہو۔ اور عالم غیب سے ہر وقت اُس پر ایک خاص  
حالت طاری ہوتی رہے۔ آپ نے فرمایا کہ توحید کے سنی اللہ جل شانہ کو ایک کتا ہے اور معرفت  
سے مراد اُسکی شناخت ہے۔ عارف ہمیشہ خاموش رہتا ہے اور معرفت حسب ضرورت کلام کرتا ہے۔



فرمایا کہ عارف کے ستر مقام ہیں، ان میں سے ایک اس جہان کی مرادوں کا نہ ملنا ہے  
آپ نے فرمایا کہ جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچے تو اسے بددعا یا کرنی چاہیے تاکہ اللہ  
عالی اس کا بدلہ لے۔

خرقہ درویشی کے بارے میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ محض خرقہ قابل اعتبار  
نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ساری دنیا خرقہ پہن لیتی۔ اعتبار اس خرقہ پوش کا ہے جو خرقہ پہن کر اس  
حق ادا کرے۔ پس اگر وہ کام میں کوتاہی کرے گا تو خرقہ ہو گا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ  
حضرت عینہ قدس سرہ سے کہا گیا کہ اسے پر طرقت! کیا ہی اچھا ہو اگر آپ باری تعالیٰ کی  
چن نہیں۔ فرمایا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ صرف گدڑی سے کام چل جاتا ہے تو لوہے اور آگ  
کی بھی گدڑی چن لیتا۔ لیکن میں الا اعتبار بالخرقہ۔

آپ نے فرمایا کہ مریدوں کو جو نعمت حاصل ہوتی ہے وہ سب پر کی برکت سے حاصل ہوتی  
ہے۔ پس جو کچھ پر سے سنے ہمہ تن گوش ہو کر سنے اور اس پر عمل کرے تاکہ نعمت اس سے خارج  
نہ ہو جائے۔

ایک مرتبہ سماع اور اہل سماع کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک شخص نے آکر اعلان  
دی کہ آپ کے کچھ یار جمع ہوئے ہیں اور بانسریاں بھی لائے ہیں۔ فرمایا میں نے تو منع کیا تھا  
کہ بانسریاں اور تیز اور حرام چیزیں جو میں نہ آتی چاہیں کیونکہ یہ سب کھیل تماشے ہیں۔ جب  
تمانی سکاڑے کی مانند ہے تو بانسری کی ضرورت ہوگی۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی مقام سے گرس  
تو شروع میں گرسے۔ اور اگر یہاں سے بھی گر گیا تو پھر اُسکا ٹھکانا نہیں۔ پھر فرمایا کہ جو اہل سماع  
اور صاحب درد ہیں انھیں ڈال کے صرف ایک شعر پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور جو لوگ درد  
و ذوق نہیں رکھتے انھیں خواہ کتنی ہی بانسریاں ہوں کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا کہ جب کبھی  
میں نے سماع سنا مجھے خرقہ شیخ کی قسم ان سب باتوں کو میں نے حضرت شیخ کے اصوات پر محمول  
کیا چنانچہ ایک مرتبہ قواوں نے سب یہ شعر پڑھا

مخرام ہیں صفت مسادا کز چشم بہت رسد گرزے

یہ سن کر مجھے حضرت شیخ قدس سرہ کے اصوات عیدہ اور اخلاق پسندیدہ یاد آ گئے اور اسی  
شعر کی بار بار تکرار کروانا رہا۔

اں مطرب از کجاست کہ برگشت ایم دوست  
دل زندہ می شود یہ امید و ناسے یار  
جانان از کجاست کہ کتم من بتام دوست  
جانان بعضی کن بہ سماع کلام دوست

تا نفع تصور باز نہ آید بہ خویششن ہر کو فنا دست نہ تحریرت بجا ہم دست  
ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مومن کے دل کو ستانا اللہ تعالیٰ کو ستانا ہے۔ پس اسے درویش  
ہومن وہ شخص ہے کہ اگر وہ مشرق میں ہے اور مغرب میں ایک مومن کے ہاتھوں میں کانا چھبے  
تو اسکو یہاں درد محسوس ہو۔

آپ نے فرمایا کہ درویش کو پردہ پوش ہونا چاہیے۔ پردہ پوشی سب عبادتوں سے  
افضل ہے۔ اسے درویش واضح رہے کہ جہان میں کوئی شخص سعادت سے غافل نہیں جو یہاں  
آیا ہے اس میں کچھ نہ کچھ دینی یا دنیوی سعادت ضرور موجود ہے۔ لیکن خوش وقت وہ لوگ ہیں  
جن میں دونوں ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ انبیاء و اولیاء سے اگر سو اُخت خدمت بجالائے میں کوئی تقصیر  
ہو جاتی ہے تو اسے کفارہ میں وہ بکثرت گریہ و ناری کرتے ہیں۔ پس اسے درویش لوگوں کو ہر  
حالت میں خوف و اُمید رکھنی چاہیے اور خوف سے تو کسی حالت میں غافل نہیں رہنا چاہیے۔  
اسے درویش، اسے سلوک میں کمال دہی مرد ہے کہ دوست کے عالم افوار سے جو کچھ اس پر ظاہر ہو  
انشاء کرے۔ مرد وہی ہے جو اذل و ابد کے دریا پی کر بھی ہل بن مزید ہی پکارتا رہے۔

آپ نے فرمایا کہ توبہ کرنے والا متقی کے برابر ہوتا ہے۔ جس نے ثناء اور نافرمانیاں  
کی ہوں اور ان نافرمانیوں سے حفاظت اٹھایا ہو جب وہ توبہ کر کے طاعت کرے گا تو اسے طاعت میں  
بھی حفاظت ملے گا، ممکن ہے کہ راحت طاعت کی ایک چٹکاری اس کے نافرمانیوں کے سامنے کھلی بن  
کو جاوے۔

ایک مرتبہ تزکیہ نفس کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی آپ نے فرمایا کہ مرد میں چار چیزیں  
کمال پیدا ہوتا ہے۔ کم کھانا، کم بولنا، لوگوں سے کم میل جول رکھنا کم سونا۔  
آپ نے فرمایا کہ جب تک دل میں دنیا کی محبت رہے گی درد و غم کچھ فائدہ نہ دیں گے  
اس لیے دنیا ترک کر دینا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ ترک دنیا سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان اپنے پیسے نکال  
دے، نگوٹا باندھ کر بیٹھ جائے بلکہ لباس بھی پہنے اور کھائے بھی، لیکن جو کچھ اسے ملے اسکی  
طرف راتب نہ ہو اور اس سے دل نہ لگائے۔ فرمایا کہ مرد کو ہمت باندھ رکھنی چاہیے اور دیادی بیشی  
میں بھینسا نہ چاہیے۔ حرص و شہوت نفس ترک کر دینی چاہیے۔

ہر لحظہ ز شہوتے کہ داری بر خیز تا بشیند ہزار نشا ہر در پیش  
جب کسی اپنی چیز کو بندہ خدا کے واسطے چھوڑتا ہے تو اس سے شریف تر چیز ضرور ملتی ہے۔ خدا کے لیے اگر  
ترک دنیا کر چکا تو سمجھ لینا چاہیے کہ کیا کچھ ملے گا۔ آدمی کا حوصلہ دیتا ہونا چاہیے تاکہ اس کے برہنہ

رہنے کی قابیلیت اس میں پیدا ہو

آپ نے فرمایا کہ سالک بینک سوک میں بے حصول کمال ہاں پیدا رہتا ہے۔ بعد ازاں فرمایا کہ ایک سالک ہوتا ہے ایک واقف اور ایک راجح۔ سالک کی طاعت میں عیب متواتر آتا ہے تو تغیر آتا ہے اور ذوق رک جاتا ہے، اس لیے چاہیے کہ فوراً توبہ کرے۔ اگر توبہ نہ کرے گا رجعت کا اندیشہ ہے۔ پھر فرمایا اس راہ کی لغزش سات قسم کی ہوتی ہے، اعراض پنجاب تغیر، تسلی، سلب مزید، تسلی اور عداوت۔ عاشق کو چاہیے کہ فوراً معافی مانگ لے، ورنہ اعراض مجاہدہ بدل جائے گا وفس ملی بہا حتی کہ محبت دشمنی سے بدل جائیگی نہ زائد نہ سنا۔ آپ نے فرمایا اول فخر: دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر عزیت پھر فسل ہے۔ عوام سے جب تک ارتکاب فسل نہ ہو، فخر نہیں کیا جاتا، لیکن خواہ اس سے فخر کا بھی مواظفہ کرتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ ہر حال میں اس کی طرف رجوع کرے۔ سب اُسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہر حال میں اُسی کی پناہ ڈھونڈنی چاہیے آپ نے فرمایا زندگی اس کا نام ہے کہ درویش ذکر حق میں مشغول رہے۔ آپ نے فرمایا کہ مرد کے لیے کشف و کرامات بجز تہ مجاہدہ ہیں اگر کبھی اُن سے کچھ نہ ہو جاتا ہے تو شکر کی وجہ سے۔

ایک روز مہرور نما کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ مہرور کا نام ہے کہ جب بد و کولونی خدایت طبع امر حق ہو تو اُن کی شکایت نہ کرے۔ اور رضا، مسکینیت کا نام ہے کہ اس مصیبت سے کسی طنز کی کراہیت نہ کرے اور ایسا معلوم ہو کہ گویا اُس پر کوئی مصیبت ہی نہیں نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ دعا کے وقت نہ گناہوں کا خیال دل میں نہ آنا چاہیے اور نہ بابت دعا کا۔ گناہ کے خیال سے دعا کے ايقان میں سُستی ہوتی ہے۔ اس وقت صرف اللہ جل شانہ بہ رحمت پر نظر رکھنی چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ دعا ضرور قبول ہو جائے گی۔

ایک بار احوار کے بارے میں گفتگو ہوئی آپ نے فرمایا انوار تین طرح کے ہوتے ہیں۔ مسی، مقبلی، قدسی۔ مسی جیسے سوکھنا، کھانا، وغیرہ۔ عقلی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کسی دوسرے پر بھی لیکن جو عالم قدس میں پہنچ چکا ہوتا ہے وہ کسی کو بھی بدھی جانتا ہے۔ فرمایا کہ روح جب طاف تورا ہوتی ہے اور کمال کو پہنچ جاتی ہے تو قلب کو جذب کر لیتی ہے اور قلب جب قوی ہوتا ہے تو قلب کو جذب کرتا ہے۔ پس جو بات دل پر اثر کرتی ہے اُس کا اثر قلب پر بھی ہوتا ہے۔ آپ کا قول ہے کہ مومن کبھی ناپاک نہیں ہوتا۔ فرمایا کہ اصلی کام یاد حق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے سب یاد حق کا مانع ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا حق تعالیٰ پر مہر و بہر کر لینا چاہیے اور اس کے سوا کسی سے اُمید نہ رکھنی چاہیے۔ پھر فرمایا کہ ایمان اُس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اُن کی نگاہ میں تمام



طلعت پھر سے بھی کم حقیقت نہ معلوم ہو۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ خلقت کی چار قسمیں ہیں۔ ایک وہ جنکا ظاہر آراستہ اور باطن خراب ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جنکا ظاہر خراب اور باطن آراستہ ہوتا ہے۔ تیسرے وہ جنکا ظاہر و باطن دونوں خراب ہوتے ہیں۔ چوتھے وہ جنکے ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کا ظاہر آراستہ اور باطن خراب ہوتا ہے وہ مشبہ ہیں جو طاعت تو بہت کرتے ہیں مگر انکے دل دنیا میں مشغول ہوتے ہیں۔ جنکا ظاہر خراب و باطن آراستہ ہوتا ہے وہ مجذوب ہوتے ہیں۔ جنکا ظاہر و باطن دونوں خراب ہوتے ہیں وہ عالم ظاہر ہوتے ہیں۔ اور جنکا ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتا ہے وہ (سچے) مشائخ ہوتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ شراب ایک لطیف چیز ہے۔ لیکن جب قرینت میں کہا جائے اور کہیں میں کیا جائے تو سخت بے لطف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ظلم بھی بہت شریف چیز ہے لیکن اُسے حاصل کرنے زور و زکا پکڑ لگایا جائے تو اسکی عزت جاتی رہتی ہے۔

ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ سعادت کے نفل کی کنجیاں کئی ایک ہیں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ کس کنجی سے کھلے گا۔ اگر ایک سے کھلے تو اس اُسید میں کہ دوسری سے کھل جائے گا تمام کنجیوں سے کھولنا چاہیے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ جو شخص پیر کا ہاتھ پکڑتا ہے وہ گویا خدا سے عہد کرتا ہے۔ اُسے چاہیے کہ اپنے عہد پر ثابت قدم رہے ورنہ بیت سے کیا فائدہ؟

ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ ولایت دو طرح کی ہے ایک ولایت ایمان اور دوسری ولایت احسان۔ ایمان کی ولایت ہر مومن کو حاصل ہے اللہ ولی الذین آمنوا۔ اگر ولایت احسان یہ ہے کہ کسی کو کشف کرامت یا اور کوئی اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو۔

عشق خواہی بہ غایت آہ زن

بر تر از کائنات فرم زن

لیس فی جنتی سوی اللہ زن

خیمہ استکانت در چہ زن

عبداللہ

عاشقا خیز و محام در روز زن

جاں در انداز و را و جانان گیر

جاں بخت کرد در سراچہ عشق

مصر خواہی چو پوست کنان

(الناظر جون ۱۹۲۵ء)

## سقراط

(۱)

گرچہ ہر ذرے سخن آسے بود      لیکن گفت سابقان یا سے بود  
 لکلی قومِ حاد کیا اس سے کوئی اسکا کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس جواب سے بری ہمت  
 بندھتی ہے کہ سطور ذیل میں یونان کے اُدسی اعظم کے کچھ حالات پیش کر دیں تاکہ اُس شخص کی اک  
 دھندلی سی تصویر آپ کے سامنے آجائے جس کا نیلوس<sup>۱</sup> جو بیس سو سال سے دنیا میں ڈنکان بج رہا ہے  
 اور کلامِ ربانی کی حقانیت ہو دیا ہو سکے۔

ابھی حضرت مسیح علیہ السلام کو ظاہر ہونے کے لیے چار سو اسی سال سے کچھ زیادہ باقی تھے  
 کہ یونان کے شہر اتھینس (Athens) میں ایک بُت تراش سفر و نسکوس (Spheroskous)  
 کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جس کے شان میں ڈلفی (Delphi) کی زبانِ غیب یہ اشارہ  
 کرتی ہے کہ اس سے زیادہ دانشمند یونان میں نہیں پیدا ہوا۔ اس عجیب و غریب لڑکے کے بچپن کا  
 حال پردہِ خفایں ہے۔ صحیح طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسکے اخلاقی اور ذہنی ترقی کے اسباب  
 کیا ہوئے۔

اسی گناہی میں اُسے تقریباً چالیس سال گزر جاتے ہیں کہ محاصرہ پولیڈیا (Polydia)  
 کا سرکہ پیش آتا ہے جس میں اُسکے جو ہر کسی قدر ظاہر ہوتے ہیں۔

سقراط ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے کچھ وجہ نہ تھا۔ عموماً قد موٹی گردن جسم کسی قدر  
 بھنی آنکھیں بھری ہوئی۔ ناک اور پرکھ پیٹی دبی ہوئی اور نتھنے کشادہ۔ دانت بڑے ہونٹ بھتے صورت  
 کھینے سے ایک شہوت پرست احمق معلوم ہوتا تھا۔ مگر اندرونی صفات یہ بیان کیے گئے ہیں۔ اس قدر





منا کر کردہ اکثر پراڈائیس (Heraclitus) کی داستان ہرقل بیاں کیا کرتا تھا اور حکما و سلف جو علم کا فروختہ پھوڑے تھے وہ بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ اس کے مطالعہ میں منہمک رہا کرتا تھا۔ حکماء سید کے فہرے مثلاً اس وقت فلسفہ و خیال کے ذہن میں جگہ حاصل کرتے جاتے تھے اُسے ریاضی۔ طبیعیات۔ حکمت۔ ہیئت اور ہندسہ پر خاصا عبور حاصل تھا۔ اپنے پیش رو حکماء کے مسائل پر کلیش (Heraclitus) پارسی ڈیزر (Parmenides) اور بالخصوص انکسائوس (Anaxagoras) کے علوم اُس کے خاص مطالعہ میں تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی کے سامنے سقراط نے انوکھی گردی نہ کیا۔ سقراط و سقراطیوں کے درمیانی زبان میں ہم اُس شخص کو بائیسڈیا (Meno) کے محاصرہ میں مصروف پاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جبکہ پیاس اور جاڑے کی تکلیف ڈاکٹر ٹریس (Thrace) کے جاڑے کے سخت مصائب برداشت کرنے میں سقراط کا کون سا تالہ نہیں کر سکا۔ الیس بائیڈیز (Alcibiades) کی جان اُسی سے کہ میں نہایت بیمار سی کے ساتھ بچاتا ہوں اور حیات و زبانی کا انعام بھی اُسی کو دلواتا ہوں۔ سقراطیوں میں جنگ ہائے بلیزہیس (Peloponnesus) اور تاتاریوں میں اور سقراطیوں میں سرکر ڈیوم (Darius) میں اتھینس (Athens) کو اہل تھبہ (Thebes) کے ہاتھ سے ایک شکست فاش نصیب ہوئی۔ لیکن غراء اور شیرز (Laches) اور چند لوگ ایسے نظر آتے ہیں جو بہت نہیں ہارتے۔ بن بعد فوج بیوکیں (Amphipolis) کے مقابلہ میں میدان امنی پوس (Amphipolis) میں ترائہ پھر شریک جنگ ہوتا ہوں اور کارہائے نمایاں کرتا ہوں۔

جنگ امنی پوس (Amphipolis) کے بعد سو برس تک سقراط گنہگار اور خاموشی میں بسر کرتا ہوں اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کون اور کس حال میں ہیں۔ سقراطیوں میں اہل اتھینس (Athens) ڈیس ڈونیون (Lacedaemonian) میں بحرانی لڑائی آگے نسا (Arginusae) پر مانی ہر جہیں اول الذکر کو فتح ہوتی ہے۔ جنگ کے بعد اتھینس (Athens) سرداران فوج اپنے فتویٰ کی باتوں کو لیجانے اور اپنے بیکار شدہ پیش چھوٹے جہازوں کے لوگوں کو پانے سے قاصر رہ جانے ہیں اس سے اہل اتھینس کو غصہ آتا ہوں مردوں کی رسمائے بعد الموت بہت شان و شوکت سے ادا کی جاتی ہیں۔ اور سرداران مذکور کو فوراً واپس طلب کیا جاتا ہوں ان پر غفلت کا مقدمہ قائم کیا جاتا۔

اُن کا یہ جواب کوئی تسلیم نہیں کرنا کہ اُنھوں نے اپنے ماتحت انسردن کو ضروری احکام دیدیے تھے، لیکن ایسا طوفان آیا کہ اُن احکام کی تعمیل نہ ہو سکی۔ انجمن میں بحث مباحثہ ملتوی ہو جاتا ہے۔ اور اس پر غور کیا جاتا ہے کہ اُن سرداروں پر کس طرح مقدمہ چلایا جائے۔ اہل ایتھنس (Athenians) کی یہ رائے ہوتی ہے کہ الزام

اور جواب یہی دونوں کو سُن کر فوراً سب کی رائے لینا چاہیے تاکہ یہ آٹھوں سردار سب چھوڑ دیے جائیں یا سزا پالیں۔ یہ رزولوشن یہی نہیں کہ بے انسانی پر مبنی تھا بلکہ خلافت قانون بھی تھا اس لیے کہ معمولی مقدمہ چلانے کے بجائے عوام کی رائے لینا پسند کیا گیا تھا۔ اور اُس قانون کے خلافت تھا جس کے رد سے ہر شخص کے متعلق علیحدہ علیحدہ تجویز صادر کرنی لازمی تھی اس وقت سقراط بھی سنٹ (Senatus) کا رکن تھا۔ اس سنٹ (Senatus) میں پانچ سواہل شہر تھے جو بذریعہ فرما مذازی ایک دن کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ اور ہر روز ایک نیا میر مجلس مقرر ہوا کرتا تھا۔ چونکہ رزولوشن خلافت قانون تھا اس لیے اگر کبھی میر مجلس نے مخالفت کی تو اُسے دھمکا کر چپ کر دیا گیا۔ لیکن سقراط ایسا نہ تھا کہ حق کی جانبدار میں کسی کی دہمکی میں آجاتا۔ اُس نے صاف کہہ دیا کہ میں قانون اور انصاف کی جانبدار میں خطرہ کا مقابلہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اور عوام الناس کی غیر منصفانہ تجویز میں اُن کا ہم زبان نہیں ہو سکتا لیکن سقراط چونکہ صرف ایک ہی روز کے لیے میر مجلس ہوا تھا اس لیے اُس روز یہ کارروائی ملتوی کر دی گئی اور دوسرے روز ایک کمزور طبیعت شخص کی میر مجلس بنا کر سرداران فوج کے قتل کا حکم لے لیا گیا۔ اور اُنھیں قتل کر دیا گیا۔

دو برس بعد سنٹ ۴۰۴ میں اہل ایتھنس (Athenians) کو ایسی ڈمونیون (Dionysian) فوج نے شکست دی اور شہر پر دشمنوں کا قبضہ اور ایتھنس (Athens) کے جمہوری نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس کے بجائے اسپارٹی جزیرہ (Spartan) کے جنرل (Dysander) کی ماتحتی میں نیا منتخب اشتیخاص کی حکومت قائم ہوئی۔ اور طرح طرح کے مظالم شروع ہوئے۔ لوگوں کو اختلاف رائے اور دولت و شہرت کی وجہ سے بیدار فتنہ قتل کیا جاتا تھا۔ ایک شخص سینی لیان (Lion) کو بھی حکومت نے اسی غرض کے لیے طلب کیا۔ اور پانچ آدمیوں کو جنہیں ایک سقراط بھی تھا یہ حکم دیا کہ لیان (Lion) کو بڑا لالچ دیا جائے۔ چار آدمیوں نے تعمیل کی مگر سقراط نے کسی خطرہ کی پروا نہ کی اور اپنے گھر جا گیا۔ اس واقعہ کے متعلق وہ خود کہتا ہے کہ ”میں نے زبان سے نہیں بلکہ اپنے فعل سے یہ کھار دیا“

لہ مجھے موت کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں۔ لیکن اس کا مجھے بہت خیال ہے کہ میرے ہاتھ سے کوئی خطا سرزد نہ ہو جائے۔ اس حکم عدلی سے ناخوش ہو کر کریٹیاں (Cretians) اور اُس کے شرکا حکومت نے اُسے طلب کر کے حکم دیا کہ ملک کے نوجوانوں سے قطعاً باقی نہ کیا کرو ورنہ سزا موت دی جائیگی۔

سقراط نے زان تھیب (Xanthippe) کے ساتھ شادی کی تھی اس کے تین لڑکے ہوئے۔ لہراکلیز (Lamprocles) سفرانکوس (Sophronous) اور نکسی نوس (Nekses)۔ زان تھیب (Xanthippe) بڑی بد مزاج عورت تھی لیکن سقراط نہایت تحمل کے ساتھ اُس سے دگڈر کرتا تھا مگر کچھ خوش نہ تھا۔ اُس کا قول تھا کہ خدا نے مجھے لوگوں سے محاسبہ کرنے کے لیے حکم فرمایا ہے۔ میں کسی طرح خاموش نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر چپ رہوں تو خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہوں گا۔ یہ خیال اُس کے دل میں اس قدر سختی سے جا گزین تھا کہ لوگوں کی مخالفت اور نفرت کوئی شے اُسے اس جاوہ سے منحرف نہیں کر سکتی تھی، یہ ہم نہیں بتا سکتے کہ کس وقت سے اُس نے لوگوں کا محاسبہ کرنا شروع کیا۔ اور اس آہی فرغ کی انجام دہی اپنے سر لی۔ لیکن ۴۲۳ ق م میں ایسی وفات سے چوبیس سال قبل اُس کو یہ حیثیت ملے خیالات پیدا کرنے والے کے خاص شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اور یہی قیاس ہو سکتا ہے کہ اس سال کے قبل ہی سقراط نے اپنا آہی فرغ ادا کرنا شروع کر دیا ہوگا۔

محاصرہ پلائڈا (Potidea) ۴۲۹ ق م لغایت ۴۲۷ ق م سے پہلے خود اُس نے اپنا محاسبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُس زمانہ میں سونسٹائیون کے تعلیمات کا بہت چرچا تھا۔ گراس کی تعلیم اس کے بھی خلاف تھی۔ اُس کی تعلیم کا یہ طریقہ تھا کہ وہ نہ تو کسی سے کوئی اجرت لیتا تھا اور نہ طلباء کو ٹھاکر سبق دیا کرتا تھا۔ اس کی تمام عمر احتساب میں گزری۔ جو کوئی اُس سے مخاطب ہوتا اُس سے فوراً سوالات کرنے اور محاسبہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔ کبھی وہ السی پلائڈز (Alcibiades) کا رجباس (Gorgias) پیر ٹولوروس (Protogoras) سے باتیں کرتا نظر آتا تھا۔ اور کبھی ایک معمولی مزدور سے۔ غرض کہ وہ ایسے مقامات پر نظر آتا تھا جہاں دیکھتا کہ لوگ بہت جت ہو کر تھکے ہیں اور شہر سے بہت کم باہر جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں علم کا شائق ہوں جو شہر ہی میں آدمیوں سے مجھے مل سکتا ہے۔ کچھ بات دانت مجھے کچھ نہیں کھا سکتے۔ اُس نے اپنی تمام توجہ خدا سے بزرگ و بزرگ خدمت میں نہا کر دی تھی۔



اور اپنے خانگی معاملات تک سے غافل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انڈاس نے اُسے آگھیرا اور جس وقت اس بقدرہ کے زمانہ میں اُسے روپیہ کی ضرورت ہوئی تو ایک تقریبی لکھنے میں اس کا معادل تقریباً معیہ لکھ کر عثمانیہ سے زیادہ اُس کے پاس نہ تھا۔ انڈاطون اپنے استاد کی ظاہری حالت کو بیان کر کے کہتا ہے۔

”میں نہیں جانتا کہ تم میں سے کسی نے بھی ایسی ربانی صورتیں دیکھی ہوں گی، جو اُس نے اندر تھیں میں نے انہیں دیکھا ہے۔ وہ اس طرح حسین سونے کی طرح جگمگاتی ہوئی علویٰ عفت عجیب و غریب ہیں کہ جس طرح خدائی آواز کو سن کر لوگ اطاعت کے لیے جھک جاتے ہیں اس قراط کے احکام کو بھی سُن کر جھک جاتے تھے۔“

کبھی کسی شخص نے اُسے شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بڑے بڑے مصائب برداشت کر چکی اُس میں غیر معمولی طاقت تھی سخت سے سخت جاڑے میں بھی جب تمام عالم غلیظ کھڑے سے گھرا ہوتا اور لوگ سو رہے ہوتے اچھل طرح اور دھلپٹ کر نکلتے تھے، سقراط اپنے معمولی کپڑوں میں نکلتا تھا۔ اور اس طرح چلتا تھا کہ گویا سردی کا کوئی اثر اُس پر نہیں ہر وہ شے پر برت پر آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ ایک مقام پر کھڑا عالم فکر میں مستغرق ہے۔ دوپہر کو بھی اسی طرح نظر آیا۔ لوگ کہتے تھے کہ سقراط کو دیکھو صبح سے اسی طرح کھڑا سوچ رہا ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات ہو گئی۔ بعض لوگ اُس کے قریب آکر سو گئے انہوں نے دیکھا کہ سقراط اُسی طرح بُت بنا کھڑا ہوا ہے حتیٰ کہ تمام رات گزر گئی۔ اور جب آفتاب سالناب برآمد ہوا اُس وقت اُسے ہوش آیا اُس کی شکل حل ہو گئی اور اُس نے وہاں سے جنبش کی افلاطون جنگ ڈیلیوم (Daliun) کی ہزیت کے وقت سقراط کا استقلال اس طرح بیان کرتا ہے۔

”سقراط کو اُس وقت دیکھنا چاہیے تھا جبکہ ہماری فوج جنگ ڈیلیوم (Daliun) میں شکست کھا کر منتشر ہو گئی۔ یہ ایک دیکھنے کے قابل منظر تھا۔ میں اُس وقت رسالہ کے ساتھ تھا اور وہ پیدل تھا اور سرتاپا وہ ہے میں غرق تھا جب ہماری فوج کو کامل شکست ہوئی تو سقراط اور لیشیز (Laches) دونوں ساتھ ساتھ ہزیت کرتے نظر آئے۔ میں اتفاق سے وہاں آگیا اور ان دونوں کو دیکھ کر سلام کیا اور ان کے ساتھ ہولیا چونکہ میں گھوڑے پر سوار تھا اس لیے اپنی حالت کے متعلق زیادہ تر دو میں نہ تھا۔ یہ موقع پائیدا ہند (Potindand) کے میدان سے بھی زیادہ نازک تھا۔ ایسی حالت میں سقراط کے طور و انداز میں ایک ایسا

والغریب مقرر تھے نظر آ رہا تھا جو استقلال طبع اور جرأت میں پیشوا (مصلحت جرم) سے  
 جو جہاں زیادہ بلند مرتبہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک شاہانہ انداز سے طمانیت قلب کے ساتھ  
 قدم اٹھاتا جاتا اور ہر دو جانب دوست اور دشمن دونوں پر اطمینان سے نگاہ ڈالتا  
 جاتا تھا۔ حتیٰ کہ دور سے دیکھ کر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو کوئی اس پر حملہ کا ارادہ کرے گا اسے  
 ایک سخت مقابلہ کرنا ہو گا۔ جو لوگ ہزیمت کے وقت منتشر ہو گئے تھے اُن کا دشمنوں نے  
 تعاقب کیا اور وہ قتل ہوئے۔ لیکن یہ اور اُس کے ساتھی امن و امان کے ساتھ واپس  
 آئے۔ جو لوگ سفراء کی طرح شکست کے وقت طور و انداز ظاہر کرتے ہیں انہیں لوگ ہاتھ  
 لگاتے ہوئے بھگتے ہیں۔

اس کے بعد فلاطون تمام بڑے بڑے لوگوں کا نام لیکر کہتا ہے کہ اُن سے اور سزا دے کوئی مقابلہ  
 نہیں ہو سکتا۔ اس میں ایک غیر معمولی شے تھی جو کسی میں نہ تھی خود اُس کی ذات اور اُس کی تقریر اور قول  
 ایسے تھے کہ انسان سے اُن کا مقابلہ کیا جاسکے۔

۲۹۵ تم میں سقراط پر یہ مقدمہ قائم کیا گیا کہ شہر کے نوجوانوں کو خراب کرنا اور اتھینس (Athens)  
 کے دیوتاؤں کو نہیں ماننا ہے۔ پانچویں آدمیوں کا جلسہ عدالت کے لیے بیٹھا ہے اس میں سے دوسو کپاسی  
 اُس کو مجرم قرار دینے میں اور دس سو بیس اُس کو بری کرتے ہیں۔ کثرتِ رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور سزائے موت  
 سنائی جاتی ہے مگر ایک مذہبی رسم کی وجہ سے فیصلہ میں تاخیر واقع ہوتی ہے اور اُن میں روزِ تک قید خانہ میں رہنا  
 پڑتا ہے۔ اُس کے دوست احباب سب انتہا کرتے ہیں کہ یاگ جاسے۔ مگر وہ نہیں سنتا اور موت کا وقت  
 قریب آتا ہے تو خوشی خوشی زہ کا بیالہ ہاتھ میں لیکر لی جاتا ہے۔  
 اتھینس (Athens) والوں کی انہیں کے سامنے جو تقریر اُس نے اپنے بچاؤ میں کی ہے  
 اُس میں کہا ہے۔

"میرے دوستو اگر تم سمجھتے ہو کہ ایک شخص جس کی کچھ بھی قدر و قیمت ہے ایک کام میں ہاتھ  
 ڈالتا اور بعدِ موت سے ڈرتا جاتا ہے یا اس خیال کے علاوہ کہ آباد حق پر عامل ہے یا باطل پر  
 کوئی اور خیال کرتا ہے تو میرے دوستو تم غلطی کرتے ہو۔ میں اپنا تمام وقت تمہارے ہاتھوں

اور جوانوں کے پاس جانے اور انہیں اس بات پرائل کرنے کے لیے صرف کرتا ہوں کہ وہ  
لوگ روحانی تکمیل کو اپنا مقصد بنا لیں اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو جائے اپنے جسم کو  
اور مال و دولت کی طرف توجہ نہ کریں۔ یہ بھی کہتا ہوں کہ نیکی دولت کے ذریعہ سے نہیں۔

حاصل ہوتی بلکہ دولت اور تمام نعمتیں جو انسان حاصل کرنا ہی نیکی سے پیدا ہوتی ہیں۔  
کراؤ (صداۃ) جب مجلس میں آکر بھاگ جانے کی راے دیتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے :-  
”ہماری رہنمائی عقل سے ہو کر تھی ہے اور عقل یہ کہتی ہے کہ ہمیں صرف ایک سوال پر غور کرنا  
چاہیے کہ اگر میں بھاگ جاؤں تو آیا میں حق پر ہوں گا یا باطل پر اور اگر ہم یہ دیکھیں کہ بھاگنے  
میں غلطی اور باطل کا اتباع ہے تو ہمیں موت کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے۔“

اُس زمانہ کے حالات وقت اور سبب اخلاقی حالت پر اگر صرف ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو  
معلوم ہو گا کہ جو راہیں لوگ قائم کرتے تھے وہ ایسی ہی نقص ہوا کرتی تھیں جیسے کہ خود وہ حالات ناقص اور  
اصلاح طلب تھے ان حالات کی وجہ سے اُسے سمجھنی سی پیدا ہوتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی لگا  
ہوا تھا کہ ملنے والے حل و علی نے لوگوں کی اصلاح کا فرض اُس کے سپرد کیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ان غلط کاریوں اور  
رسوم پرستیوں سے جن پر فسطائی اپنے نظام کی بنیاد قائم کرتے تھے، وہ رو براہ نہیں ہو سکتے۔ بایں ہمہ  
اصلاح کے فرض سے وہ کبھی نہیں پیچھے رہا۔ گو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُسے موت کا سامنا کرنا پڑا جس اصول پر  
اُس کا مسئلہ اصلاح مبنی تھا وہ صرف ایک جملہ میں ادا ہو سکتا ہے یعنی اُس حق جسکی رہنمائی عقل ہو وہ انسان  
کے خیالات کی بنیاد قائم کرنا چاہتا تھا اور جو اصلاحات کہ جذبات جوش و خروش اور عادت کے تابع ہوں  
انہیں وہ نیکی اور خیر کا باعث قرار نہیں دیتا تھا۔ اُس کی پوری تعلیم یہ تھی کہ ”علم ہی نیکی اور خیر ہے۔“  
پس اگر علم غیر محض ہے تو جہالت شرع محض کہی جائے گی۔ وہ خود کہتا ہے کہ اگر جوانوں کے خراب کرنے کے جرم کا  
دو واقعے مرکب ہو جائیں تو نادانگی اور جہالت کی وجہ سے ہو گا جب سیلیٹوس (Meletus) اس پر بھی  
نوجوانوں کو خراب کرنے کا الزام لگاتا ہے تو خود وہیں جواب دیتا ہے کہ سیلیٹوس (Meletus) تم جھوٹ  
بولتے ہو۔ تم خوب جانتے ہو کہ یا تو میں نوجوانوں کو خراب ہی نہیں کرتا یا اگر کرتا ہوں تو بلا وجہ اور اپنی جہالت  
اور لاعلمی کی وجہ سے کرتا ہوں گا۔ اور جس وقت مجھے یہ معلوم ہو گا کہ میں ایک جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں تو فوراً  
اُسے ترک کر دوں گا۔ جو آدمی حق کا شناسا ہے اُسے ہمیشہ حق بات کرنی چاہیے اور جو اُسے نہیں جانتا وہ اسکا



مائل ہی نہیں ہو سکتا جب کسی فائق ترین فتنے کو ہم دیکھیں تو ہمیں اس سے محبت کرنی چاہیے۔  
 سقراط اپنے الزام دینے والوں کی دونوں عین قائم کرتا ہے۔ پہلی نوع وہ ہے جو اسے سا ماسال سے  
 بے وجہ الزام دیتے رہے۔ مثلاً ارسطو فونوس (Aristophanes) جس نے ایک ڈراما

”ابر“ (Cloud) لکھ کر اُس کی ہنسی اُڑانے کی کوشش کی تھی اور دوسرے سلیپوسس  
 (Mecletus) اور اُس کے ساتھی۔ پہلے وہ پہلی نوع کے لوگوں کا جواب دیتا ہے۔ یہ لوگ اسے  
 سوسٹائلی اور طبیعی ہونے کا الزام دیتے ہیں۔ وہ ان دونوں کی خصوصیتیں بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ  
 ان دونوں قسم کے لکما میں سے وہ ایک بھی نہیں ہے۔ اُسے لوگ اس لیے ناپسند کرتے ہیں کہ اس نے لوگوں  
 کے محاسبہ کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ظلم نہیں رکھتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ ظلم نہیں رکھتا۔  
 اُس سے ظلم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن وہ جس کسی کو ڈیڑھ لٹا اور آزماتا ہے کہ اس سے کچھ ظلم کا پتہ  
 چلے۔ یہی بات ہے کہ وہ بھی اس کی ٹٹ علامت سے مفری ہو گیا۔ باوجود علم سے غاری ہونے کے سمجھتا ہے کہ ظلم سے  
 بہرہ دانی رکھتا ہے۔ دوسروں میں اور اپنے میں وہ صرف یہی فرق دیکھتا ہے کہ لوگ نہیں جانتے اور جانتے  
 ہیں کہ خوب جانتے ہیں۔ اور وہ خود کو نہیں جانتا۔ مگر یہ ضرور جانتا ہے کہ نہیں جانتا۔ اسی بنا پر وہ دلفی کی  
 غیبی زبان کا لوگوں سے ذکر کرتا ہے کہ اگر اُس زمانہ میں کوئی عقل مند آدمی ہو تو وہ سقراط ہی ہے سلیپوسس  
 (Mecletus) کی زبان سے اُسے جھٹلا دیتا ہے۔ ایک شخص اُس سے یہ کہتا ہے کہ کیا اپنی جان کو  
 یکا ایسے زندگی کی خاطر جیسی کہ تم اب کر رہے ہو جو کھون میں ڈالنا اچھی بات ہے۔ سقراط جواب دیتا ہے کہ دنیاوی  
 سرداران فوج لے لڑائی کے میدانوں میں جہاں اُس کی جگہ قائم کر دی اُسے اُس نے کبھی نہیں چھوڑا۔  
 پھر کیا جس جگہ خدا نے اُسے امور کیا ہے وہ ان سے وہ بھاگ جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کبھی لیے شط  
 کے ساتھ جس کے رُوسے وہ لوگوں سے محاسبہ کرنے سے باز رہے وہ اپنی برأت نہیں قبول کرنا چاہتا تھا۔  
 اہل اتھینس (Athens) کو پھر تنبیہ کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ ان کو اُس سے ناراض نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ  
 خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس نے ان لوگوں کے بیدار کرنے کے لیے اُسے بھیجا ہے اگر وہ لوگ اُسے قتل  
 کر ڈالیں گے۔ تو اُس کا بانشین نیریل سکے گا۔

سقراط کی تمام عمر لوگوں کی خدمت گزار میں بسر ہوئی وہ اسور لکی میں سواسے ایک مرتبہ سے  
 کبھی نہیں بڑا۔ اگر دیکھا تو دونوں بیک لوگ اُسے قتل کر چکے ہوتے۔ اور جو کام وہ کر رہا تھا اور راہ جاتا۔ وہ

انجن تحقیقات کے ساتھ علی رؤس الاشهاد کہتا ہے کہ کہاں ہیں وہ نوجوان اس کے جنہیں میں نے خراب کیا ہے  
 کیونکہ وہ جوان اور سمجھدار ہونے کے بعد اب آکر مجھے الزام نہیں دیتے! اور اگر وہ خود نہیں آنا چاہتے تو ان کے  
 رشتہ دار سی آئیں۔ مگر وہ بھی نہیں آتے تو سمجھ لو اس کی وجہ یہ ہے کہ سقراط حق بات بول رہا ہے اور اس کا الزام دہشت  
 انی ٹوس (Anitus) دروغ گو ہے۔ وہ ججون سے رحم و کرم کی استدعا نہیں کرتا کیونکہ اس میں  
 اتھنس (Athena) کی ذلت ہے ججون نے قانون کے مطابق عمل کرنے کا عہد و پیمان کر لیا ہے پھر  
 اگر وہ ان سے رحم و کرم کا خونتگار ہو تو گویا نقص عہد پر آمادہ کرنے کا کرم قرار پائے گا۔ اُس پر بیدینی کا الزام لگایا  
 جارہا ہے مگر وہ اپنے نسلین بیدین نہیں جانتا اور ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنی ذات کو ججون اور خدا کے  
 سپرد کرتا ہے۔

اُس کے بعد جج آپس میں ووٹ لیتے ہیں۔ ۲۸۱ ووٹ اس کے خلاف ہوتے ہیں اور ۲۲۰ ووٹ  
 اُس کے موافق۔ میلٹیوس (Meliatus) پھر ایک تقریر کرتا ہے جس میں سزائے موت کی تائید کرتا ہے  
 پھر سزا ایک تقریر کرتا ہے جس میں سزائے موت کے بدل کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے عوام الناس پر جان  
 کیا ہے اور اولیپیا (Olympia) کے سوراؤن کی طرح مجھے بھی پرانے ٹینم (Pentaneum) میں  
 بیت المال سے وظیفہ ملنا چاہیے۔ اُسے یقین ہے کہ اُس نے کوئی خطا نہیں کی وہ نہیں کہہ سکتا کہ موت  
 اچھی چیز ہے یا بری۔ پھر جس شے کو وہ قلعی طور پر برا جانتا ہے اس کو یون معاوضہ موت میں تجویز کرے۔ جبرائیل  
 ادا کرتا بڑائی میں داخل نہیں ہے۔ لیکن اُس کے پاس زر و مال نہیں جو جبرائیل ادا کر سکے۔ شاید ایک مینا  
 (Mina) ملے، یعنی معیہ سکے عثمانیہ ہوگا، ماضی ہے۔ اُس کے دوست کہتے ہیں کہ میں مینا (Mina) ہندو  
 تک دینا قبول کرو اور وہ سب مل کر ادا کر دیں گے۔ چنانچہ وہ ان کی خواہش کے مطابق انجمن کے  
 سامنے نہیں پیش کرتا ہے۔ مگر اہل اتھنس (Athena) اس کے لیے سزائے موت  
 ہی تجویز کرتے ہیں جن لوگوں نے اُس کے خلاف یہ تجویز کی ان کو سخت ملامت کرتا ہے۔ اور مشین گوئی کرتا ہے  
 کہ ایک بڑا سخت عذاب اُن پر نازل ہونے والا ہے اور جن لوگوں نے اُسے بری تجویز کیا تھا ان سے کہتا ہے  
 کہ آپ سب لوگ ٹھہر جائیں میں آپ سے بائیں کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے حالات اور موت کے حالات ان سے  
 بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک نیک آدمی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور ججون سے آخری استدعا  
 یہ کرتا ہے کہ جس طرح اُس نے ان کے ساتھ عیاسیہ کر کے پریشان کیا ہے اسی طرح وہ بھی اس کو لڑکوں کے ساتھ

برتاؤ کریں۔ اور اگر اس کو لڑکے زرد بال کی خیر و صلاح پر ترجیح دیں اور اپنے تئیں بڑا آدمی سمجھیں درانحالیکہ  
 وہ بڑی نہ ہوں تو ان کے ساتھ سختی کی جائے۔ وہ اپنے طرز عمل یعنی محاسبہ کی بابت بالکل افسوس ظاہر نہیں  
 کرتا۔ اور اہل اتھینس (Athenians) کے مقابلہ میں آستین چڑھا کر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ جب ان سے مخالفت  
 کرتا ہے تو ہر شخص سے فردا فردا اور من حیث المجموع ہر طرح خطاب کرتا ہے لیکن نہایت محبت و مہلکت  
 سے۔ کسی سے اُس کا اڑائی جھگڑا نہیں ہے۔ وہ ان کی کوتاہیوں اور قصوروں پر اظہارِ افسوس کیے بغیر  
 نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی اس کے درود اور محبت کا اظہار ہے جو ان کی صلاح اور محاسبہ کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔  
 فیصلہ مقدمہ کے بعد سقراط کو تیس روز تک محبس میں اس لیے انتظار کرنا پڑتا ہے کہ اہل اتھینس  
 (Athenians) ہر سال ڈیلاس (Delas) میں جو اپالو (Apollon) کا بت تھا  
 اس کی خدمت میں بٹ نہ بٹیا کرتے تھے۔ اس وفد کی غیبت میں، اتھینس (Athenians) میں کوئی  
 شخص قتل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ وفد بھی روانہ ہوا تھا اور جب تک وہیں نہ ہو جاتا سقراط کو سزا سے  
 موت نہیں دی جاسکتی تھی۔ محبس میں جس استدلال کے ساتھ اپنے احباب کو پسند و نصیحت میں اس نے  
 وقت صرف کیا، اس کی نشیہ نہیں مل سکتی۔ اُس زمانہ میں ایک روز صبح ترا کے کراٹو (Cratilo)  
 اس کے پاس پہنچتا ہے۔ سقراط ابھی تک سو رہا ہے۔ کراٹو معمولی اوقات سے کسی قدر قبل آیا ہے اور ایک  
 ایسی خبر اپنے ساتھ لایا ہے جو سقراط سے زیادہ خود اُس کے لیے تکلیف دہ ہے۔ وہ خبر یہ ہے کہ جو جہاز دن کو  
 لیکر واپس آ رہا ہے وہ سونیوم (Sonnium) کہ ایک پہونج گیا ہے اور بہت جلد بندرگاہ پیروس (Piraeus)  
 میں داخل ہونے والا ہے۔ اس کے دوسرے روز سقراط کو شربت مرگ پینا ہوگا۔ کراٹو پھر ایک مرتبہ اپنے  
 عزیز دوست اور استاد کو جگ جانے پر آمادہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کام بہت آسانی سے ہو جائے گا۔ اور  
 اُس کے دوستوں کو بھی ضرر نہ پہونچے گا۔ اور اگر سقراط اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائے گا۔ تو گویا وہ اپنے  
 دشمنوں کی من مانی مراد پوری کیے گا۔ وہ اپنی اولاد کو لاوارث چھوڑ جائے گا اور اپنے دوستوں کے لیے  
 نفسیہ یک ذلت کا سبب بن جائے گا۔ سقراط جواب دیتا ہے کہ ہمیشہ عقل نے اُس کی رہنمائی کی ہے جس کے مقابلہ  
 میں اُس نے عوام کی رائے کی کہیں پروا نہیں کی۔ وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ لوگ کیا کہیں گے لیکن اُس کا  
 بت بہت خیال ہے کہ اس حقیقت پر آمادہ ہونے پائے۔ پس یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طریقہ کا فائدہ  
 منی ہوگا یا نہیں۔ اور کراٹو (Cratilo) دیکھتا ہے کہ سقراط نے اس کے لیے بالکل ایسے



سقراط فیصل کے ساتھ کراچی سے گفتگو کرتا ہے۔ اور اپنے قدیم محاسبہ اور میڈال و جواہر کے طریقہ پر بحث کر کے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر وہ محبس سے نزار اختیار کرے گا تو ملک کو نقصان پہنچے گا۔ ایک ایسا شہر جس کے عام باشندے اپنی مرضی کے موافق عدالتی فیصلوں کو توڑ دیا کریں اور ان کی پروا نہ کیا کریں کبھی بانی

نہیں رہ سکتا۔ اس کی برابری لازمی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کو بلا وجہ حکم سزا دیا گیا ہو گو اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو وہ ان میں خود خراب ہیں یا ان کا استعمال خراب ہے۔ بائیں ہمہ کسی فرد واحد کو عدالت کے مقابلہ میں قانون اپنے ہاتھ میں لینا نہ چاہیے۔ ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ اُس ملک کی خاطر جہاں وہ رہتا ہے اپنی انفرادی رائے اور ذاتی مرضی کی پروا نہ کرے اور سب پر سے اپنی ایک ذات کو قربان کر دے اور مصلحت قائم نہیں رہ سکتی۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد سقراط اپنے دوستوں کو سمجھاتا ہے کہ مجھے یہ بین رہنے اور مرنے دو۔ وہ ایک مظلوم کے مانند دنیا سے جائے گا اور دوسرے عالم میں اُس پر نوازشات ہوں گی جس روز وہند کا جہاز بندرگاہ پر پہنچتا ہے۔ فیڈور Phaedo اور تمام دیگر احباب اُس سے ہی دن صبح بزرگ سے سقراط کے پاس جاتے ہیں۔ اُن کی روایت ہے کہ اعمال محبس میں سقراط کے پاس پہنچاتے ہیں جہاں ابھی ابھی اُس کے بیرون سے بیڑیاں دور کی گئی تھیں اور اس کی بیوی زن تیب (Xanthippe) بیٹھی پاس رو رہی تھی۔ زان تیب (Xanthippe) کو دبان سے ہٹا دیتے ہیں اور سقراط رنج و راحت کے باہمی تعلقات پر گفتگو کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ خود کشی کا ذکر آتا ہے جسے سقراط سخت ناپسند کرتا ہے اور مٹی پر باطل ٹھہرتا ہے وہ کہتا ہے کہ ایک حکیم کو ہمیشہ موت سے محبت کرنا چاہیے۔ مگر خود کشی کرنا درست نہیں۔ فلسفہ کے معنی وہ اصل مطالعہ احوال موت کے ہیں۔ ایک فلسفی کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ جلد اس جہانی قید سے نجات حاصل کر لے۔ اور اپنے مفوض یعنی اس غلام کی حاصل کرے جو سرن موت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں وہ حکمت و دانش سے محبت نہیں رکھتے اپنے جسموں اور زرد مال اور عزت کو درست رکھتے ہیں۔ اُن میں اگر جرات آتی ہے تو ایک بدترشے کے اندیشہ سے اور اعتدال و میانہ روی کو وہ اس لیے پسند کرتے ہیں کہ بے اعتدالی بعض راحتوں اور سامان عیش و نشاط سے روکتی رہتی ہے ایسی صفت کو خیر بانیکی کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے۔ یہ بالکل جھوٹی نیکی اور غلامانہ صفت ہے۔ حقیقی نیکی تزکیہ نفس میں مضمر ہے۔ جو لوگ تزکیہ نفس کر لیتے ہیں وہ موت کے بعد

ٹپے بڑے بزرگوں کی وصیت میں ہو بیچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو سقراط موت سے نہیں گھبرا تا۔ موت اور بقا سے روح کے مسئلہ پر اچھی خاصی گفتگو ہوتی ہے جس کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ بجائے جسم کے روح سے اٹھاؤ پیدا کرے اور موت کا غم نہ کرے کیونکہ موت اس بند سے غلامی کا نام ہے۔ چونکہ وقت تنگ ہوتا ہے۔ لہذا اس لیے اس قدر تفریر کر کے خاموش ہو گیا۔ اور غسل کرنے کے لیے اٹھاتا کہ موت کی تیاری کرے۔ کراٹور (Cleitarchus) استاد سے پوچھتا ہے کہ آپ کی آخری وصیت کیا ہے اور تمہیں دیکھیں کہ طبع کرنی چاہیے۔ سقراط کہتا ہے کہ احباب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اور ان منزل پر پہنچاؤ میں یہ سب کراٹور کو دیکھنے کے بعد غسل کے لیے جاتا ہے اور اپنے بال بچوں سے رخصت ہوتا ہے اس کے بعد بہت کم گفتگو کی نوبت آتی ہے۔ زہر بیکار لایا جاتا ہے اور سقراط استہانت اطمینان سے پی لیتا ہے۔ دوسرے طالب ہدایت ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ خدرا ٹھلو جب پیر بھاری ہونے لگیں تو لیٹ جاؤ سقراط اس کی تعمیل کرتا ہے اور جب اس کے پیر بھاری ہوئے گئے ہیں تو وہ لیٹ جاتا ہے۔ جلاو پیرن کو روکا کر دیکھتا ہے کہ انہیں کچھ جس بات پر یقین اور سقراط سے حال پوچھتا ہے۔ سقراط کہتا ہے کہ کوئی جس نہیں رہا۔ یہی بے بسی اور پرکھ کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ میت روئے کے چند لمحہ قبل اُسے ایک بات یاد آتی ہے اور وہ منہ پر سے چادر ہٹا کر کراٹور کو دکھاتا ہے اس سے کہتا ہے کہ دیکھو اس میں ہوس (Hesperia) کو بیری طرف سے ایک منہ دیدینا اس کے بعد منہ نہ کر لیتا ہے اور شیخ کے سی ایک کیفیت کے بعد روح پرواز کرتی ہے۔ انا شیڈو انا الیہ راجون۔

(۳)

سقراط کے چلے جو حکما تھے وہ لفظ طبیعات اور بعد طبیعات کے دائرہ میں محدود کرتے تھے۔ خدیں نے ان کے سمجھ کو مل کرنا چاہا اور اس کی حقیقت معلوم کرنی چاہی تھی اور اصول ہائے اولین متا ہوا۔ آگ پانی کو دریافت کرنے اور حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ یہ سوال کیا کرتے تھے کہ آتش کیونکر وجود میں آئی ہیں اور کیسے زندہ رہتی ہیں اُن میں فساد کیونکر پیدا ہوتا ہے لیکتا پانچویں صدی قبل مسیح میں لوگوں کو اُن کی تعبیر سے اطمینان مفقود ہونے لگا اس لیے لوگوں نے اُن کی طرف سے بے اعتدالی شروع کر دی۔ سقراط اِنجینس (Socrates) کو سن اسو کی ضرورت تھی وہ بجائے امرار عالم کے امرار نفس اور سائنسی سے تعلق رکھتے تھے لوگ انصاف و ظلم حق و باطل۔ خوب و بدشت کے مابین بحث کرنے لگے تھے اور پوچھتے تھے کہ انصاف، حق اور خوب سے کیا مراد ہے۔ ایک شخص کو انصاف کے مطابق

کب کہتے ہیں؟ درست اور اچھا کتہے ہیں؟ سقراط سے پہلے کے حکما و ارباب سوالات کا جواب نہیں دے سکتے  
 تھے۔ انھیں معاشرت انسانی سے تعلق نہیں رہا تھا بلکہ محض طبیعیات اور فاضلہ طبیعیات میں انہماک رکھنا  
 تھا۔ چونکہ لوگوں کی طبیعت اب ادھر سے ہٹنے لگی تھی اور وہ اخلاقی اور سیاسی بحثوں میں پڑنا چاہتے تھے۔  
 اور سقراطی اُن کا کسی قدر جواب دیتے اور ان بحثوں پر گفتگو کرتے تھے۔ اس لیے اہل اتھینس ہمیشہ سقراطی  
 انھیں تنخواہیں دے دے کر بیرون ملک سے بلاتے اور نوکر رکھا کرتے تھے۔ مگر اس وقت ہمیں سقراطیوں  
 کے فلسفہ کی تصحیح کرنی مطلوب نہیں ہے۔ اس لیے اُن کی تعلیم کی بھلائی بُرائی کسی کا ذکر کرنا نہ چاہیے۔ صرف  
 اننا ضرور کہا جانا ہو کہ جس اخلاق کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ اُن پریشان خیالات اور مضامین و تصورات اور  
 بے جوڑ سیاسی مسائل پر مشتمل تھی جن کا اتھینس (Athens) میں چہچہا ہو رہا تھا۔ اور بہت سی  
 معمولی معمولی غیر مربوط و عجیبہ باتوں کی تصحیح و تدقیق کی سخت ضرورت تھی کہ راج سے لوگ راہِ راست پر آئیں  
 یہ ایسی شدید ضرورت تھی کہ اُس کو رفع کرنے کے لیے خدا نے تعالیٰ نے سقراط کو بھیجا جس نے ہر ایک سے  
 محاسبہ کرنا اور اُس کے خیال کی تصحیح کرنا اپنا فرض منصبی قرار دیا اور آخر عمر تک اسی کام میں منہمک رہا۔  
 اُس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو حق بات کی تیز حاصل ہوتا کہ اسی حق کی معیار پر تمدنی اور سیاسی قابلیت کو  
 جانچا جائے اور ملک میں غلط اور باطل کو صحیح اور حق کے پردہ میں فروغ نہ حاصل ہو۔ سقراطیوں کو اندازہ  
 اُس شخص سے مطابقت دیتا ہے جس نے تجربہ سے ایک عظیم الشان اور خطرناک جانور کے مزاج اور ضرورتوں  
 کو سمجھ لیا ہو اور یہ جان لیا ہو کہ کس وقت اُس کے قریب جانا چاہیے۔ اور کس چیز سے اُسے غصہ آتا اور کس  
 شے سے وہ راضی ہوتا ہے اور اُس کی مختلف آوازوں کے کیا معنی ہیں۔ اس علم کو حاصل کر کے وہ شخص یہ دعویٰ  
 کرتا ہے کہ یہی حکمت اور دانش ہے۔ اور اُس کو ایک فن بنا کر تعلیم دینا شروع کرتا ہے جس شے سے جانور راضی  
 ہوتے ہیں اُس کو وہ حق بتلانا ہے اور جس سے وہ ناراض ہوتے ہیں اُسے باطل قرار دیتا ہے۔ اور یہ بالکل نہیں  
 جانتا کہ اُس کی کون سی خواہش اور ضرورت واقعی درست ہے اور کون سی نادرست۔ اسی کی تعلیم کے لیے  
 سقراط دنیا میں آتا ہے۔ سقراطیوں کی طرح وہ بھی اخلاقی اور سیاسی مسائل سے بحث کرتا ہے۔ زینون (Zeno of Elea)  
 کہتا ہے کہ سفر ہمیشہ ان امور پر گفتگو کیا کرتا تھا جو آدمیوں سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ پوچھتا رہتا تھا کہ  
 زہر و آغوش کس کا نام ہے۔ رندی و خزانہ کسے کہتے ہیں؟ شریفانہ بات سے کیا مراد ہے؟ کمینگی کسے کہتے ہیں؟  
 انصاف کیا شے ہے؟ بے انصافی کسے کہتے ہیں؟ اعتدال اور میانہ روی سے کیا مراد ہے؟ دیوانگی و جنون کیا



شے ہو؟ جرات کیا ہو؟ بُردلی کیا ہو؟ لک درِ راست کیا ہو؟ مَدبر کسے کہتے ہیں؟ حکومت کس کا نام ہو؟ انسان کو حکومت کے قابل کون شے بناتی ہو؟ وغیرہ وغیرہ جو لوگ ان سوالوں کا جواب دے سکتے تھے انھیں وہ اچھے لوگ کہتا اور جو جواب نہ دے سکتے انھیں کہتا کہ یہ غلاموں سے بہتر نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ حکماء متقدمین اشیائے فطرت انہماک رکھتے تھے۔ اور سقراط خود انسان سے گفتگو کرتا تھا جس شے کے متعلق کہ سقراطی فلسفہ قاعدہ اور صورت بتا کر لگ ہو جانے لگے۔ سقراط اس کی اصلاح کرنا چاہتا تھا جسے اس زمانہ میں لوگ علم کہا کرتے تھے۔ سقراط اس کی خرابیوں اور لغویوں سے خوب واقف تھا۔ وسیع لفظی الفاظ مخصوص معنوں میں لے جانے لگے تھے اور وسیع مفہوم کے لفظ کو ایسے الفاظ کے بجائے استعمال کیا کرتے تھے جن کے معنی کا میدان تنگ ہوا کرتا تھا۔ فردا و حبس کے لیے الفاظ میں تیز باقی نہیں رہی تھی۔ اور سقراط لیس کا بیان ہر کہ سقراط کی طرت دو شے مسوب کی جاسکتی ہیں۔ ایک تو طریقہ استفادہ دوسرے اصطلاح عامہ کی مراد۔ اس کے پہلے تک وہ الفاظ جو ردِ مزہ معمولی معمولی مفہوم کے لیے استعمال ہوتے تھے واضح اور محدود معنی کے ساتھ مخصوص نہ تھے۔ جو شے اُن کے برسوں کے جذبات شاعری اقتدار و دلایا سے پیدا ہو گئی تھی اس کی اصلاح عقل بدر کرنے اُس وقت تک نہیں کی تھی۔ شعرا خود اپنے نظموں کی تفسیر نہیں کر سکتے تھے۔ صاحبان فن یہ دعویٰ رکھتے تھے کہ چونکہ انھیں فن کے شائق بہانی علم حاصل ہو۔ اس لیے دیگر اہم امور میں بھی انھیں واقفیت ہو۔ کوئی بلکہ ایسا نہ تھا کہ لوگ دعویٰ نہ کرتے ہوں کہ ہمیں خاصاً علم حاصل ہو۔ درنحالیکہ وہ بالکل جاہل ہوتے تھے اور سقراط کی تحدید و محاسبہ کو بے ضرورت ٹھکانی کہا کرتے تھے۔ غرض کہ جن اصول پر سقراط اُن کی اصلاح کرنا چاہتا تھا وہ

(۱) ایسی تغایر پر مشتمل تھیں جنہیں دانش و حکمت کے عیار پر جانچ لیا گیا ہو اور عقل انھیں قبول

کرتی ہو۔

(۲) جن کے معلوم کرنے کے لیے لوگوں کے علوم کی تنقیح اور محاسبہ کی سنت ضرورت تھی۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ان کی جہالت کے جہل سے بیدار کیا جائے اور ان کی خامیوں کو اُن کے سامنے اُنھیں سے تسلیم کرا کے پیش کر دیا جائے۔

سقراط کی تعلیمات میں جو سبب بارہ شے نمایاں تھیں وہ اُس کا سخت نہ ہونے کا تھا۔ افلاطون کہتا ہے کہ اس کی تمام خصوصیات طبع پر گہرا اثر نہ ہو سکا تھا۔ اُس کے نزدیک مذہب کا مفہوم بہت پستی

یادوتاؤن کا سلسلہ نہیں تھا۔ یونانی دیوتاؤن کے افسانوں میں جو لفظ ہے یٹین ہین انجین دوست  
 ناپسند کرتا تھا۔ جس وقت لوگوں نے اُسے پر الزام دیا کہ ایتھنس (Athenas) کے دیوتاؤن کو وہ  
 نہیں ماننا تو گواہوں نے لمحہ ہونے سے قطعی انکار کیا مگر ان کے دیوتاؤن کو ماننے کا بھی اقرار بھی نہیں کیا۔  
 اس کے جواب الزام کے آخری الفاظ یہ تھے :-

اہل ایتھنس (Athenas) میں خدا کو بیشک مانتا ہوں اور اسی طرح مانا کرتا ہوں جسے

میرے رام دینے والے اپنے دیوتاؤن کو مانا کرتے ہیں اور تمہارے اور تمہارے خدا کے  
 پر زمین اپنے معاملہ کو کرتا ہوں جو کچھ تمہارے اور میرے لیے سب سے بہتر ہو وہ تصنیف کردہ

مقرض کا خدا ہی تھا جو افلاطون کا تھا۔ اس کی نعمت خیر جزا و ردہ تمام خیر کا منبع ہے۔ وہ خدا  
 جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ عزت خدا ہی کی ذات سب اشیاء کی دانا بناتا ہے۔ وہ خیر کی شر سے محافظت کرتا ہے۔  
 وہ انسانوں پر اپنی مرضی لسانہ غیب کے ذریعہ نظر ہر کرتا ہے۔ اُس کے احکام و قوانین سب سے بالاتر ہیں  
 اور ہر طرح ان کی اطاعت کرنی چاہیے۔

مقرض حکمت و دانش کی تلاش اس لیے کرتا ہے کہ خدا سے اُسے اس کام کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس کام  
 کو وہ ہمیشہ خدا کے ہم کے نام سے یاد کرتا ہے جسے ہر منزل کا مقابلہ کر کے انجام دینا چاہیے۔ اور جس کی راہ سے اُسے  
 پھیرنے والا نہ خون ہو سکنا ہے اور نہ خطرہ۔ اہل ایتھنس (Athenas) کو وہ مخاطب کر کے کہتا ہے کہ  
 مجھے تمہاری بڑی خاطر منظور ہے اور تم سے بڑی محبت کرتا ہوں لیکن اطاعت خدا ہی کی کروں گا۔ تمہاری نہیں  
 اور اسی اطاعت اگلی میں اُس نے جان دے دی۔

مقرض یہ سمجھتا تھا کہ اُسے خدا کی طرف سے ایک قسم کا پیام برہان ربانی کے ذریعہ پہنچا رہتا  
 ہے اس برہان کو ایک جگہ وہ خدا کی آواز کہتا ہے جو بچپن سے اس وقت تک اس کے ساتھ ہے اور ہمیشہ اسے  
 چھوٹی سی چھوٹی باتوں میں بھی تنبیہ کرتی رہتی ہے۔ یہ آواز ہمیشہ استماعی ہے اور بعض افعال سے باز رہتی ہے  
 یعنی جس شے کو خدا چاہتا ہے کہ یہ نہ کرے اُسی برہان کے ذریعہ سے منع کر دیتا ہے اور اگر یہ چاہتا ہے کہ یہ کرے  
 تو اُس طرف سے خاموش رہتا ہے اور کوئی مانع نہیں ہوتی یہ ”برہان ربانی“ اُسے لوگوں سے محاسبہ کرنے  
 سے منع نہیں کرتی۔ اور وہ اس کام سے باز بھی نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کہ خدا سے جل و مال کی کام عدوں

ہوں رینوفن (Xenophon) کو اپنے استاد سے باطنی کچھ حصہ نہیں ملتا۔ اس لیے وہ اسے سمجھ نہ سکا اور اس کی یہ تاویل کرنے لگا کہ تو فیصلہ کوئی الفور کام میں لاسے کی یہ ایک نوی استعداد تھی جو شیار کے علم پر مبنی اور تجربہ کی بنیاد پر پختہ ہو گئی تھی۔ اور بغیر آگاہی سلسلہ ملت و معلول و اظہار واسطہ و بیانی کے نتیجہ پر پہنچا دیا کرتی تھی لیکن اندھون جیسے استاد سے باطنی دولت بھی مل تھی خاموش رہتا ہر در اس کی تاویل کرنے سے گریز کرتا ہے۔

سفر اکتاہر کہ ہین بدی کا عوض بدی سے نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے ہمعصر اس قسم کے خیالات کو حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یونانیوں کا اصدق یہ تھا کہ اپنے دوستوں سے بھدالی کرو اور اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچاؤ۔

سفر اکتاہر بدی کا عوض بدی کرنے کو نادرست کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے جب بدی کرنا بجائے خود درست نہیں ہوگی صورت میں اسے درست نہیں کہہ سکتے۔ وہ اپنے ہل وطن سے کہتا ہے کہ:-

”میں تمہیں خدا کا گد کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہوں مجھے اگر مرمت لگاؤ اور زمین جو تمہارے لیے انعام اکسی ہوں مجھے رست گرد۔ اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو میرا جانشین آسانی سے مل سکے گا۔ خدا نے تمہارے شہر میں مجھے بھیجا ہے اگر تمہیں خواہش نفسانی ہوتی ہے کیا کہ سب انسانوں میں ہو ا کرتی ہو تو میں اپنے ذاتی نقص و نقصان کے قانون کی طرف سے غفلت نہ کرنا۔ اور اپنے خانگی کاموں کو اتنے سال تک برباد نہ دیتا۔ مجھے تمہارے کام میں ہمہ وقت مشغول رکھا ہر زمین تہمین سے ہر ایک کے پاس باپ ایسے بھائی کی طرح جاتا ہوں۔ اور خیر و صلاح کی طرف مائل کرتا ہوں مجھے خدا کی طرف سے ایک بُرا ہن ربانی عطا ہوا ہے۔ اس خدا کے بیسیڈوس (Saviour) اتھینک کرتا ہے یہ بُرا ہن برے ساتھ بچپن ہے ہر یہ ایک قسم کی آواز ہے جو میں سنتا ہوں اور کچھ میں اس وقت کرتا ہوں اگر نا مناسب ہو تو اس سے مجھے روک دیا کرتی ہو۔ لیکن کسی کام کے کرنے کا حکم نہیں دیتی۔ یہی آواز مجھے سیاست میں دخل دینے سے روکتی رہتی ہے۔ اتھینس (Athens) والوں کو دشمن سے میرے حالات سن لو تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ کون شخص ایسا نہیں ہے جو موت کا ڈر ادا کر اٹل کے از کتاب پر مجھے مائل کرے۔ میں مرنا نہیں چاہتا لیکن بالکل پرانی ہونا پسند



نکروں گا۔ وہ کہتا ہر کہ موت کوئی بڑی شے نہیں ہر کہ ایک طور پر دیکھیں تو اچھی شے ہر کہ موت کی حالت دو حال سے خالی نہیں باتوہست بالکل معدوم ہو جائے گی۔ اور تمام احساسات بطل ہو جائیں گے یا وہ ہر جیسا کہ عام طور پر لوگ یقین کرتے ہیں کہ موت سے روح کا ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونا مراد ہے۔ اگر موت سے تمام احساسات کا بطلان مراد ہے اور وہ اس منہ کے اندر ہر کہ کسی خواب سے پریشان نہیں ہوتی تو یہ ایک عجیب نفع کی چیز ہے اگر کوئی کسی ایک رات کو کہے کہ میں اس شب کو اس طرح سو یا کہ کوئی خواب نام نہین نظر آیا اور اس شب کے مقابلہ اپنی زندگی کے دوسرے راتوں سے کرے اور پھر اس سے پوچھا جائے کہ اس رات سے زیادہ پُر فرحت تم نے کون سا دن یا رات بسر کی ہر کہ تو میرا خیال ہے کہ کیا راہ اور کیا پرنا سب ہی اُسی رات یا اس قسم کی دوسری راتوں کو آسانی سے شمار کر کے بتلا میں گے۔ اگر یہی معنی موت کے ہیں تو میں اُسے ایک نفع سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر موت کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرنے کے ہیں اور عام عقیدہ صحیح ہے کہ جبکہ لوگ آپت میں سب اس دوسرے مقام میں موجود ہیں تو اس سے زیادہ بھلائی میرے لیے اور کیا ہو سکتی ہر کہ میں ایسی موت دوزخ مرتبہ مرے کو تیار ہوں جو مجھے دوزخ پہنچا دے جہاں بڑے بڑے سب لوگ موجود ہیں اور میں اُن سے ملاقات کر کے علم حاصل کر سکوں۔ وہ کہتا ہر کہ خدا خدا سے پیدا ہوا کرتا ہوں۔ اس لیے زندگی سے موت پیدا ہوتی ہے۔ اور موت سے زندگی۔ ہمارا تمام علم ان باتوں کے ایک قسم کی یاد ہے جو کسی زمانہ سابق میں ہمیں معلوم تھیں۔ پس ہماری ارواح ضرور اس دنیا میں داخل ہونے سے پہلے زندہ رہی ہونگی۔ روح پر سبب جسم کے کم فساد پذیر ہر کہ جسم بھی اگر اُسے محفوظ کر کے رکھ دیا جائے تو صدیوں تک خراب نہیں ہوتا۔ اور اُس کے بعض اجزاء مثلاً استخوان قریب قریب ہمیشہ باقی رہا کرتے ہیں جب جسم کی یہ حالت ہے تو روح کب موت کے بعد فنا ہو سکتی ہے۔ وہ ہر کہ فنا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے سامعین سے غی طرب ہو کر کہتا ہر کہ آپ سب تصورات مجرؤ کے وجود کے قائل ہیں۔ سقراط کے خیال میں یہ تصورات مظاہر قدرت کے اسباب ہیں اشیاء جمیل کا سبب جمال ہے۔ اور اشیاء عظیم کا سبب عظمت ہے۔ دوسرا غائی ذہن۔ جو تصورات ایک دوسرے کے تضاد میں ایک ہی شخص میں وقت و صدمین موجود نہیں رہ سکتے۔ اگر کہہ جائے

کے سیاسی (Sennas) لمبا اور چھوٹا دونوں ہر اس لیے کہ وہ مجھے (یعنی خود قرائت) لمبا اور فیڈور (Phedro) سے چھوٹا ہی تو کہا جائے گا کہ یہ دونوں متضاد صفتیں متقابلہ جمع ہوئی ہیں۔ ایک کے مقابلہ میں وہ لمبا ہو اور دوسرے کے مقابلہ میں چھوٹا۔ چھوٹا اور لمبا دونوں ایک ہی کے مقابلہ میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نظریہ پر اگر مزید نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ ایک تصویر ہی نہیں کہ اپنے متضاد تصور کے ساتھ رہنا پسند کرے گا۔ بلکہ جو اشیاء متضاد تصور ہزاروں انہنگ ہیں ان کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں کریں گے۔ مثلاً سردی کا ضد گرمی ہے سردی جس طرح گرمی کی برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی طرح وہ آگ کی بھی برداشت نہیں کر سکتی جو حرارت کا جزو انہنگ ہے۔ ایک ہی شے میں حرارت و برودت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں یہ حالت زندگی کی ہر جو موت کی ضد ہر حیات شروع و دونوں بہم جزو انہنگ ہیں پس روح اور موت کا ساتھ کہیں نہیں ہو سکتا اور روح کو کبھی موت نہیں آ سکتی۔ وہ مازوال ہر ایک غیر قابل فساد ہے جب ایک شخص مر جاتا ہے تو اس کی روح محفوظ و موت جسم مٹ جاتی ہے۔ یہاں تک بیان کر کے پھر سفر اظہار پوچھتا ہے کہ جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ روح جسم کے بعد بچ رہتی ہے تو اس کی طرف سے غفلت کرنا کتنا خطرناک کام ہے۔

روح را توحید الدن خوشتر است      غیر ظاہر درست پسے دیگر بہت

موت را دین بدتر پسے کد بار      منع باشد نفس بس بفرار

باش تا مرغ زر نفس آید بردن      تا پہنی بہت چرخ اور از بون حامد علی

(نایب ناظم عدالت راجیہ)

(الناظر، فروری ۱۹۲۲ء)

# جمہوریہ فلاتون

فلاسفہ یونان کے ستراتج فلاتون کے یہ کلامات جو جمہوریت کے نام سے موسوم ہیں، اُس کی تصنیف میں خاص طور پر متنازع ہیں۔ ہمارے کرم جناب مرزا محمد عسکری صاحب نے لکھنؤ کے سکریٹری ان کو اردو کا لباس پہنا شروع کیا ہے۔ اور نوٹوں کے طور پر کچھ اوراق بھی عنایت فرمائے ہیں۔ اگر یہ ترجمہ اہل نظر نے پسند کیا تو اسید بت کہ ماہ کتابی سہرت میں شایع کیا جاسکے گا۔

ایڈیٹر

## مقالہ اول

شریک مکالمہ :- سقراط (Socrates) گلوکان (Glaucan) پولیمارکوس (Polemarchus) ادیمانتوس (Ademantus) کفائوس (Cephalus) قرائینا کوکھ (Thrasymachus) کلائٹون (Clitophon)

سقراط = س، گلوکان = گ، پولیمارکوس = پ، ادیمانتوس = ا، کفائوس = ک، قرائینا کوکھ = کل

میں کل، سقراط (Socrates) کے بیٹے گلوکان کے ساتھ پیرپوس (Peripos) گیا تھا کہ دیوٹی کے مندر میں دعا مانگوں اور یہ بھی خواہش تھی کہ پھر وہ سیلہ و کیوں جو دیوی کے نام سے پہلی مرتبہ وہاں ہونے والا تھا۔ اہل اتیمنز (Atimenz) کے جلیوس کو دیکھ کر میں بہت

سہ اتیمنز سے بہت قریب واقع ہے اور عرصہ قدیم سے یونان کا ایک مشہور بندرگاہ ہے۔ اتیمنز اور پیرپوس کے درمیان دو لمبی لمبی دیواریں واقع تھیں جنکے نشانات اب بھی کچھ باقی ہیں۔ زمانہ قدیم میں پیرپوس یونان کے بہت سب لوگوں اور نیز غیر ملکی افسانوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اب بھی یہ ایک مختصر ماہر گاہ اور تجارت کی

منڈی ہے۔

سہ یہ دیوی ناٹا آڈیس یا ڈائنا تھی میں کو اہل دیوات اور شکاری لوگ بہت اتے تھے۔



خوش ہوا، مگر تھریس والوں کا جلوس بھی میرے نزدیک کچھ کم شاندار نہ تھا۔ ہم دونوں آدمی دیوی سے دعائیں مانگ کر اور سیلہ کی سیر کو کے شہر کو واپس آنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ پولیوار کوس، کٹالوس کے بیٹے نے ہم کو دوسرے دیکھ لیا اور ایک آدمی دوڑایا اور ہم سے تھرتے کو کہا۔ آدمی نے پیچھے سے آکر سیر، جتہ پکڑ لیا اور کہا کہ پولیوار کوس کہتے ہیں ذرا ٹھہر جائیے۔ میں نے پوچھا پولیوار کوس کہاں ہیں۔ آدمی نے اشارہ سے بتلایا کہ وہ پیچھے آ رہے ہیں۔ ہم دونوں ان کے انتظار میں ٹھہرے رہے یہاں تک کہ پولیوار کوس اور ان کے ساتھ گلوکان کا بھائی اریستیس، اور کیا (مصنوعہ) کا بیٹا کرٹوس (مصنوعہ) اور چن اور لوگ بھی جو جلوس سے واپس آ رہے تھے ہم تک پہنچ گئے۔

پولیوار کوس نے فوراً پوچھا، "اگر میں نکلے نہیں کر رہا ہوں تو سترہ پ کا ارادہ شہر کی دیہی کا ضرور ہے؟"

میں نے جواب دیا، "تھارا خیال غلط تو نہیں ہے؟"

"انہوں نے کہا،" ہمارے ساتھیوں کی کثرت کو کیا آپ نہیں دیکھتے؟"

میں نے کہا، "بیشک میں دیکھتا ہوں۔"

انہوں نے کہا، "تو پھر یا تو اپنے تئیں ہماری جماعت سے پ قوی تر ثابت کیجیے، یا ہمارا کہنا

آپ کو ماننا ہوگا؟"

میں نے جواب دیا، "نہیں، ایک تیسری صورت بھی ممکن ہے یعنی ہم تم کو سمجھا بھجا کر رہنی کر لیں۔"

انہوں نے کہا، "یہ کیوں ممکن ہے کہ ہم آپ کی کچھ نہ سنیں اور پھر بھی رہنی ہو جائیں۔"

گلوکان نے کہا، "بیشک یہ ممکن نہیں۔"

پولیوار کوس نے کہا، "تو اب یقین کر لیجیے کہ ہم آپ کی اس سلامتی میں ایک نہ سنیں گے۔"

اریستیس نے کہا، "کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ج رات کو دیوی کے اعزاز میں گھوڑوں پر مشل

کی دوڑ ہوگی؟"

میں نے متعجب ہو کر پوچھا، "گھوڑوں پر مشل کی دوڑ؟ — یہ واقعی قابل دید ہوگی۔"

کیا سوار ہوگ اپنے ہاتھ پر مشل لیں گے اور ایک دوسرے کو دیتے جائیں گے اور گھوڑا دوڑاتے

جائیں گے؟ یہ نہیں تو پھر کیا ہو رہا ہے؟"

پولیوار کوس نے جواب دیا، "آپ کا خیال صحیح ہے۔ اس کے علاوہ رات گئے ایک قابل دید

سیاہ ہو گا۔ ہم سب کھانے سے فراغت کر کے اُسکو دیکھنے چلیں گے اور وہاں اکثر اپنے نوجوان دوستوں سے ملیں گے اور مزے کی باتیں رہیں گی۔ اس لیے میں باہر نکلتا ہوں کہ آج رات کو آپ یہیں رہ جائیے اور ہماری اس درخواست کو نامتطور نہ فرمائیے۔“

گلوکان نے یہ سُن کر میری طرف دیکھا اور کہا ”ایسی صورت میں ہمارا ٹھہرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔“

میں نے جواب دیا: ”اگر تمہاری یہی رے ہے تو کیا مضائقہ ہے۔“

اس قرارداد کے بعد ہم پولیوارکوس کے ساتھ اُنکے گھر گئے جہاں اُن کے دونوں بھائی لایسیاس (Lysias) اور یوتھنیڈیوس (Euthenydemos) اور تھراسیماکوس باشندہ کلسڈون (Chalcedon) اور کارمنٹی ڈیر (Karmantides) اور ارستائوس (Aristos) کا لڑکا کٹائٹوفون یہ سب لوگ موجود تھے۔ پولیوارکوس کے والد کفالوس سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ میری رے میں یہ بہت ہلچل مچ گئی تھی اور میں نے اُنکو ایک عرسہ دراز کے بعد دیکھا تھا۔ وہ ایک گدے دار کرسی پر آرام سے بیٹھے تھے اور اُنکے سر پر ایک اہلٹا ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ مزدور کے فارغ ہوئے تھے۔ اُنکے قریب ہر دو جانب بتیں پڑی تھیں جن پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ کفالوس نے مجھ کو دیکھ کر دنا دی اور کہا۔

”سقراط! پیرویوس میں تو تم بھولے سے بھی نہیں آتے۔ تم کو چاہیے کہ جلد چلے جا کرو۔ اگر مجھ میں شہرت تک پیدل چلنے کی قوت ہوتی تو تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی میں تم سے اکثر ملتا رہتا۔ مگر حالت موجودہ میں تم کو آنا چاہیے۔ یقیناً جاؤ کہ جہاں سرتوں کے انحطاط سے علیحدہ گفتگو اور نہ کردہ کا شوق مجھ کو اُسی نسبت سے اور بڑھ گیا ہے اور اب اُسی میں بہت سرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے میں تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ایک بے نکتہ دوست کی طرح جلد چلے جا کر دتا کہ ان نوجوانوں کو تمہاری صحبت اور گفتگو سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہو۔“

”سچ یہ ہے کہ مجھ کو خود معمر اشخاص سے باتیں کرنے میں بہت لطف آتا ہے، اس وجہ سے کہ جس شاہ راہ پر وہ ہم سے پہلے جا چکے ہیں اُس پر بہت ممکن ہے ہم کو بھی پہنچا ہو، تو ہم کو چاہیے کہ اپنے پیشروں سے راستہ کی پوری کیفیت کہ آیا وہ آسان ہے

یا دشوار گزار اور زیادہ ہموار ہے یا ناہموار اور خطرناک، وقتاً فوقتاً پوچھتے رہیں تاکہ ہماری معلومات اُسکے متعلق وسیع ہوتی جائیں اور چونکہ اب آپ عمر کے اُس حصہ پر پہنچ گئے ہیں جس کو ہمارے شاگرد استاد عمر سے تعبیر کرتے ہیں لہذا آپ سے پڑھ کر کون شخص اس رائے دینے کا مستحق اور موردوں ہو سکتا ہے اچھا یہ فرمائیے کہ اس عمر میں زندگی آرام دہ ہے یا تکلیف دہ؟

ک۔ "سقراط! میں اپنا ذاتی تجربہ تم سے معذور بیان کر دوں گی۔ میں اور میری طرح کے بعض اور معمر اشخاص اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اکثر ہم میں گزشتہ ایام جوانی کو یاد کر کے سخت افسوس کرتے ہیں۔ شباب کی عشق بازیوں، اونٹوش کی محفلیں، احباب کی دعوتیں اور جلسے، گویا یاد آتے ہیں اور اُنکے دلوں پر سائب لوٹ جاتا ہے۔ اُنکے نزدیک زمانہ شباب گویا ایک حق بات جس کا چھین جانا اُنکو سخت ناگوار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ اُس وقت زندگی زندگی تھی اور اب موت سے بدتر ہے۔ بعض بوڑھوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ چونکہ اُنکے جوان عزیز اُن کی کمزوریوں کا مصداق اُڑاتے ہیں اس وجہ سے بڑھاپا نہایت بڑی اور تکلیف دہ چیز ہے۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے مزاج کی ناگفتگوئی کا اصلی سبب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اگر اس کا سبب بڑھاپا ہوتا تو یہ شکایتیں مجھ کو اور کئی لوگوں کو جو اس سن کو پہنچ گئے ہیں معذور محسوس ہونی چاہئیں مگر امر واقعی یہ ہے کہ میں بہت سے ایسے کبیرا سن اشخاص سے مل چکا ہوں جنہوں نے اپنے مزاج کی کیفیت اس سے بالکل مختلف بیان کی۔ مثلاً ایک مرتبہ (Sophocles)

سوفوکلز شاعر سے ایک بحث میں میں بھی موجود تھا، کسی نے پوچھا "کو سوفوکلز عشق بازی کے اب بھی قائل ہو یا نہیں؟" جواب دیا "بھلا شہ مجھ کو اُس سے نجات مل گئی اور

میں بہت بڑا شاعر اور ذکاوت والا تھا۔" اور بعد ازاں نہایت مسین دیا، خدق اور نیک مزاج شخص تھا اُسکے سات ڈھائی سو برس ہو چکے تھے۔ پانچ سو سالوں (Aeschylus) اور پچیس سو (Euripides) سے بہت بڑا اور مشہور ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اشع کے اقوال وار پر دے اُسی کی ایجاد ہیں۔



اب میری وہی حالت ہے جیسے کوئی شخص کس دلو سے اور بے رحم آقا کے پیچھے سے  
 نکل کے خوش ہو۔ "میرے نزدیک سفو کلیر کا یہ مقولہ بالکل سچ ہے کیونکہ بلاشبہ بڑھاپے  
 میں عشق اور اسی لہجہ کے دوسرے جذبات سے نجات مل جاتی ہے اور دل کو سکون اور  
 اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ جب بڑھاپے میں خواہشیں کم ہوتی ہیں اور ان کا زور کھٹ  
 جاتا ہے اُس وقت سفو کلیر کے مقولہ کی صحت معلوم ہوتی ہے اور بے شک نظر آنے لگا آ رہی  
 کہ کسی کو دیوانے اور ظالم ناکوں سے چھٹکارا مل گیا۔ مگر بڑھاپے کی شکایتوں اور نوجوان  
 اعزاء کے طغیانی کا دوسرا سبب ہے جس کو سن سے کوئی تعلق نہیں بلکہ خود آدمی کے مزاج  
 سے تعلق ہے۔ اگر لوگوں کو اپنے دلوں پر قابو اور مزاجوں میں ہماری ہو تو بڑھاپا بالہ  
 کوئی ناقابل برداشت چیز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو میرے نزدیک ایسے  
 آدمیوں کی جوانی بھی تکلیف سے خالی نہیں ہو سکتی۔"

[مجھے کوٹھالوس کی یہ باتیں بہت پسند آئیں۔ اور اس خیال سے کہ وہ اپنے خیالات اور زیادہ  
 مشرقی طور پر ظاہر کریں میں نے کہا]

س "مگر ممکن ہے اور لوگ اس معاملہ میں آپ کے ہم خیال نہ ہوں، در کہیں کہ آپ کی دولت نہ  
 کہ آپ کا مزاج آپ کو اس سن میں مطمئن رکھتا ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ دولت سے بہت  
 سے اطمینان حاصل ہوتے ہیں۔"

ک۔ سچ ہے۔ اکثر لوگ میرے کہنے کا یقین نہیں کرتے اور میرے نزدیک ان کا خیال بھی  
 کسی قدر ٹھیک ہے نہ کہ اُس حد تک بڑا کہ وہ سمجھتے ہیں۔ مجھے کو اس موقع پر تھیمسٹاکلیر (Thymistocleas)  
 کا جواب یاد آ گیا جو ایک باشندہ سر نفوس (Serinofos) کو اُس نے دیا تھا جس نے تھیمسٹاکلیر سے طنز سے کہا کہ تمہاری شہرت تمہاری لیاقت کی  
 طرف سے بڑی حد تک ہے۔ اور جب ایرانی درہ قراچی (The Persian Empire) کے متعلق میں نے

۲۰۵ء تا ۲۶۰ء قبل مسیح۔ ایتھنز کا مشہور سیاست دان گذرا ہے۔ اس نے ایرانیوں کے مقابلے میں یونان  
 کی طرف سے بڑی جدوجہد کی۔ اور جب ایرانی درہ قراچی (The Persian Empire) کے متعلق میں نے

پارکرتے اور قریب تھا کہ پورا ملک فتح کر لیں تو مشہور فیملیوں نے ایرانی سلاطین  
 (Sakam) اسی شخص کی عقل اور جلی تدابیر کی بدولت یونان میں نے جیت لی جس سے ایرانیوں کا  
 نام ایک گیری کی جوس کا خاتمہ ہو گیا۔ تھیمسٹاکلیر نہایت ہوشیار اور لائق جرنیل تھا اور اسی کی کوششوں سے یونان  
 ایرانیوں کی دست برد سے بچ گیا۔ مگر لہجے بھی مشہور تھا۔

وجہ سے نہیں بلکہ تمھارے ملک کی وجہ سے ہے۔ جواب دیا میں کبھی مشہور نہ ہوتا اگر میرے رفیقوں کا دبسنے والا ہوتا اگر تم بھی کبھی مشہور نہ ہوتے۔ اگر تم امتیاز کے باشندے ہوتے، اسی طرح وہ لوگ جو دولت مند نہیں ہیں اور بڑھاپے میں مزاج کے چڑچڑے ہو جاتے ہیں ان کی سمیت صحیح طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ممکن ہے کہ ایک نیک شخص بجا است انما س بڑھاپے میں خوش اور مطمئن رہ سکتا ہو اسی طرح ایک شخص کو دولت کبھی بھی یقیناً اور سکون قلب نہیں بخش سکتی۔

س۔ ”اچھا یہ تو بتائیے، یہ آپ کی جائیداد موروثی ہے یا کسویہ؟“  
 ک۔ ”سقراط۔ تم یہ پوچھتے ہو کہ میری جائیداد میری ذاتی کوششوں سے حاصل کی ہوئی ہے یا بزرگوں سے وراثت میں ملی ہے۔ اسی صورت پر ہے کہ اپنی جائیداد اور روپیہ پیسے کے معاملات میں اپنے دادا اور پتے پاپ کے درمیان میں واقع ہوا ہوں۔ یعنی میرے دادا نے جنکا نام بھی وہی تھا جو میرا بچا وہ کل جائیداد حاصل کی تھی جو اس وقت میرے پاس ہے اور اسکے سوا اور بھی ایک بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ مگر میرے والد نے جن کا نام نائسیانیاں (Nesians) تھا، پوری جائیداد کو تلف کر کے اس سے بھی بہت کم چھوڑا جو اس وقت میرے پاس موجود ہے۔ اب میری خواہش اور تمنا ہے کہ اپنے بعد اپنے لڑکوں کے واسطے کم سے کم اسی قدر چھوڑ جاؤں جو مجھ کو اپنے باپ سے وراثت ملا تھا اگر اس سے زیادہ نہ چھوڑوں۔“

س۔ ”یہ آخری سوال میں نے آپ سے اس وجہ سے پوچھا تھا کہ میرے نزدیک آپ روپیہ کے بہت زیادہ شائق نہیں معلوم ہوتے جیسا کہ ان لوگوں کا حال ہوتا ہے جو جائیداد کو خود نہیں پیدا کرتے۔ اور برعکس اسکے وہ لوگ جو اپنے وقت بازو سے حاصل کرتے ہیں اپنے اسباب کے نسبت اور لوگوں کے بہت زیادہ کر دیا ہوتے ہیں۔ جس طرح شاعر اپنی تصانیف سے اور باپ اپنی اولاد سے اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ مانوس ہوتا ہے اسی طرح کاسب زرا اپنے روپیہ کو اور دوس کی بہ نسبت زیادہ چاہتا ہے۔ روپیہ کے مفید ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ خود اس کی کوششوں سے پیدا ہوا ہے۔ اور وہی وجہ ہے کہ ایسے شاعروں کی گفتگو دلچسپ نہیں ہوتی کیونکہ یہ موقع ادبیات اپنے محاصل کی تعریف کیا کرتے ہیں۔“

ک "یہ بالکل سچ ہے۔"

س "جی ہاں۔ اچھا ایک اور بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ دولت سے آپ کے نزدیک سب سے بڑا نفع کیا حاصل ہو سکتا ہے؟"

ک "میرے جواب سے ممکن ہے اکثر آدمی اتفاق نہ کریں مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ حسب آدمی کو اپنی موت کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ ان چیزوں سے بہت خائف و مضطرب ہونے لگتا ہے

جن سے وہ پیشتر کبھی خائف اور مضطرب نہ ہوتا تھا۔ اب تک وہ اس قسم کی باتوں کو

شک جو کوئی اس عالم میں کوئی گناہ کرے گا اسکو دوسرے عالم میں اس کی پاداش میں

شرر سزا ملے گی، محض ڈھکوسل سمجھتا تھا اور ان پر ہنستا تھا۔ مگر اب اس کے دل میں ایک

قسم کا خوف پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ دیرینہ قسمیں سچ ہوں۔ اور یا تو بڑے عاقل کی گزشتہ

یا اس وجہ سے کہ وہ عالم آخری کی سرحد سے قریب تر ہوتا جاتا ہے اسکو یہ دیرینہ قسمیں

ایک راز معلوم ہونے لگتے ہیں بلکہ ان رازوں کو وہ اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے۔ بہر طور جو

کچھ یہ موت کے قریب اس کا دل خوف اور اضطراب سے پر ہو جاتا ہے اور اب وہ

اس پر غور کرنے لگتا ہے کہ آیا اس نے کسی کے ساتھ کوئی ظلم تو نہیں کیا اور اگر اسکو معلوم

ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں بہت سے مظالم کیے ہیں تو وہ بچوں کی طرح

خوف کے مارے منہ میں چٹک پڑتا ہے اور اس کے سامنے ہر وقت نہایت متوش

تعدوات رہنے لگتے ہیں۔ برخلاف اسکے اگر اس کا دل کسی گزشتہ ظلم کی یاد دلا کر اسکو

طاعت نہیں کر سکتا تو اس کے سامنے ہر وقت اتنی جلد انفرادیت ہی جو بقول پندار

(Memento Mori) "بڑے عاقل کی اصلی رفیق" ہے۔ دیکھو سقراط! پندار نے کیا خوب کہا ہے کسی

شخص کے متعلق جس کی زندگی عدل اور برگزیدگی کے ساتھ بسر ہوئی تھی کہ

"خوشگوار امید اس کی ساتھی ہے جو اس کے دل کو ہر وقت خوش رکھتی ہے

اور بڑے عاقل کی اصلی رفیق ہے۔ امید ہی فانی انسان کی متغیر خواہشوں کو جاوہ

لے اور غمناک بل سیج۔ یونان کا بہت مشہور اور عالی شان شاعر تھا۔ ازسیہ نظمیں لکھتا تھا۔ اسکی

اکثر نظمیں جو بھرت غمناک ہیں، دیوتاؤں کا مسکراہو (Memento Mori) کی تربیت میں تھیں (دیکھیے ص ۱۸)

یونان کے بہادران قوی کا ذکر ان میں ہے۔ بعض مشہور خیرات اور نایاب کی نظمیں ہیں۔ بعض مرتبے

بھی ہیں مگر اکثر اب منقود ہیں۔



## استقامت پر رکتی ہے :-

اس میں شک نہیں کہ اس مقولہ میں ایک معرفت چھپی ہوئی ہے اور اسی وجہ سے میری رہ میں دولت ایک بیش قیمت چیز ہے۔ ہر شخص کے واسطے نہ سہی گریک لوگوں کے واسطے تو ضرور ہے کیونکہ دولت ہی کے ذریعہ سے ہم غیر ارادی فریب اور کذب تک سے بچ سکتے ہیں۔ اور اگر بالفرض ہم پر کسی دوتا کی نذریا کسی انسان کے ترش کا مثالیہ ہو تو دولت ہی کے بدولت ہم پر کسی خوف کے اور نہایت اطمینان کے ساتھ سفر آخرت کی تیاری کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دولت کے اچھے اچھے مسرت ملن میں گریں نے سب کا موازنہ کر کے ایک خوش را اور عظیم آدمی کے واسطے اسی کو دولت کا سب سے

اچھا مسرت اور سب سے بڑی خدمت قرار دیا ہے :-

س۔ کفالوس! آپ نے جو کچھ کہا بہت خوب کہا، مگر یہ تو فرمائیے کہ صفت عدل سے جس کا ذکر آپ نے اپنی تقریر میں کیا، کیا مطلب ہے؟ کیا ہم اس کی تعریف یہ کریں کہ عدل مسرت صدق اور داپسی حقوق کا نام ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کے افعال بعض دولت عدل اور بعض دولت ختم کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً اس کو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ اگر کوئی آدمی بجاالت صحت عقل ہلکا ہتھیار اپنے ایک دوست کے حوالہ کرے اور پھر بجاالت جنون اُن کو واپس مانگے تو ظاہر ہے کہ یہ امانت ہرگز واپس نہ ملنا چاہیے اور اُس دوست کو کوئی شخص غائب نہ کیا، اگر وہ اُن ہتھیاروں کو واپس دے یا مجنون سے یہ معاملہ من وعن بیان کرنے پر تیار ہو :-

ک۔ تمہارا خیال بالکل صحیح ہے :-

س۔ تو پھر عدل کی تعریف کنسج بولنا اور داپسی حق ہوتی :-

پیارے کو س نے شریک مکالمہ ہو کر کہا :-

پ۔ یہ نہیں ہے تعریف تو ضرور صحیح ہے، یا کم سے کم سائپائیڈز (Simonides) کا

س۔ اے اے! وہ بیان میں درست ہے۔ ایک ساتویں صدی اور دوسرا پانچواں صدی مسیح کا بیان کیا دوسرے صدی ہے جو کہیں کا رہنے والا بہت مشہور تھا، مگر یہ ہے۔ یہ تھیناکلیز ہے مگر کار وقت کا درست اور معاصر تھا۔ ہلکی جانتا بہت رنگین، خیالات بلند، معنوں مالی ہوتے ہیں۔ پنڈار کی طرح شادی کی ہر صفت میں بدلوے وقت تھا، اس پر ان کے کہنے سے، اس کا مقابلہ انگریزی شاعر ٹینسن سے کرتے ہیں۔

و :- اول ضرور ہے ۔

ک :- اب میں بحث کو اس مقام پر چھوڑتا ہوں کیونکہ مجھ کو کچھ تذر و غیرہ دینا ہے :

س :- تو اب آپ کی جگہ پر ہمارے کوس داخل مباحثہ ہوتے ہیں ؟

ک :- (سکرا کر) "اں بیشک" (یہ کہ کے وہ تذر دینے چلے گئے ۔ اُنکے ہالے کے بعد میں نے ہولیار کو اس سے مخاطب ہو کر پوچھا :- "اب وارث بحث تم ہوے ، لہذا بتاؤ کہ سائیا نیڈیز نے عدل کی صحیح تعریف کیا کی ہے ؟" )

پ :- یہ کہ ہر شخص کو اس کا حق دیا جائے ۔ اور میرے نزدیک بھی یہ تعریف صحیح ہے ۔  
 س :- اس میں شک نہیں کہ سائیا نیڈیز کی تردید کوئی آسان بات نہیں ہے ، کیونکہ وہ ایک عقل مند اور لہجہ منہم شخص ہے ، اگر ان الفاظ سے اس کا اصلی مفہوم ممکن ہے تم سمجھ سکتے ہو ، میری سمجھ میں تو نہیں آتا ۔ اس وجہ سے کہ مثال مذکورہ میں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز کسی دوسرے کے پاس مانگا لکھوائے تو اسے اس کو صاحب امانت کو واپس کر دے گا کہ صاحب امانت مجنون ہو ۔ مگر پھر بھی وہ امانت صاحب امانت کو ملنا چاہیے ۔ کیا ایسا نہیں ہے ؟

پ :- بیشک ایسا ہی ہے ۔

س :- مگر جبکہ حق مانگنے والا اپنے بوش و حواس میں نہ ہو تو پھر وہ حق اس کو کسی طرح نہ ملنا چاہیے ۔  
 پ :- کبھی نہ ملنا چاہیے ۔

س :- تو اس سے معلوم ہوا کہ اس جگہ سے کہ حقوق کی وہی عدل ہے سائیا نیڈیز کا کچھ اور مطلب ہے ۔

پ :- نہیں ۔ سائیا نیڈیز کا یہ مطلب ضرور ہے ۔ کیونکہ اس کا یہ بھی قول ہے کہ قرض جو ایک

دوست دوسرے دوست کو دیتا ہے اس کی غرض نفع ہوتی ہے کہ نفع مان ۔

س :- پہلے اس سے یہ مطلب ہوا کہ وہ شخص جو روپیہ جمع کرنے والے کو اس کا روپیہ واپس دیتا ہے اس کا حق نہیں دیتا ، اگر اس قسم کی وہی ایک فریق کی جانب سے اور دوسری فریق کی جانب سے دوسرے کے لیے نقصان رساں ثابت ہو ، اگرچہ فریقین کا ہم دوست بھی ہوں ۔ کیا تمہارے خیال کے مطابق سائیا نیڈیز کا یہ مطلب نہیں ہے ؟

پ :- بیشک یہی ہے ۔

س: "کوہ پر ہم کو اپنے دشمنوں کو اُن کا حق بھی دینا ضروری ہے؟"

پ: "اس میں کیا ختم ہے۔ ہم کو اُن کا حق دینا چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ دشمن کو دشمن کا حق ادا کرنا اُسکو نقصان پہنچاتا ہے کیونکہ نقصان ہی فریقین کی مناسبت سے مناسب بھی ہے؟"

س: "تو اس سے ثابت ہوا کہ ساپا ٹیڈ یز نے شل دیگر شاعروں کے انصاف کی تعریف شل ایک چھینٹاں کے کی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے اُن کے نزدیک انصاف سے یہ مطلب ہوا کہ ہر شخص کو وہ چیز دی جائے جو حسب موقع ہو۔ اور اسی حسب موقع کو وہ واجباً حق سے تعبیر کرتے ہیں۔"

"بھلا تو ایسی صورت میں تم کیا کہو گے کہ اگر کوئی شخص بعد تعریف مذکورہ ہمارے ساپا ٹیڈ یز سے یہ سوال کرے کہ فریقین کی فتنہ میں واجباً اور مناسب چیز کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے؟"

پ: "ایسی صورت میں اُن کا یہ جواب ہوگا کہ بدن حاصل کرنا۔ دانا ہے اور ادویہ اور ماکولات و مشروبات اشیائے مناسب اور واجب ہیں۔"

س: "اور ایک دوسرے فتنہ مثلاً شباخی میں سوال مذکورہ کا کیا جواب ہوگا؟"

پ: "تیار رکھنے حاصل کرنے والے ہیں اور مصالحوہ وغیرہ اشیائے مناسب و واجب ہیں۔"

س: "بہت ٹھیک ہے۔ پس اسی طرح اُس فتنہ میں جس کو ہم انصاف کہہ سکتے ہیں اشیائے مناسب اور حاصل کرنے والے علی الترتیب کون ہیں؟"

پ: "جو بات مذکورہ بالا کی بنا پر شل اور نقصان اشیائے مناسب ہیں اور درست اور دشمن ان کے حاصل کرنے والے ہوئے۔"

س: "تو انصاف سے ساپا ٹیڈ یز کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو ہم نقصان پہنچائیں؟"

پ: "میرا بھی یہی خیال ہے۔"

س: "بہناری کی صورت میں کون درست کو نفع اور دشمن کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جہاں تک کہ دوست اور دشمن کا تعلق ہے؟"

پ: "طبیعی۔"

س: "اور ایک سفر بحری میں کون دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے، جہاں تک کہ بحری نظرات کا تعلق ہے؟"



پ: "خدا!"

س: "اچھا تو کس سالہ میں اور کس غرض سے ایک صنعت آدمی اپنے دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان بہتر طریقے سے پہنچا سکتا ہے؟"

پ: "میرے نزدیک مثلاً لڑائی کے معاملات میں بحیثیت دوستوں کے معاون اور دشمنوں کے مخالف کے۔"

س: "بہت درست۔ تو اب اسے میرے عزیز پولیارکوس! تم واسکے تسلیم کرنے میں تو کوئی عذر نہ ہوگا کہ بلیب صبح المزاج اسٹخاس کے لیے بیکار ہے۔"

پ: "بلیک!"

س: "اسی طرح جہازوں خشکی کے رہنے والوں کے واسطے۔"

پ: "جی اور کیا!"

س: "تو پھر صنعت آدمی بھی اُن لوگوں کے واسطے بیکار ٹھہرا جو بریڈنگ ہوں۔"

پ: "اس کا تو میں قائل نہیں ہوں۔"

س: "تو پھر انصاف نہ سمجھتے اسن بھی کارآمد ہوا؟"

پ: "بلیک!"

س: "یہی حالت فن زراعت کی بھی ہے۔"

پ: "اس میں کیا شبہ ہے؟"

س: "یعنی وہ ایک ذریعہ محاصل زمین کے حاصل کرنے کا ہے۔"

پ: "جی ہاں۔"

س: "اسی طرح جوئے بنانے والے کام بھی مفید ہے؟"

پ: "جی ہاں بلیک ہے۔"

س: "یعنی وہ ایک ذریعہ جوئے حاصل کرنے کا ہے۔"

پ: "کیا شک ہے؟"

س: "ہیں تو اب تمہارے خیال کے مطابق صنعت بکالت اس کس چیز کے بتانا! استعمال کا معاون ہے۔"

پ: "معاہدوں کا۔"

س: "اور معاہدوں سے تمہاری مراد شراکت ہے یا کچھ اور؟"  
 پ: "البتہ شراکت ہے۔"

س: "نواس صورت میں فرمن کر ڈرائنٹ (draught) کے کھیل میں ایک  
 منصف آدمی یا ایک بچا ڈرائنٹ کا کھلاڑی ڈرائنٹ کے کھیل کے لیے زیادہ موزوں شریک ہو سکتا ہے؟"  
 پ: "ڈرائنٹ کا کھلاڑی۔"

س: "اسی طرح سٹاری اور سنگ راشی کے کاموں میں کیا ایک منصف آدمی یک سٹار یا سنگ راشی  
 سے بہتر شریک ہو سکتا ہے؟"  
 پ: "بہرگز نہیں۔"

س: "تو بتاؤ کہ پھر کس کام میں ایک منصف آدمی کو ہم ایک بینکار پر ترجیح دے سکتے ہیں  
 جس طرح کہ بینکار فنانسی میں بینکار کو منصف پر ترجیح دیتے ہیں؟"  
 پ: "میر خیال ہے کہ شراکتہ زر میں۔"

س: "سوئے اسکے جبکہ شرکت کی غرض یہ ہو کہ روپیہ لٹایا جائے۔ مثلاً چند شرکا جب کوئی چیز  
 فرض کیجئے گھوڑا، بول لیا یا بچہ پٹاپٹ تو اس صورت میں میرے خیال میں ایک یا دو سب بہتر  
 شریک ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

پ: "جی ہاں ایسا ہی ہے۔"

س: "پھر فرمائیں کہ اگر ایک جہانگیر یا نریا کیا جائے تو اس صورت میں جہانگیر یا نریا  
 جہانزادوں بہتر شریک ہوگا؟"

پ: "ایسا ہی تو معلوم ہوتا ہے۔"

س: "جب اتنا معلوم ہو گیا، تو اب یہ بتاؤ کہ وہ موقع کب آئے گا جب سوئے پانڈی کے  
 استغناء کی غرض سے ایک منصف شخص اور دوسرے آدمیوں سے زیادہ مفید شریک بنے ہوگا؟"  
 پ: "جب آپ، پنے، وچے کو یہ امانت دینی منظور رکھنا چاہتے ہیں۔"

س: "یہ یوں کہو جیسے وہ غیر صرف کر دیا جائے نہ کہ اُس سے کوئی صرف لیا جائے۔"  
 پ: "جی ہاں اور کیا؟"

س: "نالیاس سے وہی ڈرائنٹ مراد ہے جو اس زمانہ میں رائج ہے۔ بہ طور انگریزی ترجمہ میں ہی نقد  
 استعمال کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم اصل میں کون سا کھیل ہے۔"

میں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ انصاف کا تعلق ازراہ مفید ہونے کے روپیہ کے ساتھ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ روپیہ بیکار اور غیر مصرت کر دیا جائے۔  
 پ۔ "جی ہاں۔ بننا ہر تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔"

س۔ "پس اسی طرح جب تم ایک باغبانی فینچی اپنے پاس مصرت رکھنا چاہتے ہو تو انصاف ایک مفید چیز ہے۔ عام اس سے کہ تم کسی کی شراکت کرو یا نہ کرو۔ مگر جب تم اس فینچی کو استعمال میں لانا چاہو اس وقت انصاف کی جگہ من باغبانی لے لیا ہے۔"

پ۔ "نظا ہر ہے۔"

س۔ "پھر یہ بھی ٹھیک ہوگا کہ جب تم ایک موصال یا ایک بین کو ہر استعمال کے لئے رکھنا چاہتے ہو۔ تب البتہ انصاف ایک مفید چیز ہے مگر جبکہ تم ان دونوں چیزوں کے استعمال کے خواہشمند ہو تو تم کو سپاہی یا بین نواز کے فن کی ضرورت ہوتی۔"

پ۔ "بیشک ہوگی۔"

س۔ "اسی طرح اور چیزوں کا بھی حال ہوگا جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ انصاف بیکار رہے جبکہ کسی چیز سے کام لیا جائے اور کام آدھے جبکہ کسی چیز سے کام نہ لیا جائے۔"  
 پ۔ "ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

س۔ "تب تو میرے عزیز دوست! انصاف کوئی قیمتی چیز نہ ہوا۔ جبکہ اس کا استعمال صرف اشیاء کی بنیادی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اچھا آداب ہم اس بحث کا ایک دوسرا رخ اختیار کریں۔  
 — فرض کرو ایک گھونسلہ باز جو گھونسلہ مارنے میں کامل ہے، کیا گھونسلہ ست بچے میں کامل ہمارت نہ رکھتا ہوگا؟"

پ۔ "مترورہ کتنا ہوگا۔"

س۔ "یہ شخص کسی بیماری کے روکنے اور اس کے غلوں کے دفع کرنے میں ہمارت رکھتا ہو، کیا وہ دوسروں میں اسی بیماری کو پھیلانے کے لئے گاہ؟"

پ۔ "میرے نزدیک مترورہ کر کے گاہ۔"

س۔ "پس اسی طرح کوئی شخص جو فوج کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہو وہ یقیناً دشمن کی تباہی جنگ اور دیگر رازوں کو بخوبی چرا بھی سکتا ہے۔"





جانے۔ کیا یہ تمہارا مطلب نہیں تھا؟

سپ: "نہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ گراں غصہ کے سلسلہٴ کلام کے بعد مجھ کو اپنے ابتدائی الفاظ یاد نہیں۔ بہ طور پیروی اسے اب بھی ہے کہ دوستوں کی امداد اور دشمنوں کو نقصان پہنچانا انصاف ہے۔"

سپ: "اچھا اب یہ بتاؤ کہ کسی شخص کے دوستوں سے کیا وہ لوگ مراد ہے یا نہیں جو بظاہر اُسکو نیک معلوم ہوتے ہوں، یا وہ جو دراصل نیک ہوں گو بظاہر ہرگز معلوم ہوتے ہوں۔ اور دشمنوں کی بھی کیا اسی اصول پر تعریف کی جائے گی؟"

سپ: "میں یہ متصور ہوں جہاں آدمی کو چاہیے کہ جس کسی کو نیک سمجھے اُس سے محبت کرے اور جس کسی کو بد سمجھے اُس سے نفرت کرے۔"

س: "کیا لوگ اس معاملہ میں غلطی نہیں کرتے اور نیکوں کو بد اور بدوں کو نیک انفرادی غلطی سے تصور نہیں کرتے؟"

سپ: "مترور کرتے ہیں۔"

س: "تو ایسے لوگوں کے نزدیک نیک اُنکے دشمن اور بد اُنکے دوست ٹھہرے؟"

سپ: "بیشک ایسا ہی ہوا۔"

س: "اور ظاہر ہے کہ ایسے اشتباس کو ایسے مواقع پر بدوں کی اعانت اور نیکوں کی نقصان رسانی میں انصاف ہے۔"

سپ: "بظاہر تو ہے۔"

س: "مگر اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ نیک لوگ منصف ہوتے ہیں اور بد انسان فی الحقیقت نفرت سے دور ہے۔"

سپ: "بیشک۔"

س: "تو اب تمہارے مسئلہ کے مطابق کوئی شخص جو بے انصافی نہ کرے اُسکو نقصان پہنچاتا میں انصاف ہے۔"

سپ: "نہیں سناؤ اللہ! استغفر اللہ! یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ یہ تو بہت برا سوال ہے۔"

س: "تب اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ غیر منصف کو نقصان پہنچانا اور منصف کی اعانت میں انصاف ہے۔"

سپ: "البتہ یہ مسئلہ پہلے مسئلہ سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔"

س۔ "تو پا لیا کہ اس صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ ان معاملات میں جن میں لوگوں نے اپنے دوستوں اور دشمنوں کے انتخاب میں غلطی کی ہے ان لوگوں کو جن کے حق میں غلطی کی گئی ہے اپنے دوستوں کو نقصان پہنچانا انصاف ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک وہ بد ہیں۔ اور اسی طرح اپنے دشمنوں کی اعانت کرنا بھی انصاف ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک وہ نیک ہیں۔ اور اب یہ ہمارا استدلال اس چیز سے بالکل متضاد ہوگا بلکہ ہم سادہ فہم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔"

س۔ "نتیجہ تو یہ ضرور نظر آ کر اب مجھ کو اجازت دیجیے کہ دوست اور دشمن کی تعریف میں کچھ تغیر نہیں کروں کیونکہ وہ غلط معلوم ہوتی ہے۔"

س۔ "شوق سے کرو مگر یہ بتاؤ کہ تمہاری ابتدائی تعریف کیا تھی؟"

س۔ "جی ہاں کہ دوست وہ ہے جو بظاہر نیک معلوم ہو۔"

س۔ "پھر وہ اپنی دوست کی تعریف کیا کر دے گا؟"

س۔ "جی ہاں کہ دوست وہ ہے جو نہ صرف بظاہر نیک بلکہ دراصل بھی نیک ہو۔ اور وہ لوگ جو ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں مگر اصل میں شیخ ہیں وہ دراصل دوست نہیں ہیں بلکہ ظاہری شے جاسکتے ہیں۔ علیٰ ہذا دشمن کی تعریف بھی اسی اصول پر ہوگی۔"

س۔ "تو اس تعریف سے نیک آدمی یقیناً دوست سمجھا اور بد آدمی دشمن۔"

س۔ "جی ہاں۔"

س۔ "اس جدید تعریف سے یہ بات لازم آئے گی کہ انصافیت کی تصویر میں ایک اضافہ کرنا پڑے گا جو پیشتر ضروری نہ تھا یعنی تعریفِ ادل کے بجائے انصاف ہم دوستوں کے ساتھ نیکی اور دشمنوں کے ساتھ بُرائی کو سمجھتے تھے۔ اور اب اس نئی تعریف کی رو سے تمہارے خیال کے بموجب یوں بنا ہوگا "انصاف سے مطلب ہے دوستوں کے ساتھ نیکی کرنا اگر وہ نیک ہیں اور دشمنوں سے بُرائی کرنا اگر وہ بد ہوں۔"

س۔ "جی ہاں۔ جی ہاں یہی مطلب ہے جسکو آپ نے نہایت صحیح اختصار میں بیان کر دیا؟"

س۔ "اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کسی کو نقصان پہنچانا مسلمان آدمی کا کام ہے یا نہیں؟"

س۔ "جی ہاں۔ یہی جو لوگ بد ہیں اور دشمن بھی ہیں ان کو نقصان پہنچانا منصفانہ فرض ہے۔"

س۔ "اب یہ بتاؤ کہ گھوڑے نقصان کی وجہ سے بہتر ہوتے ہیں یا بدتر؟"



پ۔ ”بدتر“

س۔ ”یعنی کتوں یا خود اپنی صفت گھوڑوں کی عمدگی کے مقابلہ میں؟“

پ۔ ”گھوڑوں کے مقابلہ میں“

س۔ ”اسی طرح کتے نقصان اٹھا کر مقابلہ عمدہ کتوں کے بدتر ہو جائیں گے نا؟“

پ۔ ”اس میں کیا شک ہے؟“

س۔ ”اسی اصول کو مد نظر رکھ کر کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی بھی نقصان اٹھا کر انسانی

فضیلت کی ترازو میں ہکا پڑ جاتا ہے؟“

پ۔ ”بیشک ہم کہہ سکتے ہیں۔“

س۔ ”کیا انصاف ایک انسانی فضیلت نہیں ہے۔“

پ۔ ”ضرور ہے۔“

س۔ ”تصور نہیں کرتے؟“

پ۔ ”ضرور کرتے ہیں۔“

س۔ ”تو ایسے لوگوں کے نزدیک نیک اُنکے دشمن اور بد اُنکے دوست ٹھہرے؟“

پ۔ ”بیشک ایسا ہی ہوا۔“

س۔ ”اور غما ہر ہے کہ ایسے اشتیاق کو ایسے مواقع پر بدوں کی اعانت اور نیکوں کی نقصان

رسانی میں انصاف ہے۔“

پ۔ ”بظاہر تو ہے۔“

س۔ ”مگر اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ نیک لوگ منصف ہوتے ہیں اور بے انصافی انکی

نظرت سے دور ہے۔“

پ۔ ”بیشک۔“

س۔ ”تو اب تمہارے مسئلہ کے مطابق کوئی شخص جو بے انصافی نہ کرے اُسکو نقصان پہنچاتا

میں انصاف ہے۔“

پ۔ ”نہیں معاذ اللہ! استغفر اللہ! یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ یہ تو بہت بُرا مسئلہ ہے۔“

س۔ ”تب اس سے نتیجہ نکلا کہ غیر منصف کو نقصان پہنچانا اور منصف کی اعانت میں انصاف

پ۔ "البتہ پہلے سنا سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔"

س۔ "تو پالہمار کو اس صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ ان معاملات میں جن میں لوگوں نے اپنے دوستوں اور دشمنوں کے انتخاب میں غلطی کی ہے ان لوگوں کو جن کے حق میں غلطی کی گئی ہے اپنے دوستوں کو نقصان پہونچانا انصاف ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک وہ بد ہیں۔ اور اسی طرح اپنے دشمنوں کی اعانت کرنا بھی انصاف ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک وہ نیک ہیں۔ اور اب یہ ہمارا استدلال اس چیز سے بالکل بخار ہوگا جسکو ہم سامانِ نیک و بد کی طرف منسوب کرتے ہیں۔"

پ۔ "نتیجہ تو یہ ضرور نکلتا ہے کہ اگر بچہ کو اجازت دیکھے کہ دوست اور دشمن کی تعریف میں کچھ تغیر تبدیل کر دے کیونکہ وہ غلط معلوم ہوتی ہے۔"

س۔ "یہ شوق سے کرو مگر یہ بتاؤ کہ تمہاری ابتدائی تعریف کیا تھی؟"

پ۔ "یہ کہ دوست وہ ہے جو بظاہر نیک معلوم ہو۔"

س۔ "اور اب دوست کی تعریف کیا کرو گے؟"

پ۔ "یہ کہ دوست وہ ہے جو نہ صرف بظاہر نیک بلکہ دراصل بھی نیک ہو۔ اور وہ لوگ جو ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں مگر اصل میں نیک نہیں ہیں وہ دراصل دوست نہیں ہیں بلکہ ظاہری سہکے جاسکتے ہیں۔ غرض ہر دشمن کی تعریف یعنی اسی اصول پر ہوگی۔"

س۔ "تو اس تعریف سے نیک آدمی یقیناً دوست ٹھہرا اور بد آدمی دشمن۔"

پ۔ "جی ہاں۔"

س۔ "اس جا پر تشریح سے یہ بات لازم آئے گی کہ انصاف کی تصویر میں ایک اضافہ کرنا ہوگا جو پیشتر ضروری نہ تھا۔ یعنی تعریفِ اول کے بعد جب انصاف ہم دوستوں کے ساتھ نیکی اور دشمنوں کے ساتھ بُرائی کو سمجھتے تھے۔ اور اب اس نئی تعریف کی رو سے تمہارے خیال کے بموجب یوں کرنا ہوگا "انصاف یہ ہے کہ طلبِ سہ دوستوں کے ساتھ نیکی کرنا اگر وہ نیک ہوں اور دشمنوں سے بُرائی کرنا اگر وہ بد ہوں۔"

پ۔ "جی ہاں۔ جی ہاں۔ جن میں سب سہ ہے جسکو آپ نے نہایت صحیح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔"

س۔ "اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کسی کو نقصان پہونچانا منصف آدمی کا کام ہے یا نہیں؟"

پ۔ "نیک ثابت ہے۔ یعنی جو دل بد ہیں اور دشمن بھی ہیں ان کو نقصان پہونچانا منصف کا فرض ہے۔"

س۔ "اب یہ بتاؤ کہ گھوڑے نقصان کی وجہ سے بہتر ہوتے ہیں یا بدتر؟"  
پ۔ "بدتر۔"

س۔ "جینی کتوں یا خود اپنی صنعت گھوڑوں کی مددگی کے مقابلہ میں؟"

پ۔ "گھوڑوں کے مقابلہ میں۔"

س۔ "اس طریقے سے نقصان اٹھا کر مقابلہ عمدہ کتوں کے بدتر ہو جائیں گے؟"

پ۔ "اس میں کیا شک ہے؟"

س۔ "اسی اصول کو مد نظر رکھ کر کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی بھی نقصان اٹھا کر انسانی فضیلت کی ترازویں ہلکا پڑ جاتا ہے؟"

پ۔ "بیشک ہم کہہ سکتے ہیں۔"

س۔ "کیا انصاف ایک انسانی فضیلت نہیں ہے؟"

پ۔ "ضرور ہے۔"

س۔ "تو اس سے میرے دوست یہ نتیجہ نکلا کہ نقصان رسیدہ لوگ فضیلت انصاف میں  
ادنیٰ تر ہو جاتے ہیں؟"

پ۔ "نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔"

س۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ ایک موسیقی دان اپنی موسیقی کے زور سے لوگوں کو بے سُر اکردے؟"

پ۔ "جی نہیں۔"

س۔ "اسی طرح گھوڑے کی سواری سکھانے والے اپنے فن کے ذریعہ سے لوگوں کو بڑا سوار  
نہیں بنا سکتے؟"

پ۔ "جی نہیں۔"

س۔ "اگر ایسا ہے تو کیا ایک صنعت اپنے انصاف کے ذریعہ سے لوگوں کو غیر صنعت  
بنا سکتا ہے۔ یا الفاظ دیگر کیا ایک نیک شخص اپنی نیکی کے ذریعہ سے لوگوں کو بد بنا سکتا ہے؟"

پ۔ "جی نہیں۔ بالکل ناممکن ہے۔"

س۔ "تم سچ کہتے ہو۔ اس وجہ سے کہ ٹھنڈا کرنا ہر دوت کی خاصیت ہے نہ کہ ٹپکس رات کی۔"

پ۔ "جی ہاں اور کیا۔"



س۔ اسی طرح مرطوب کرنا رطوبت کی خاصیت ہے نہ کہ بالکس یوست کی۔

پ۔ بیشک۔

س۔ "تو نقصان پہونچتا بھی بدی کی خاصیت ہے نہ کہ بالکس نیکی کی۔"

پ۔ "اس میں کیا کلام ہے۔"

س۔ "اچھا اب یہ بتاؤ کہ منفعت نیک ہوتا ہے نہ؟"

پ۔ "جی ہاں ضرور۔"

س۔ "تو درست کیا کسی مخلوق کو نقصان پہونچانا منفعت کی نہیں بلکہ اُسکے عکس غیر منفعت کی خاصیت ہوئی۔"

پ۔ "آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔"

س۔ "ہماری اس پوری بحث کا نتیجہ نکلا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ ہر شخص کو اُسکا حق دینا انصاف ہے۔ اور انصاف سے اُس کا یہ مطلب ہو کہ دوستوں کو فائدہ اور دشمنوں کو نقصان پہونچا جائے تو یہ دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ ہم ابھی دیکھ چکے کہ کسی کو بھی نقصان پہونچانا انصاف نہیں ہے۔"

پ۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کا استدلال بالکل صحیح ہے۔"

س۔ "تو اب تم کو اور تم کو بالاتفاق اُس شخص کی مخالفت کرنا ضروری ہے جو مسئلہ مذکورہ بالا کو سبایا نہ دیا۔" یا اس کا پٹا کوئی ایک دوسرے فلسفی کی طرف منسوب کرے۔"

پ۔ "بہت ٹھیک میں مخالفت کے لیے تیار ہوں۔"

س۔ "پہلیا رکوس! تم کو معلوم ہے کہ اس مسئلہ کا کہ "دوستوں کو فائدہ اور دشمنوں کو نقصان پہونچانا انصاف ہے۔" صلی موجد میرے نزدیک کوئی شخص ہے؟"

پ۔ "جی نہیں۔ انا شاد فرمائیے۔"

مسئلہ دیہوت مسفر

مسئلہ اول۔ بیان میں ہے۔ ز۔ نہ تقریباً۔ وہ تیل سج۔

مسئلہ دوم۔ بیان میں ہے۔ زید ہر ٹیلیفون! شدہ! انا و سنیوہ مہترقا! لا خریہ ٹیلیفون کا! انا! حاکم! یہ انا! ز۔ انا! ز۔ تیل سج۔

س میرے خیال میں اس کا اصلی موجد پیری اینڈر یا پوڈیکاس یا رزکسیر یا آکسینڈاس  
باشندہ ایتھنز یا کوئی اور دولتمند شخص ہے جو اپنے تئیں بڑا صاحب اقتدار سمجھتا تھا۔  
پ۔ ”آپ کا خیال بالکل صحیح سلوم ہوتا ہے۔“

س ”اچھا تو چونکہ اب تک ہم انصاف کی صحیح تعریف تک نہیں پہنچے لہذا ہلکودیکھا  
پا رہے کہ کوئی دوسری تعریف کیا ہو سکتی ہے۔“

جب ہم دونوں آدمی بحث میں مشغول تھے ہم ہر ایک دیکھ رہے تھے کہ قریباً کس کس  
مباحثہ میں مزاحم ہو، اور کوئی اعتراض کرنا چاہتا ہے مگر ہر دو نہ وہ لوگ جو قریب بیٹھے تھے اور  
بحث کو آخر تک سنا جاتا ہے تھے اُس کو مدد کتے تھے۔ جوں جوں میں نے مذکورہ بالا آخری باب  
ختم کیا اور تھوڑی دیر کے لیے طلبہ میں ایک خاموشی سی ہو گئی۔ قریباً کس سے منقطع ہو سکا  
اور اب وہ ہم پر مثل ایک وحشی جانور کے بھپٹ پڑا۔ گویا وہ ہم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیگا۔  
میں اور پلیمارکس دونوں متوجہ ہو گئے اور قہر سہا کوس سخت غصہ کے لہجہ میں ہم دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔  
”ست سراط تم کو اور پلیمار کو س تم کو کیا خطا سوار ہو گیا ہے۔ اور کیا حاجت  
تھاری اُس استانات سے مترشح ہے جو اثناے بحث میں تم نے برتی۔ مگر تم کوئی احمقیت انصاف  
کی نوعیت سمجھنا ہے تو سوالات پر اپنی بحث کو محدود نہ کرو۔ اور اپنے جواب اور جواب الجواب میں  
محض افنی لٹ پیر سے ایک قسم کی غلیظ پٹیکیتی کا ہم لوگوں کو تاشد نہ دکھاؤ۔ یاد رکھو کہ سوال  
کرنا جواب دینے سے زیادہ آسان ہے۔ جس طرح ہم سے سوال پوچھتے ہو ہم کو جواب بھی دواؤ  
ہم کو بتاؤ کہ خود تمہارے نزدیک انصاف کیا چیز ہے۔ مگر ایک بات کا ضرور خیال رکھو کہ انصاف  
کی اس قسم کی تعریف نہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک فرض ہے یا وہ فائدہ بخش یا نفع رسان ہو یا وہ  
حصول زر کے لیے مفید ہے یا وہ کسی مصلحت پر مبنی ہے۔ اور جو کچھ اُسکی تعریف تم پیش کر رہے ہو

س۔ کا رتھ کا با اختیار بادشاہ تھا۔ زمانہ تقریباً ۷۰۰ ق م

س۔ اس نام کے دو بار اور زبردست برائی بادشاہ گذرے ہیں۔ زمانہ پانچویں اور چھٹی صدی ق م۔

س۔ ایران کا زبردست اور نہ شہرتا جبار تھا۔ قدیم فارسی مورخ اسکو منفذ یا بکتے ہیں۔ بابون کا سخت دشمن تھا۔

اس کا یونان کا حملہ مشہور ہے۔ بحری جنگ میں اس نے اپنی فوج اور جہازوں کی تباہی اپنی آگ سے کی تھی۔

۵۵۰ ق م۔ گھانا سلوم ۵۵۰ ق م۔ اکیس ق م۔ زمانہ تقریباً ۵۰۰ ق م۔ افلاطون نے اس  
مکالمہ میں مسئلہ کا حاکم قرار دیا ہے کہ قوت اہل حق ہے۔ ”جیسا کہ آگے ظاہر ہو گا۔“

صاف اور ٹیک ٹیک الفاظ میں کرو۔ کیونکہ میں بھارے کسی جواب کو ہرگز قبول نہ کروں گا اگر اُس میں اس قسم کی لغویت ہوگی جو ہم ابھی سن چکے ہیں۔

جب ہم لوگ اس تقریر کو سن چکے تو میں سخت متحیر ہوا اور خوف زدہ ہو کر مقرر کو دیکھنے لگا اور اگر میری آنکھ اس پر پہلے نہ پڑ جاتی تو شاید خوف کے مارے میری نگاہیں بند نہ جاتی۔ اور میرے منہ سے کچھ نہ نکل سکتا۔ مگر جبوقت وہ غصہ سے سخت مشتعل ہوا تھا میں نے اُسکے چہرہ کو پہلے دیکھ لیا تب اس کے کہ وہ مجھ کو دیکھے اور خوف سے بھرپور آواز میں میں نے جواب دیا۔

س: "تھراپیا کو س: اس قدر غصہ اور ورشتی ہم پر نہ کرو۔ اگر مجھ سے اور پوچھا تو اس سے بحث کے اثنا میں مسئلہ کے بیان کرنے میں غلطیاں ہو گئی ہیں تو یقین مانو کہ وہ غلطیاں بار بار وہ نہیں۔ اگر ہم ایک گم شدہ ہشہنی کو ڈھونڈتے نکلیں تو تلاش کے اثنا میں ہم ایک دوسرے کی ایسی استقامت ہرگز نہیں کر سکتے کہ نفس معاملہ میں ہم سے کسی قسم کی ہلوتی ہو جائے اور ہر مراد اپنی وہ اشرفی ہمارے ہاتھ سے جاتی رہے۔ پھر انکشافات ایسی بیش بہا چیز جو ایک سونے کے کونے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اُس کی جستجو میں ہم کیونکر ایسی کمزوری دکھلا سکتے ہیں جسکا الزام ہم پر عائد کرتے ہو۔ میرے عزیز دوست۔ تم کو اختیار ہے جو چاہو میری نسبت خیال کرو مگر میں تم سے سنا کہندوں ایسے نزدیک ہوں مسئلہ کا حل ہماری قوت سے باہر ہے۔ لہذا تم ایسے لائق شخص کو پابستہ تھا کہ ہماری اس بڑے اشتیاعی پر رحم کرتے نہ کہ غصہ۔"

تھراپیا کو س: نے میری تقریر سن کر دوسرے قہقہہ مارا اور کہنے لگا

س: "ادھر کیونیزا: ستراط کی بناوٹی عاجزی کی ایک مثال ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہی پیش آئے گا اور لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ تم خود کسی دوسرے کے سوال کا جواب دینے سے تمنا نہ کرو گے۔ اپنی لاطینی ظاہر کرو گے، غرض کہ مختلف حیلوں سے اُسکے جواب سے بچو گے۔"

س: "تھراپیا کو س: تماری عقل و ذہانت میں کسی کو کلام نہیں۔ مگر تم اگر کسی سے پوچھو

س: "یہ بچوں کا اعتقاد تھا کہ بیڑی کی آکھ میں ایک قسم کا مذاق ایسی خرمی ہے۔ اگر کسی آدمی کو پیلہ دیکھو، وہ آدمی بے حد اُسکو دیکھے اور بے ہوش ہو جائے، ستراط کا اشارہ اسی کی جانب ہے، اور وہی شاعر نے بھی یہ ایک نظم میں ذکر کیا ہے۔"

س: "یہ بچہ قدیم زمانہ کا ایک بہت مشہور ہیرو کہنا ہے۔ یونانیوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی شہرہ وادہ بناور نہیں تھا۔ اُسکے بارہ بھائی تھے، ان کے ایک نام ہے جو انگریزی میں 'میسز' کہلاتے ہیں۔ اسکی شہرت یونانیوں میں بھی اتنی تھی جتنی ایرانیوں میں رستم کی اور عربوں میں 'طلحہ' کہلاتے ہیں۔ اہل بیت کے لیے 'ہاتھ'۔"



کہ نمبر ۱۲ کے اجزا کیا ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ دو کہ خبردار جواب میں نمبر ۱۲ کہنا کہ نمبر ۱۲ تیرہ کا دو گنا یا ۲۴ کا تگنا یا ۳ کا چو گنا یا ۶ کا چھ گنا ہے۔ اور اگر یہ پھل جواب کوئی دیکھا تو میں ہرگز قبول نہ کروں گا۔ تو تم بخوبی جان سکتے ہو کہ ایسے سوال کا جواب دینے کی کوئی بھی جرأت نہ کرے گا۔ مگر فرض کرو کہ مجیب تم سے یہ کہے کہ اپنا مطلب آپ براہ ہر بانی صاف الفاظ میں بیان فرمائیے کیا یہ جوابات جو آپ نے خود رو کر دیے ہیں اگر ان میں سے کسی کے دینے کی ٹھیکو اجازت نہیں ہے تو جناب پھر میں کیا کہوں۔ ان میں سے کوئی جو اسب اگر صحیح بھی ہے اور اس کو پیش کرنے کی آپ مجھ کو اجازت نہیں دیتے تو کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ میرا جواب صحت سے دور جا پڑے یا اس کے سوا آپ کا کچھ اور مطلب ہے؟ تو بتاؤ تم اس کا کیا جواب دو گے؟

ت۔ ”کیا خوب! کیا یہ دونوں صورتیں تمہارے نزدیک برابر ہیں؟“  
 س۔ ”میرے نزدیک تو کوئی فرق نہیں ہے۔ بالقرض اگر کوئی فرق ہو بھی تب بھی ان جوابوں میں سے کوئی جواب اگر مجیب کے نزدیک صحیح ہو تو کیا کسی کی ممانعت یا عدم ممانعت سے اُس کے اس فیصلہ ذہنی پر اثر پڑے گا کہ فلاں جواب صحیح ہے لہذا میں اُسکو مزادوں گا؟“  
 ت۔ ”کیا اس گفتگو سے تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم بھی ایسا کرنے والے ہو۔ اور کیا تم بھی اُن جوابوں میں سے جنکو میں نے رد کر دیا ہے کوئی ایک جواب دو گے؟“  
 س۔ ”کوئی تعجب کی بات نہیں اگر میں ایسا کروں اور بعد کا مل غور و فکر کے ٹھیکو ایسا کرنا واجب معلوم ہو۔“

ت۔ ”تب بتاؤ مسئلہ انصاف کے متعلق اگر میں ایک ایسا جواب پیش کروں جو ان سب سے علاحدہ اور ان سب سے بہتر ہو جن کو میں نے رد کر دیا ہے تو تمہارے واسطے کوئی سزا تجویز کی جائے؟“  
 س۔ ”وہی سزا جسکا میرے نزدیک ایک جاہل مستحق ہے یعنی حصول معرنت بذریعہ ایک عالم کے۔ پس اسی سزا کا میں بھی جاہلوں کے ساتھ سزاوار ہوں۔“

ت۔ ”سقراط! تم بھی کس قدر با مذاق آدمی ہو۔ مگر علامہ حصول معرنت کے تم کو کچھ دینا بھی ہوگا؟“  
 س۔ ”میں ضرور دوں گا مگر جب میرے پاس روپیہ ہوگا۔“  
 ت۔ ”تمہارے پاس روپیہ ہے۔ مگر آسیا کوس جہاں تک روپیہ کا تعلق ہے تم بحث کیے جاؤ۔ ہم سب سقراط کی طرف سے دینے کو تیار ہیں۔“

ت۔ کیا خوب بات کہ سقراط اپنی پرانی چال جواب سے بچے اور دوسروں کی تقریر کاٹنے یا سپر  
خترامن جاننے کی نہایت کامیابی سے جاری رکھیں۔

س۔ "میرے عزیز دوست! یہ بتاؤ کہ کوئی شخص ایسی صورت میں کیونکر جواب دے سکتا ہے جب وہ  
اولاً صحیح جواب دینا نہ جانتا ہو اور اتنا ہی بھی کہتا ہو کہ میں نہیں جانتا اور ثانیاً اگر وہ کچھ جانتا بھی ہو  
اور کچھ کہنے کی جرأت بھی کرے تو تم ایسا قابل شخص اس پر قدغن کر دے۔ پس ایسی صورت میں  
مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مقرر تم ہی بنو۔ کیونکہ نفس مسئلہ سے واقفیت کا تم کو دغوی ہے اور  
تقریر کے خواہشمند بھی تم ہو۔ لہذا میری اس گزارش کو منظور نہ کرو اور ہم سب کی معلومات اور  
معرفت میں اضافہ کرو۔"

میرے ساتھ گلوکان اور اورادگوں نے بھی تمہارا یہاں کوس سے اصرار کرنا شروع کیا  
اور کہا کہ تقریر آپ ہی شروع کیجیے۔ کیونکہ یہ معلوم ہو گیا کہ تمہارا یہاں کوس خود تقریر کرنے کا اور  
اُس کے ذریعہ سے لوگوں کی تعریفیں حاصل کرنے کا مشتاق ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنے جواب  
کو جو اُس کے دل میں تھا اور اُس وقت تک ظاہر نہ کرتا تھا، انوکھا اور نہایت اعلیٰ درجہ  
کا خیال کرتا تھا مگر اس پر بھی اُس نے یہی کہا کہ سلسلہ کلام میری طرف سے شروع ہو بالآخر  
راضی ہو گیا اور کہنے لگا:۔

ت۔ "یہ سقراط کی چالاکی ہے۔ کیونکہ وہ کسی کو معرفت دینا نہیں چاہتے، بلکہ خود لوگوں سے  
حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور پھر بھی کسی کا احسان نہیں مانتے۔"

س۔ "تمہارا پہلا جملہ یعنی میں اور لوگوں سے حصول معرفت کا خواہشمند ہوں، ضرور صحیح ہے۔  
وہ سراجملہ یعنی میں کسی کو اُسکی معرفت کے صلہ میں کچھ نہیں دیتا غلط ہے۔ کیونکہ جو کچھ میں  
دے سکتا ہوں ضرور دیتا ہوں۔ اور چونکہ میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے اس سے خراج  
تعریف دیتا ہوں۔ اور تم خود دیکھ لو گے کہ یہ میرا دعویٰ کس قدر صحیح ہے۔ کیونکہ تمہارے جواب کی  
اگر وہ میرے رد یک صحیح ہوا، میں دل سے تعریف کروں گا۔ اور تمہیکو امید ہے کہ تمہارا جواب  
ضرور اعلیٰ درجے کا ہو گا۔"

ت۔ "اگر تم میرا جواب سننے کے اس قدر مشتاق ہو تو سنو۔ میری رائے میں انشاءً صرف  
تو ہی بڑے نام نہاد کا نام ہے۔ اور کچھ نہیں۔ جواب میری تعریفیں کرنا شروع کرو۔ کیا تم کو  
اس سے انکار ہے؟"

س "نہیں، مگر میں پہلے تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہوں جو اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم نے ابھی کہا کہ انصاف قوی تر کے فائدہ کا دوسرا نام ہے۔ تمہارا کیا کوئی نسخہ فائدہ دہنا ہے کہ اس ترقی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یہ تو ہرگز ہو نہیں سکتا کہ ہسٹو ان پالیڈیا س جو ہم سب سے زیادہ قوی ہے اگر اُس کے بدن کی قوت بڑھانے میں کالے کا گوشت اُسکو سفید پڑتا ہے تو ہم ایسے کمزور لوگوں کی قوت بڑھانے میں پس پی کیا اور مفید ہوگا، اور اس لیے کیا اُس کا استعمال ہمارے واسطے قرین انصاف ہوگا؟"

ت "سقراط، تم غائب کرتے ہو۔ میرا مسئلہ کو تم بخوبی سمجھتے ہو، مگر جان بوجھ کر اُس سے اغماض کرتے ہو اور اُسکو ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہو جس سے اُس پر اعتراض بہت آسانی سے وارد ہو سکتا ہے۔"

س "نہیں ایسا تو نہیں ہے۔ نہ بانی کر کے اپنا مطلب صاف طور پر بیان کرو۔"

ت "کیا تم کو نہیں معلوم کہ بعض شہروں میں حکومت شخصی (فرد یا شخص کی حکومت) بعض میں جمہوری (جمہور یا عوام کی حکومت) اور بعض میں حکومت دوا (رأیوں یا خواہش کی حکومت) ہے؟"

س "مجھ کو خوب معلوم ہے۔"

ت "تو پھر کیا ہر شہر میں قوت اعلیٰ حکومت اعلیٰ یعنی قوی تر کے ہاتھ میں نہیں ہوتی؟"

"بیشک ہوتی ہے۔"

"مزید براں ہر حکومت ایسے قوانین بناتی ہے جو اُسکے فائدہ کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔"

جمہوری حکومت جمہوری قوانین، شخصی حکومت جاہلانہ قوانین اور دیگر حکومتیں بھی اپنے فائدہ کے لحاظ سے قوانین وضع کرتی ہیں۔ لہذا اس طرز عمل سے ہر حکومت اس امر کو تسلیم کر رہی ہے کہ جو کچھ اُسکے فائدہ کے مطابق ہے وہ اُسکی رعایا کے لیے بھی نقصان نہ ہے۔ اسی لیے جو شخص اس اصول سے انحراف کرتا ہے اُسکو وہ خلاف قانون اور خلاف انصاف قرار دے کر اُسکے لیے سزا تجویز کرتی ہے۔ اب حضور والا۔ میرا مطلب صاف ہو گیا۔ یعنی تمام اقسام کی حکومتوں میں جز و مشترک یہی حکومت کا فائدہ انصاف لانا ہے اور ظاہر ہے کہ حکومت ہی رعایا کے مقابلہ میں قوی تر ہے۔ لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ قوی تر کا فائدہ ہر جگہ انصاف ہے۔"

س "اب میں تمہارا مطلب سمجھا۔ اور اب یہ دیکھنا ہے کہ تمہارا دعویٰ کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہے۔ اس سے ایک بات ضرور صاف ہو گئی۔ یعنی یہ کہ تم خود اس کے قائل ہو کہ



انصاف ایک قائمہ ہے۔ حالانکہ اور لوگوں کو تم نے اس تعریف سے منع کیا تھا، البتہ اس میں ایک امتداد کر دیا یعنی اُسکو قوی تر کا قائمہ قرار دیا۔  
ت۔ ”پچھے مگر یہ تو ایک خفیف سا امتداد ہے۔“

س۔ ”یہی تو دیکھنا ہے کہ یہ ایک خفیف سا امتداد ہے یا ایک اہم چیز ہے۔ اب ہم تھوڑی دلیل کی صحت کو جانچیں گے۔ یہاں تک تو ہم دونوں اصرار کرتے ہیں کہ انصاف قائمہ سے وابستہ ہے، مگر تم اس میں اتنا جزو اور بڑھا دیتے ہو کہ وہ قوی تر کا قائمہ ہے اس میں مجھ کو کلام ہے۔ اور اسی وجہ سے اس مسئلہ کی تحقیق لازم آئی۔“  
ت۔ ”مہربانی کر کے ضرور کیجیے۔“

س۔ ”ضرور کی جائے گی۔ اچھا یہ بتاؤ تم اس امر کو مانتے ہو کہ ممالکوں کی اطاعت کرنا انصاف ہے؟“  
ت۔ ”میں مانتا ہوں۔“

س۔ ”کیا ہر عرزلطو رت میں حکام غلطی کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں یا وہ غلطی نہیں کر سکتے؟“  
ت۔ ”وہ غلطیاں ضرور کر سکتے ہیں۔“

س۔ ”اسکے یہ معنی ہوئے کہ وضع قوانین میں کبھی اُنکا کام صحیح اور کبھی غلط ہو سکتا ہے؟“  
ت۔ ”اُس میں کیا شک ہے؟“

س۔ ”اب صحیح اور غلط اسے یہی مطلب ہے کہ جو اُنکے قواعد کے مطابق ہو اُسکو صحیح کہیں گے اور جو مخالفت ہو اُسکو غلط یا کچھ اور؟“  
ت۔ ”یہی مطلب ہے جو تم نے بیان کیا۔“

س۔ ”اور تم اسکے بھی قائل ہو کہ جو کچھ حکام وضع کریں اُسکی اطاعت رعایا کا فرض ہے۔ کیونکہ یہی انصاف ہے؟“

ت۔ ”بے شک میں اس کا قائل ہوں۔“

س۔ ”تو اس استدلال کے بموجب صرف قوی تر کا قائمہ ہی انصاف نہیں ہے بلکہ اُسکے

نائدہ کا خلاف یعنی اُس کا نقصان بھی انصاف ہے۔  
ت "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

س "میں وہی کہتا ہوں جو تم کہتے ہو۔ اچھا اب ہم اس نکتہ کو ذرا غور سے دیکھیں، کیا یہ تم نے ابھی تسلیم نہیں کیا کہ جب حکام اپنی رعایا پر بعض احکام جاری کرتے ہیں تو وہ اپنے نائدہ کے لحاظ سے بعض اوقات غلطی کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ اور پھر یہ نہیں کہا جیہ حکام رعایا کے واسطے جاری کیے جائیں ان کی تعمیل رعایا کو کرنا بین انصاف ہے۔ کیا یہ تم کو تسلیم نہیں ہے؟"

ت "تو تسلیم ہے۔"

س "تو یہ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ جب تک تم اس کے قائل ہو کہ رعایا کو تعمیل احکام اپنے حکام کی ہر حالت میں انصاف ہے اُس وقت تک تم اس کے بھی مندرجہ قائل ہو گے کہ حکام (قوی تر) کے نائدہ کے خلاف یعنی قوی تر کے نقصان کے احکام کی تعمیل بھی ہر حالت میں درست ہے جبکہ حکام مذکور اپنے نائدہ کے خلاف بلا ارادہ احکام جاری کریں۔ پس اسے نہایت نقصان دہ قرار دیا کو س! کیا تمہارے اس استدلال سے خود تمہارے کلیتہ کے بالکل نتیجہ نہیں نکلا اور کیا یہ نہیں ثابت ہوا کہ مندرجہ قوی تر کے واسطے قوی تر کے نائدہ کے خلاف حکام کرنا مندرجہ قوی تر میں کوئی شک نہیں۔ یہ نتیجہ تو مندرجہ نکلا۔"

ت "یہ تو ان کے لئے اس موقع پر کہا" بیشک اگر تم شرائط کی طرف سے گواہی دو۔  
پ "نہیں۔ ہم کہہ گوارہ ہوں کی ضرورت نہیں۔ ہر ایسا کو س تو خود اعتبارات ہے کہ حکام بعض وقت اپنے نائدہ کے خلاف احکام جاری کرتے ہیں، نیز یہ کہ انکی رعایا کو ایسے احکام ماننا عین انصاف ہے۔"

کل "نہیں۔ ہر ایسا کو س کا یہ قول ہے کہ حاکموں کے احکام کی تعمیل انصاف ہے۔"

پ "نہ تو فون تم سچ کہتے ہو۔ اور یہ بھی تو ان کا قول ہے کہ قوی تر کا نائدہ انصاف ہے۔ اور جب یہ دونوں قسبے قائم ہو گئے تو تیسرا امر تسلیم شدہ ہے کہ قوی تر (حاکم) صحت (رعایا) سے بعض اوقات ایسے احکام کی تعمیل کرتا ہے جو خود اُس کے نائدہ کے خلاف ہیں۔ تو نتیجہ ان سب باتوں کا یہ نکلا کہ قوی تر کا نائدہ اور نیز اُس کا نقصان دونوں انصاف ہیں۔"

کل بند کر قوی تر کے فائدہ سے اُنکا (تھراپیما کوس کا) مطلب ہے وہ چیز جس کو قوی تر اپنے  
 واسطے مفید خیال کرے۔ اور اُنکا دعویٰ صرف اسی قدر ہے کہ منصفیت تو کو اسلی غیل ضرر پہنچا۔  
 اور ہی انصاف ہے :

پ "نہیں یہ تو اُنکے الفاظ نہیں تھے :

س "پوچھا کہ اس! اس محبت سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تھراپیما کوس اپنے دوست کو اب  
 اُن الفاظ میں بیان کرتا پسند کرتے ہیں تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں وہ شوق سے بیان کریں۔  
 تھراپیما کوس! کیا انصاف کی تعریف تم نے یہ کی تھی کہ جو چیز قوی تر اپنے فائدہ کے واسطے  
 خیال کرے عام اس سے کہ وہ دراصل اُسکے فائدہ کی ہو یا نہ ہو اور کیا ہم اس ترمیم شدہ تعریف  
 کو اب تمہارا دعوئے خیال کریں؟

ت "نہیں ہرگز نہیں۔ کیا تمہارے نزدیک ایسے آدمی کو جو غلطی کر رہا ہے غلطی کے ارتکاب  
 کے وقت بھی میں قوی تر سمجھوں گا؟

س "جب تم نے یہ تسلیم کر لیا کہ حکام غلطی کر سکتے ہیں تو میں ہی سمجھا :

ت "سفر اظہار الفاظ کے اُلت پھیر کے اُستاد ہو۔ بتاؤ کہ تم اس شخص کو جو کسی مریض کے  
 علاج میں غلطی کرے اُس غلطی کے، بتاؤ کہ اسے طبیب کہو گے؟ اسی طرح اُس شخص کو جو کسی  
 حساب کتاب میں غلطی کرے اُس غلطی کے، بتاؤ کہ اسے محاسب کہو گے۔ گو کہ ہم سب مام بول چال  
 میں کہتے ہیں کہ طبیب بنے علاج میں یا محاسب بنے حساب میں غلطی کی گزیری مانتے ہیں ان  
 دونوں صورتوں میں وہ شخص من حیث الفن غلطی نہیں کر سکتا۔ لہذا سچے الفاظ میں یہ کہہ کر تم  
 صحت الفاظ کے بڑے دلدادہ ہو! میں یوں کہوں گا کہ کوئی اہل فن غلطی کر نہیں سکتا۔ اس وجہ  
 سے کہ غلطی بوجہ عدم علم کے ہوتی ہے۔ لہذا غلطی کا مرکب اُس حد تک اہل فن ہی نہیں ہے  
 کوئی شخص خواہ وہ اہل فن ہو یا فلسفی یا محکم ہو غلطی نہیں کر سکتا جب تک وہ اہل فن یا فلسفی یا  
 محکم ہونے کا مدعی ہے۔ ہر چند کہ عام طور پر یہ ضرور کہا جائے گا کہ فلاں طبیب یا فلاں محکم نے  
 غلطی کی۔ اس سنی میں تم کو یہ گزشتہ جواب کو سمجھنا چاہیے تھا۔ ہر طور صحت الفاظ کے ساتھ  
 وہ جواب یوں ہو گا کہ کوئی محکم من حیث الحکم غلطی نہیں کر سکتا۔ پس من حیث الحکم وہ جو کچھ  
 محکم سے کہا اپنے فائدہ کے لیے دے گا اور اسی کی تعمیل اُسکی رہنما پر فرض ہوگی۔ لہذا میں بھر



وہی کہوں گا کہ قوی تر کے نام نہ کے واسطے جو کچھ کیا جائے وہ اضمات ہے۔  
 س۔ "بہت معقول۔ تھرا سیما کو س! کیا تم مجھ کو اغانا کے اُلٹ پھیر کا اُستاد خیال کرتے ہو؟"

بہت بڑا اُستاد۔

س۔ "کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں م سے سوال صرف اس سبب سے کرتا ہوں کہ تم بحث میں ایک منظرہ میں پڑ جاؤ؟"

ت۔ "اس میں شبہ کیا ہے۔ بہر حال سقراط تم کو اس پال سے بھی کوئی نام نہ ہوگا۔ نہ تم مجھ کو کسی خفیہ دھوکہ سے منظرہ میں ڈال سکتے ہو نہ کسی علانیہ دلیل سے معقول کر سکتے ہو۔"

س۔ "میرے عزیز دوست۔ میرا ہرگز ایسا ارادہ نہیں ہے۔ خیر تا کہ پھر اس قسم کی غلط فہمی نہ واقع ہو مہربانی کر کے صاف طور پر یہ کہہ دو کہ تمہارے اس تہجد میں کہ "ضعیف تر کے واسطے وہ چیز کرتا جو حاکم یا قوی تر کے نام نہ کی ہو عین الضاف ہے۔" لفظ حاکم "اور قوی تر" تم معنوں اور عام فہم معنوں میں استعمال کرتے ہو یا اُن اصلی اور صحیح معنوں میں جن کا تم نے ابھی ذکر کیا؟"

ت۔ "میں یہ لفظ بالکل اصلی اور صحیح معنوں میں استعمال کرتا ہوں۔ لہذا اب آپ کے جتنا جی چاہے الفاظ کو اُسی طرح پلٹے پلٹے مجھ کو اسکی کچھ پردہ نہ ہوگی۔"

س۔ "کیا میں ایسا خبیثی ہوں کہ شیرے کھیلوں یا تھرا سیما کو س اتنے بڑے حکیم سے الفاظ میں دھوکہ بازی کروں؟"

ت۔ "ارادہ تو آپ کا ایسا ہی تھا، گو آپ کی حلیہ بازی چل نہ سکی۔"

س۔ "اب مذاق ہو تو نہ کر دو اور اتنا بتاؤ کہ اُس طبیب سے جس کو تم نے صحیح معنوں میں طبیب ٹھہرایا تھا، تمہاری مراد یہ پیداکرتے والا ہے یا مرینوں کو صحت دینے والا؟"

ت۔ "مرینوں کو صحت دینے والا۔"

س۔ "اور صحیح معنی میں جہاز راں سے کیا مراد ہے۔ علاج یا ملا حوں کا حاکم؟"

ت۔ "ملا حوں کا حاکم۔"

س۔ "اُس سے تو کوئی مطلب نہیں کہ وہ جہاز راں جہاز پر بھی ہو کیونکہ وہ اپنی موجودگی جہاز سے نہیں بلکہ اس وجہ سے جہاز راں کہلاتا ہے کہ وہ جہاز راں کا فن جانتا ہے اور ملا حوں پر حکومت رکھتا ہے۔"

ت :- ” سچ ہے :“

س :- ” تو پھر ان میں سے ہر ایک شخص اپنا ذاتی فائدہ بھی رکھتا ہے یا نہیں ؟“

ت :- ” بے شک رکھتا ہے “

س :- اور انکے فن کی کیا یہ غرض نہیں ہے کہ وہ اپنے نفع کے جو یا ہوں :-

ت :- بیشک ہے :-

س :- کیا مختلف فنوں کی کوئی اور غرض بھی ہو سکتی ہے سوائے اسکے کہ انہیں فنوں میں

آہٹائی کمال پیدا کیا جائے :-

ت :- اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟

س :- میرا یہ مطلب ہے کہ بالفرض اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آیا جسم انسانی بحیثیت جسم کے کمال ہے یا اسکو کسی مزید چیز کی ضرورت ہے تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اسکو ضرورت ہے ۔ چنانچہ اسی اصول کی بنا پر فن طب کی ایجاد ہوئی اسوجہ سے کہ چونکہ جسم انسانی ناقص ہے یعنی بحیثیت جسم وہ کافی و کمال نہیں ہے لہذا فن طب جو جسم انسانی کی بیرونی اغراض کو پورا کرتا ہے وجود میں آیا ۔ مجھ کو اسیدہ ہے کہ اب میرا مطلب آپ کے ذہن نشین ہو گیا ہو گا ۔

ت :- آپ کا خیال صحیح ہے ۔

س :- تو اب یہ صورت ہوئی کہ کیا فن طب بالذات ناقص ہے یعنی وہ کسی مزید مدد کا خواستگار ہے یا نہیں ۔ مثلاً آئندہ کام دیکھنا ہے اور کان کا سنا تو ان اعضاء کو ایک ایسے فن کی یقینی ضرورت ہے جو انکی اغراض کی تکمیل کرے اور انکو نفع پہونچائیں ۔ پس میں پوچھتا ہوں کہ کسی فن میں بحیثیت فن کوئی نقص ہے یا نہیں اس طرح کہ وہ اپنے اغراض کی ترقی اور فائدہ کے واسطے کسی دوسرے فن کا محتاج ہو اور یہ دوسرا فن اسی طرح کسی تیسرے فن کا محتاج الی غیر نہایت ۔ یا یہ صورت ہے کہ وہ فن اپنی اغراض کی آپ تحقیق کرتا ہے اور انکو فائدہ پہونچاتا ہے ۔ یا کسی فن کے واسطے یہ بالکل بغیروری ہے کہ وہ اپنے نقائص اور اسکا محتاج کی تحقیق اور تلاش کرے کیونکہ اس میں کسی قسم کے نقائص ہیں ہی نہیں ۔ نیز اس لیے کہ کسی فن کا بن حقیقت ، فن یہ کام نہیں ہے کہ وہ سوائے اپنے کسی دوسرے فن کے فائدہ کی تلاش کرے اور خود وہ حقیقی مسنوں میں ہر قسم کے نقائص اور معائب سے پاک ہے ۔ اب اس سوال کو

جیسا کہ ہم سے آپ سے ملے ہوا ہے الفاظ کے صحیح معنوں میں غور سے دیکھیے اور فرمائیے کہ ایسا ہے یا نہیں۔

م۔ بننا ہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔  
س۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ فن طب کو اپنے خاص فوائد یعنی نفع لب کے فوائد کا خیال نہ رکھنا چاہیے بلکہ جسم انسانی کے فوائد کا خیال رکھنا چاہیے۔  
م۔ جی ہاں۔

س۔ اور فن شہ سواری کو فن شہسواری کے فوائد کا خیال نہ رکھنا چاہیے بلکہ گھوڑوں کے فوائد کا اور اسی طرح کسی فن کو خود اپنے ذاتی فوائد کا خیال نہ رکھنا چاہیے (اس سوچ سے کہ وہ تو خود مکمل ہی ہے) بلکہ کسی شے کا جس سے کہ اس فن کا تعلق ہے۔  
م۔ بننا ہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

س۔ تو اب آپ یقیناً اس بات کو تسلیم کریں گے کہ ہر فن اپنے مومنوں سے یعنی اس پیر سے کہ جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے قوی تر ہوتا ہے۔

فقرا یا کو اس نے اس مسئلہ کو قبول کیا مگر کسی قدر پس و پیش کے ساتھ۔ اس کے بعد فقرا نے کہا کہ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی فن یا علم اپنے سے قوی تر کے فوائد کی تحقیق اور تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنے مومنوں کی جو اس سے منیف تر ہے۔

اس سوال کو بھی فقرا یا کو اس نے نہایت وقت کے ساتھ بالآخر تسلیم کیا۔ جب سب اصول تسلیم ہو گئے تو شرائط ملے کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ کوئی طبیب ہمیشہ طبیب اپنے ذاتی فوائد کا خیال نہیں رکھتا بلکہ اپنے مریض کے فوائد کا خیال رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ابھی ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ ایک حقیقی طبیب جسم انسانی کا حکمراں یعنی اس سے قوی تر ہے نہ کہ محض کسب زر و ثروت والا۔

م۔ البتہ یہ تسلیم ہے۔

س۔ اسی طرح ایک جہاز راں حقیقی معنوں میں ملاخوں کا حکمراں ہے نہ کہ خود ملاخ ہے۔

م۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔

س۔ تو اس قسم کا جہاز راں خود جہاز راں کے فوائد کا جو یا نہ ہوگا بلکہ ملاخ کے جو اس سے



منفعت تر ہے۔

تھراسیا کو اس نے اس کلیہ کو بھی حیراؤ قہراً منظور کیا۔

س۔ پس اس سے یہ صاف نتیجہ نکلا نہ وہ لوگ جو حکومت کے منصب پر ہیں وہاں تک کہ اس حکومت کا تعلق ہے وہ اپنے ذاتی اغراض کا نہ تو خیال کرتے ہیں نہ ان کے جوا میں ہلکا اپنے محکموں کا کہ جن سے ان کی حکومت کا تعلق ہے اور اپنے ہر قول و فعل میں وہ ہمیشہ انہیں کے قوانین کا خیال رکھتے ہیں نیز یہ کہ ان چیزوں کے واسطے جو بھی مناسب ہو جب بحث اس نوعیت تک پہنچی ہو ہر شخص کو ظاہر ہو گیا کہ عدل کی خیریت جو پیشتر کی گئی تھی اب بالکل برعکس ہو گئی تو تھراسیا کو اس نے بجا سے کوئی جواب دینے کے کہا

ست۔ سقراط یہ تو بتاؤ کہ تمنا ہی کوئی دویہ ہے یا نہیں؟

س۔ اس سوال کا کیا موقع ہے۔ تم کو پتا ہے کہ یہ سے سوال کا جواب دو، نہ کہ اس قسم کی پہل اور فضول باتیں پوچھو؟

ست۔ میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ اگر تمہاری کوئی دویہ ہوتی تو وہ تمہاری سخانی کا خیال کرتی تمہاری ناک پر بہ رہی ہے اسکو صاف کرتی اور شاید اسی بے توجہی کی وجہ سے تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے کہ تم ملکہ اور نگاہ بان میں بھی کوئی فرق نہیں کر سکتے۔

س۔ یہ کیونکر؟

ست۔ یہ اس طور پر تمہارا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ چرواہے اور گلہ بان اپنی بھیدوں اور اپنے ٹکوں کو مللاتے پلاتے اور انکو ہوتا آوازہ کرتے ہیں انکی خبر گیری کرتے ہیں شاید کسی دوسری نسل سے سوائے اسلئے کہ ان سے وہ خود اور انکے مالک یا لڑے اٹھائیں اسی طرح تمہارا یہ خیال بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں کے مالک (مالک سے میرا مطلب ان لوگوں سے ہے جو اپنی انصافیت عنان حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں) اپنی رعایا کے ساتھ ایسے چرواہوں اور گلہ بانوں سے شاید کچھ دوسرے انداز کا سلوک کرتے ہیں یا بالفاظ دیگر وہ رات دن کسی اور خیال میں رہتے ہیں سوائے اسلئے کہ وہ کیونکر اپنی رعایا سے منفع ہوں اور تم بدال و ظلم اور مادل و ظالم کے حقیقی مفہوم سے اتنے نا آشنا کہ تم کو یہی نہیں معلوم کہ اول اللہ کرہ نسبت میں دوسرے کے فائدہ کا نام ہے یعنی ظلم و قوی تمہارا حال کا اور خود تمہارے نقصان کا نام ہو

بیکہ قہر ماتحت اور ظالم کی بیشیت رکھتے ہو اور آخر الذکر یعنی ظالم ایک برعکس ہے یعنی اس کی  
 حکومت دراصل انہیں پر ہے جو سیدھے سادے اور منصف مزاج لوگ ہوتے ہیں اور اپنی  
 سادگی سے اپنے حاکم کا جو ان سے قوی تر ہوتا ہے کو ہارانتے ہیں اور اپنی خدمات سے اس کی  
 خوشی پوری کرتے ہیں اور اپنی ذاتی فوائد کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔ اسے میرے بھولے دوست  
 سقراط۔ تم ذیل کی مثالوں سے دریافت کر لو گے کہ ایک عادل ہر دیکھ اور ہر موقع پر بقابلہ  
 ایک ظالم کے ہمیشہ خسارہ میں رہتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک عادل اور ایک ظالم کے  
 ساتھ ایک شراکت ہوتی ہے تو فیج شراکت پر عادل کو ظالم سے نہیں زیادہ حصہ نہیں ملتا بلکہ  
 ہمیشہ کچھ کم ہی ملتا ہے۔ پھر معاملات سیاسی میں تم دیکھو گے کہ ادائے معمول کے وقت عادل  
 کو ہمیشہ ظالم سے کچھ زیادہ ہی دینا پڑتا ہے ہر چند کہ جائداد کی مقدار اور مالیت ایک ہی ہو، اور  
 حاصل کرتے وقت ظالم سب کچھ لے لیتا ہے اور بچا رہ عادل منہ دیکھ کے رہ جاتا ہے۔ پھر جب  
 کبھی حکومت کا عہدہ ان کو ملتا ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں بھی عادل ہمیشہ نقصان میں رہتا  
 ہے اس کے ذاتی معاملات۔ وجہ اس کی عدم توجہ کے اتر ہو جاتے ہیں اپنے سخت اصولوں کی پابندی  
 کی وجہ سے سرکاری روپیہ سے یہ کوئی فائدہ نہیں حاصل کر سکتا۔ پھر ان سب پر طرہ یہ کہ  
 اس کے دوست، ورثا سا بھی اس سے ناراض ہو جاتے ہیں جب کبھی وہ انصاف کے خلاف  
 کوئی خدمت کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ظالم کی حالت ہر چیز میں اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے گھنا  
 سے میری مراد وہی شخص ہے جو ایک بڑے پیمانہ پر حکومت کی قوت رکھتا ہو، تم کو اپنے خیال پر  
 ہمیشہ ایسے ہی شخص کا تصور کرنا چاہیے۔ اگر یہ جائز تھا تم کو مشہور ہو کہ اپنے ذاتی مفاد کے لحاظ سے  
 ظالم زیادہ دارا ہونے سے کتنا اچھا ہے۔ یہ حقیقت نہایت آسانی سے تم پر واضح ہو جائیگی اگر تم  
 اپنی توجہ ظالم کی اس کائنات میں حیرت کی طرف مبذول کرو کہ جس میں ظالم تو ہمیشہ شادمان اور کامیاب  
 اور معمول جن پر ظالم ہوتا ہے اور جو بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتے ہمیشہ دریش اور ناکام رہتے  
 ہیں۔ یہی صورت خلق انسان حکومت کی ہے جس میں کہ چھوٹے پیمانہ پر نہیں بلکہ بڑے اور اعلیٰ  
 پیمانہ پر حکومت دوسروں کی باادکھام گنڈا یا غنیمت طریقہ سے منظم کرتی چلی جاتی ہے اور اس کی  
 شان پرواہ نہیں کرتی کہ وہ جائداد یا کچھ ہے یا پراپوٹ اثنا میں لگی ہے وہ دینی اغراض سے  
 متعلق رکھتی ہے یا دنیاوی کاموں سے۔ وہ ایسے جرائم کا ارتکاب معمولاً کرتی رہتی ہے کہ

اگر کوئی شخص واحد کرے اور گرفتار کر لیا جائے تو وہ مرزا کا مستوجب اور ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اور جب وہی جرائم شخص اس سے سرزد ہوتے ہیں تو اس قسم کے مجرموں کو کبھی مذہب شکن کبھی انسانوں کے لئے بھاگنے والے کبھی چور، قزاق، اور ڈاکو کہتے ہیں، مگر لطف یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے ہم وطنوں کی ہمدردی کے علاوہ ان کی ذلت کا بھی ہائب ہوتا ہے یعنی ان کو غلام بنا دیتا ہے تو مذکورہ بالا بڑے لغتوں کے چچا، ایسا شخص نہایت کامیاب اور خوش نصیب کہلاتا ہے۔ نہ صرف اپنے ہی شہر اور وطن کے آدمیوں کی زبان سے بلکہ تمام سے غیر لوگوں کی زبان سے بھی جو اس کے ظلم کے کما رٹا مے سنتے ہیں۔ تو اس سے ثابت ہو کہ لوگ ظلم کو برا کہتے ہیں اس

وجہ سے کہ وہ اسے ارتکاب سے نہیں بلکہ اس کے اعمال سے ناگفت ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے میرے عزیز دوست، ظلم اگر بڑے پیمانہ پر کیا جائے تو بمقابلہ عدل کے زیادہ قوی، زیادہ وسیع اور زیادہ شاندار چیز ہے، اور جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں عدل قوی تر کے فائدہ کا نام ہے اور ظلم ذاتی نفع، ورنہ فائدہ کی چیز ہے۔

مرزا محمد عسکری

(الناظر، جنوری ۱۹۲۶ء)



## افلاطون الہی

ایک بڑے صاحب کشف و کرامات نے ایک مرتبہ اپنے مکاشفہ سے معلوم کیا کہ تمام عالم افلاطون کے انوار سے ملبوس ہے۔ اسی افلاطون کو افلاطون الہی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس نے فلسفہ معرفت الہی جو اپنے استاد سقراط سے سیکھا تھا، اپنے شاگردوں کو تعلیم کیا۔ یہ ایک یونانی اہنسل حکیم شہر اٹینس کا رہنے والا تھا جو ۴۲۷ برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام اس عالم میں آیا تھا، اور عمر کی ۸۰ سترہیں طے کر کے ۳۴۷ ق م میں رہ گئے عالم جاوداتی ہوا۔ اُسکے باپ کا نام ارسلون تھا جو آل نذر دس سے بیان کیا جاتا ہے، اور اُسکی ماں کا ناما ہے کہ سولن کی اولاد میں سے تھی۔

ابتداءً عمر ہی سے افلاطون کو سقراط کی صحبت نصیب ہوئی۔ وہ پوجائیں لارٹوس کا بیان ہے کہ اُس کا نام پہلے ارستاکلیز تھا، چونکہ اُسکے شانے بہت چوڑے تھے اس لیے افلاطون نام پڑ گیا۔ نیز پہلے یہ شعر بھی کہا کرتا تھا جسکا سارا دفتر سقراط کی صحبت لینے کے بعد اس نے نذر آتش کر دیا۔ یعنی سقراط کے علم حقیقی کے سامنے اشعار اس قدر مبتذل نظر آئے کہ اُسکی نظر سے بالکل گر گئے، اور اُس نے خیال کیا کہ ایسی شے کا میری طرف منسوب ہونا درست نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سقراط کی وفات کے بعد دشمنوں کے ڈر سے یہ اور اسکے ہمراہ سقراط کے دربار احباب نیز حکیم اقلیدس سب نے مگارا میں جا کر پناہ لی۔ جب ادھیڑ عمر ہوئی تو ایک مقام سنی سوس کو انتخاب کر کے وہاں اپنا ایک آشرم قائم کیا اور فلسفہ الہی کی تعلیم دینی شروع کی۔ اس کی تعلیم بالکل سقراط کی تعلیم کا نقش ثانی تھی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ سقراط کے کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضرور ہے کہ پہلے افلاطون کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے جو سکالے لکھے ہیں وہ دنیا کی عجیب کتابوں میں سے ہیں اور جو فلسفہ اُن میں بیان کیا ہے وہ ایک طرف انسان کے ذہنیات سے بحث کرتا ہے اور دوسری طرف ایسے پُر اسرار مسئلے بیان کرتا ہے جو اہل تصوف

کے کلام سے شاہت رکھتے ہیں۔ غزنوی میں بیج کو سقراط نے بویا افلاطون نے اسکی پودش کی پھر اس میں کوپس پھوٹیں اور ایک پھنار اور خست بن گیا۔

اسکے شاگردانہ جذبات اور عالمگیر تخیل نے اسکے ذہنی استدلالات کو ایک بڑے دلچسپ پیرایہ بیان میں ڈھالا ہے۔ اسکے ذہن میں سقراط کی تعلیم اچھی طرح مجسم گئی تھی کہ حق اور حقیقتی دنیا میں موجود ہے اور دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اس اثر نے اتنی ترقی کی کہ وہ خیر و صلاح کی وحدانیت کے خیال پر اور اس بات پر کہ اس سب کا انحصار ظم پر ہے منبسطی سے قائم ہو گیا اور تحقیق حق میں قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ حتیٰ کہ اس راوی خاص خاص اعمال خیر اور انفرادی نیکیوں کے خیال سے ترقی کرتا ہوا وہ عام نیکیوں کے تصور تک پہنچا۔ اور وہ اس سے کلیات کی تہ اور کائنات عالم کی حقیقت اور ظم کی وحدانیت اور وحدت وجود کے مسائل تک رہنمائی حاصل کی۔ مگر اس نے اسی حد تک پہنچ کر قیام نہیں کیا اور کثرت فی الوجدت اور وحدت فی الکثرت کے تماشے بھی دیکھنے لگا۔

لیکن ان صوفیانہ ترتیبات کے بعد وجد میں وہ تجربات انسانی کے واقعات کو فراخ نظر نہیں کرتا رہا ہے۔ ایسے اخلاقی اوصاف میں جو ہر شخص کے مرکوز خاطر ہونی چاہئیں وہ تصور وحدانیت و تصور خیر و تصور حق کو بھی جگہ دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اخلاق انسانی اور حکومت و سلطنت کے اصول و طرق کی تحقیقات میں بھی کام زن نظر آتا ہے۔ اسکی تحقیقات جس قدر ترقی کرتی جاتی تھی منطق اور نفسیات کے اصول ابتدائی واضح اور نمایاں ہوتے جاتے تھے اور ان حقائق کی بنیاد پر ہی نظر آتی تھی جنہیں اسکے شاگرد و رشید اسطاطالیس نے علوم کی شکل میں بہت کافی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بعد میں ترتیب دیا۔ افلاطون اگرچہ اصول ریاضیات کی بڑی قدر کرتا تھا مگر خود اس نے ریاضی یا دیگر ایسے علوم کی ترقی کی طرف زیادہ میلان نہیں ظاہر کیا۔ اسی طرح وہ سقراط کے علم طب سے کافی بہ روی رکھتا تھا مگر خود اس میدان میں نہیں آیا۔ ایسے ہی یوسی یوس اور ڈیما کریٹوس نے علوم کی طرف جو زائد مال کے بسیات کے مقدمات و ابتدائی اصولوں پر مشتمل تھے اس نے کوئی توجہ نہیں کی۔

افلاطون نے مکانات کو اگر بنو رکھا جائے تو یہ صاف مترجہ ہوتا ہے کہ اس میں دو قسم کے جذبات کا اثر زیادہ ہے یعنی انسانی ترقی کا جذبہ اور ذہن انسانی کی قوت ابتر می کا ایک غیر تیز

یقین۔ اسکی طرف مسئلہ تصورات کو عموماً منسوب کیا گیا ہے لیکن وہ مسلسل ترقی ذہنی کا صرت ایک رخ ہے جو اس فلسفہ پر جا کر منتہی ہوتی ہے جس میں ارادہ کی رہنمائی عقل کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ لیکن اشیاء فی الخارج سے مبتعد شروع ہی سے محققین یونان کو لگاؤ تھا اسکا تعامنہ یہ ہوا۔ نیز خود افلاطون کی شاعرانہ اُفتاد طبیعت کا یہ اثر ہوا کہ افلاطون کے تصورات میں جو حقیقی روحانیت تھی وہ کچھ عرصہ کے لیے پردہ کے پیچھے آگئی اور اس مقام پر آکر طبیعت رک گئی جہاں پر کلیات جزیات سے باقی قافی سے ادب و ادبی "شدنی" سے الگ نظر آیا کرتی ہیں اور جہاں کہ حقائق موجودات کے اصول ہائے اولیں عالم حقیقی سے باہم ایک دوسرے سے بے تعلق اور علیحدہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن رشتہ رشتہ پر وہ اُٹھتا گیا اور اس ظاہری و باطنی اور نوامیس نامہ اور منظر قدرت اور قوسے متخیلہ اور عالمہ کا تصور زیادہ واضح اور صاف نظر آنے لگا تجربہ و تعمیم خیالات و پیش بینی اور استنباط کی اصل حقیقت واضح ہونے لگی اور تجربہ انسانی کی مدد سے تصورات و تمخیلات کی تصدیق ہونے لگی اور عالم خیال کے گوہر شاہوار ستولوں میں اور اظہار خیالات کی دوسری صورتوں میں منسلک نظر آنے لگے۔ انہیں اثرات کا درجہ "مکالمات" میں صاف دکھائی دیتا ہے جسے تاریخ فلسفہ کا ایک رسالہ کہنا نازیبا نہ ہوگا۔ لیکن جو خیالات کہ مکالمات میں ظاہر کیے گئے ہیں وہ کہیں کہیں بے ربط سے نظر آتے ہیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ افلاطون نے اپنے فلسفہ کی کہیں ایک باقاعدہ مرتبہ شامل ترتیب دی ہو لیکن یہی سب اصول و خیالات ہیں جنہیں اسکے شاگرد ارسطو طالعہ لیس نے بعد میں زیادہ عکاسانہ و عالمانہ ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے عالم کے سامنے پیش کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون اپنے استاد کی تعلیم اور مسائل وحدت وجود میں اسقدر ذہنی انہماک رکھتا تھا کہ کسی باقاعدہ علم کی تدوین کی طرف اس نے توجہ نہیں کی اور اس کام کو اپنے بعد آنوا لے گا، کے سپرد کر دیا گیا۔

افلاطون کی تعلیم میں دو بہت زبردست قوتیں نظر آتی ہیں۔ ایک توحن کی محبت اور دوسری ترقی انسانی کا جوش و دھولہ۔ کتاب "جمہوریت" میں یہ دونوں مذبذبات یعنی ایک ذہنی دوسرا علمی ایک ہی جگہ سمو کر جمع کر دیے گئے ہیں۔ مسئلہ تصورات جو اسکی طرف منسوب ہے یہیں بھی بہت کچھ عمر کی رفتار سے ساتھ تفرق نظر آتا ہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے جو ایک خیالی ہر جگہ موجود اور ہر جگہ غالب ہے وہ یہی ہے کہ عقل سب سے برتر اعلیٰ و اسف شے ہے اور غیر حق و دونوں ایک



ہی شے ہیں۔ اس اصولی خیال سے بہت سے خیالات و تصورات متفرع ہوتے گئے ہیں چنانچہ نفسیات، تعلیمات و اصلاح سیاسی کے اصول اسی طریق پر پیدا ہوئے اور اسی آب و ہوا میں بڑھے اور بارور ہوئے ہیں۔ زمانہ حال کے حکماء نے مابعد الطبیعیات بھی اسکے علم مرتبت و ذہنی مدارج حقیقی تعلیمات سے اس قدر متاثر نظر آتے ہیں کہ ان میں کا ایک نام آدر شخص فیثو کہتا ہے کہ اگر ہم حقائق فلسفہ کے سمجھنے میں راہ صواب پر ہوں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نے افلاطون کے مطالبے سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے اور اگر ہم غلطی کرتے لگیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نے افلاطون کو صحیح طور سے اور اچھی طرح سمجھا ہی نہیں۔ اسکے شاگرد ارسطو کا اثر اُس کے مدارس کے حدود سے باہر نکل کر بہت دور تک پہنچا اور اس نے لوگ زیادہ باتیں ہیں۔ مگر وہ اپنے استاد کا اس قدر مین منت ہے اسکا اندازہ بھی کسی نے کیا ہے؟

نیو، کرائی سہیوس اور ابنیوروس نے جب قدر علم افلاطون سے اخذ کیا ہے اتنا خود انہیں بلا واسطہ نصیب ہوا۔ اپوٹارک اور رومی فرقہ اسٹوئک کے اخلاقی تصورات جنہوں نے زمانہ جدید پر اس قدر اثر ڈالا ہے اگر افلاطون نہ ہوتا تو عالم میں نظر ہی نہ آتے۔ جدید تیار غورثی مسائل و مسائل جدید افلاطونی مسائل کی دوسری شکل ہیں جو زیادہ مرتب و مدون ہے۔ متشککین افلاطون کے ہی گروہ سے ہوتے ہستیار ہستمال کرتے ہیں۔ مذہب عیسوی پر اسکا ستیم الشان اثر پڑا ہے۔ زمانہ جدید میں جرمنی کے ایک مشہور شلیر مگرٹے در اصل فلسفہ افلاطون ہی کی ناقذانہ تکمیل شروع کی اور اسکی ترجمانی اختیار کی تھی۔ اسکے بعد کارل ہیرمان اور جوزف شوٹے علم ہا تہذیب میں لیا۔

افلاطون کا فلسفہ مونیائے اسلام کے فلسفہ وحدت وجود سے بہت مشابہ ہے ذیل میں دو وزن کی شاہیں دیکر اسے کسی قدر واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے: افلاطون نے جن مسائل وحدت وجود کو مختصراً بیان کیا ہے صوفیائے اسلام انکو اشعار و امثال کے پرمے میں بیان فرماتے ہیں۔

افلاطون اس مادی دنیا سے بالاتر ایک دوسرا حقیقی عالم تصور کرتا ہے اور اُس عالم بھی ترقی کر کے عالم قدس میں جاتا ہے اور وہاں ثانی فی اللہ ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور انسان، مادہ اور روح کے درمیان ایسی کوئی خلیج نہیں ہے جسے عبور نہ کیا جاسکے۔ تمام عالم میں بس ہی جلوہ نظر آتا ہے اور وحدت محض ہے اور اسکا اظہار صرف دیگر صفات کی نفی کرنے سے

ہوتا ہے۔ صوفی اس خیال کو نور، محبت، شراب، حش، سمندر وغیرہ کے استعارات ہستمال کے واجب الوجود کے منہوم کو ادا کرتے ہیں، مثلاً

نہ شرتیم نہ غزیم نہ برتیم نہ بکسریم  
نہ تن باشد نہ جان باشد کہ من از جان جانانم  
(مولانا دوم)

دیگر  
نہ چرخ فلک حلقہ دریاں ماہ فرود شد  
آں بھر کئے کمر و بہر پارہ ازاں کفت  
ہر پارہ کفت جسم کزاں بھر نشان یافت  
کشتی وجودم ہمہ در بحر تماں شد  
نقشے ز قلاں آمد و جسے ز قلاں شد  
در حال گذارید و دریں بحر رواں شد  
(سنہ)

دیگر  
خورشید رخت چو کشت پیدا  
مہر رخ تو چو سایہ پگندہ  
ذرات دو کون شد ہویدا  
زاں سایہ پدید گشت  
(سنہ)

دیگر  
ایک گوہرے چو بینا جو شید و گفت دریا  
کفت کرد و کفت زمیں شد و زد و دوا و سا شد  
(سنہ)

دیگر  
آں بود چہ بود عین آں موج  
آں موج چہ بود عین دریا  
(سنہ)

افلاکون کہتا ہے کہ عقل کلی ذات واحد کی سب سے پہلی مخلوق ہے۔ وہ عقل کلی عقل جزوی میں  
تمیز کرتا ہے۔ اسی خیال کی شرح ابن رشد نے کی ہے اور اسی کے متعلق یہ قول ہے کہ اول باخلق اللہ  
عقل۔ پھر افلاکون کہتا ہے کہ عقل کل سے روح کلی پیدا ہوئی جو عام درکات اور عقل کل کے  
ابن ایک ملائے والی زنجیر کی طرح ہے۔ اسکی دو قاصبتیں ہیں۔ ایک طرف تو عقل کلی سے  
نفس حاصل کرتی ہے، دوسری طرف اس نفس کو عالم درکات تک پہنچاتی ہے۔ اس روح کلی  
والے تصوف نفس کل یا جان کل کہتے ہیں۔

جان اول منہ درگا و شد  
بخت باں اندر مقام دیگر است  
جان باں خود منظر است  
بادہ جاں را تو ام دیگر است  
جسم پیش جسم باں چون قطرہ  
مبہم را بود جسم باں بہرہ

مدحیت یکدگر خود پیش نیست  
 اسی خیال کو شہید ہی نے نسبت میں ادا کیا ہے :  
 بیان نوتا آ سماں جولاں کنیت  
 (منہ)

اور مراد سے واصل اور مخلوق سے مل  
 فلسفہ افلاطون : صدا دیتا ہے کہ وحدت محض سے تعدد کا ظہور اس لیے ہوا کہ ہر کال شے  
 ایک دوسری شے کے پیدا کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ جو تے واحد ہے وہ اثر پذیری و نقصان و  
 کمی سے منزہ ہے۔ اسکے جوہر میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اسکی قوت بہت زبردست ہوتی ہے  
 اور جوش ارتقائی رہتی ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے درخت کے اندر کا دودھ جو اس کے  
 ریشہ ریشہ میں دور و کرتا رہتا ہے۔ وہ اس سورج کی کرن کے مشابہ ہے جو فضا کو سنور کرتی ہے  
 اور ہر شے جس قدر قرب الہی میں ہے اسی قدر حدائے عزوجل کا جلوہ اپنی ذات میں رکھتی ہے  
 اور اسکی کوشش ہوتی ہے کہ اعلیٰ کی طرف ترقی کر کے اس ذات واحد کی طرف رجوع کرے جسکے  
 بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ دنیا اسی جدوجہد کے لیے پیدا کی گئی ہے اب ان خیالات کو اہل  
 تصوف کے کلام میں لے کر آج فرمایا جائے۔ مولانا دہم کہتے ہیں۔

حق گفتش نے مرد و زان گنج بزم من در تھاں  
 جستم کہ تا پیدا شود آں گنج احسان و عطا

ولہ

چوں روح در نظارہ نداشت ایں کیفیت  
 نظارہ جمال خدا جسے خدا نہ کرد

ولہ

ما بقا کبود و ایم یار ملک بود و ایم  
 از ہماں جا رویم خواجہ کہ آں شہر است

ولہ

من تا زحی کردم کز زنت پر و ازم  
 از ہر چینی سودے جاں بافتن اولے تو  
 جانم ز پے عشقت شمس الحق تبریزی  
 من کا ہم شمعیت افسر ایہ وافر دید  
 فاش کہ ہماں ارزد لے خواجہ کہ میجوید  
 بے پائے چو کشتیا در کبریا می پوید

ولہ

پیش از اس کا ندر جہاں باغ و زواگور بود  
 ایہ بعد از ازل لات انما الحق می زود  
 پیش از اس کہ تیش دل برب اصل مار شد  
 از شرب لایزالی جان ما مخور بود  
 پیش از اس کہیں دار و گیر و تکتہ مشور بود  
 از استحقاق عیش ما مسور بود



افلاطون اور اہل تصوف دونوں یہ کہتے ہیں کہ انسان کچھ نہ کچھ ضرور مختار ہے گوارا سکا اختیار نواسیں اذنی راہی کے ماتحت ہے یعنی جہاں تک اسکا تعلق نفس کی اطاعت سے ہے وہ آزاد و مختار بالکل نہیں ہے گوارا سے یہ اختیار حاصل ہے کہ جنابات کی پیروی نہ کرے بلکہ عقل کی پیروی کرے۔ چنانچہ مولانا دہم کہتے ہیں

گو بند عشق چیت گجو ترک اعتبار ہر کو ز اختیار نہ دست اختیار بست

روح کی دوزخ میں جسم کے اندر وہ فطرت کا ایک جزو ہے۔ حالت روحانی میں دو عالم مثال میں ہے اُس نے اس عالم سفلی کی طرف بیشک ہبوط کیا ہے۔ لیکن عالم علوی کی طرف مراجعت کرنے کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اس میں اگر کوئی کثافت یا نقصان پیدا ہو جاتا ہے تو صورت جسم کی صحبت اور اس عالم سفلی کے تعلق کی وجہ سے اس کدورت و غبار کو پاک کرنے کے لیے ہر وقت وہ مضطرب رہتی ہے۔

اب اس بیویں صدی میں فلسفہ کے بیان کے متعلق جو خاص طریقہ رائج ہے وہ زیادہ تر تاریخی ہپاویے رہتا ہے۔ ادبی تنقید صرف اسی قدر رو گئی ہے کہ حسن و جمال کی مختلف شکلوں کو اظہر کے سامنے عیاں کر دیا جائے اور ان مختلف طریقوں کو ظاہر کر دیا جائے جن میں انسان نے مختلف زمانوں اور مختلف زمانوں نے حسن و جمال کے مسئلہ اور اصول کو حل کیا ہے۔ فلسفہ ان مشن کرہ مل و توفیحات کی صورت ایک تصویر ہے۔ علم مذہب بھی صورت ان خود بخود پیدا ہوئی ہوشتوں کی ایک تاریخ ہے تاکہ ایک مسئلہ رانی کی توحید ہو سکے۔ تاریخ بھی اسی طرح ان تمام اشیاء کے علم کی ایک لازمی صورت ہے جو تغیر پذیر ہیں اور حیات مسلسل کے قوانین کے تحت واقع ہو کر رہا ہے۔ غرضیکہ ایک نقاد کی نگاہ میں قوت اور اک اسی طرح نوع انسانی میں نشوونما پاتی ہے جس طرح کہ نزد واحد میں۔ افلاطون کے زمانہ میں برہنہ پر صفت "بودن" کے لحاظ سے غور کیا جاتا ہے لیکن اب صفت "شدن" زیادہ نظر میں رہتی ہے اور تمام علوم مثلاً فلسفہ، قانون، سیاسیات اور فنون و شاعری پر اسی نقطہ نظر سے غور کیا جاتا ہے اور جو کچھ ہم فلسفہ کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں اُس میں خاص فلسفہ سے بہت کم اور تاریخ سے زیادہ بحث ہوئی ہے۔ فلسفہ قدیم اپنے اندر ایک جاہلیت لکھا ہوا رہنجامیت کو اگر ہم تلاش کریں گے تو ارسطو و افلاطون کی تصنیفات میں برجہ اعلیٰ پائیں گے۔ افلاطون نے مختلف کتابیں علوم فلسفہ و سیاسیات وغیرہ پر لکھی ہیں۔ ذیل میں ہم ان

کتابوں کے نام مد کسی قدر صراحت مضمون کے ناظرین کی دلچسپی کے لیے درج کرتے ہیں:

۱۔ **ایلاویا**۔ یعنی اجابات۔ ان میں سوال و جواب کا وہ طریقہ ہے جو سقراط کے ساتھ مفسرین ہے۔ تعلیمات سقراط کو اسکی اپنی شان میں دکھایا گیا ہے اور سوسنٹائی طریقہ کی طرف سے لوگوں کی طبیعت ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فلسفہ و نفسیات و منطق کو سیکھانے سقراط نے یوں کیا تھا کہ ان لوگوں نے ترقی دے کر بگ و بار دار درخت بنا کر دکھایا ہے۔ اس رسالہ کے تین حصے ہیں (۱) حالات قبل الزام (۲) مابعد الزام و سزا (۳) بعد حکم سزا۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ موت کوئی بڑی شے نہیں ہے۔ وہ یا تو ایک آرام کی لمبی تینا ہے یا ایک دوسرے ہی عالم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے آدمی کو اس زندگی میں جانے کے بعد کوئی بڑائی نہیں پہنچ سکتی۔ نکالنا نکالنا تو میں اس حکیم کے فلسفہ کا غیر مرئی اور مونیانہ رخ ہے۔ سقراط نے جن چیزوں کو اشارہ کے طور پر بیان کیا تھا افلاطون نے اسکو واضح کر دیا ہے۔ سقراط کی تعلیم سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حق اور غیر دونوں کا وجود موجود ہے۔ لیکن اس نے یہ توضیح مزید کی کہ نیکی ایک امداد و انگیر شے ہے اور اسکا اختصار علم شے ہے۔ اس مسئلہ کی وہ خوب تحقیق کرتا ہے اور یہاں تک جستجو اور روشنائیاں کرتا چلا جاتا ہے کہ مہربانی غور و خویش کرنے والوں کو بھی سرسٹ فلسفیوں کا علم ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اسباب و وجہ بھی معلوم ہو جاتے ہیں اور اس راہ سے وہ ایک عام کلیہ تک پہنچ جاتے ہیں اس راہ میں وہ خاص سے شروع کر کے عام نتیجہ پر پہنچتا ہے اور بالآخر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دنیا میں ایک ایسی شے بھی ہے جسے ایک عالمگیر نیکی یا غیر کلی کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ ان نکالنا نکالنا میں سقراط ہی کا فلسفہ نہیں ہے بلکہ افلاطون کے اپنے ذاتی خیالات بھی ممانت نظر آتے ہیں۔ وہ افلاطون کے زمانہ کی ایک ذہنی و علمی زندگی کی اعلیٰ درجہ کی تصویر ہیں۔ مگر ان سب کی بنیاد وہی سقراطی تعلیم ہے۔ تو افلاطون کی اپنی روشنائیاں اور انکشافات بھی بہت ہیں اور بحثوں میں اخلاقی اور سیاسی و مابعد طبیعی یا حکیمانہ اور مونیانہ شامل ہیں۔ سقراط کہتا ہے کہ نیکی کی تعلیم دنیا مشعل ہے۔ پر وہ تو گور اس کہتا ہے کہ یہ ممکن ہے۔ اس دونوں کی بحثوں میں افلاطون ایک بار ایک امور کی طرف اشارہ کرتا ہوا اپنے خیالات کا بھی اظہار کرتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خارجی اور ذہنی نقطہ اس نظر میں بڑا فرق ہے۔ نیز ایسے مبادیوں میں جو مفسر ذہنی ہیں اور ان میں جو خارجی ہیں اور وہ ذاتی پاسکے ہیں بڑا فرق ہے۔ آدمی میں پیدا ہوتے ہی تمام اشیاء کا علم موجود رہتا ہے قدرت

کی یہ ایک رویت ہے جسے وہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ علم وہ اپنے ساتھ لاتا ہے مگر یاد نہیں کرتا  
یعنی یہ علم ایک خاموشی کی حالت میں زادیہ خمول میں پڑا رہتا ہے۔ اور اگر اس سونے والے کو  
بیدار کیا گیا اور دوسرے امور کی دوسے اس سے کام لیا لیا تو وہ پھر نظر کے سامنے آ جاتا ہے اور  
یاد تازہ ہو جاتی ہے پس علوم انسانی کی ترقی کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ تقدس و پاکی کی  
صفت منصف مزاجی کی صفت کا ایک جزو ہے اور اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ خدا کی عبادت  
تہذیب و قربانی کے ذریعہ کی جائے۔ مذہب و اخلاق میں کوئی تباہی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی  
مواصلت ہے۔

فیثو میں دو بیان کرتا ہے کہ روح ایک ازلی دایرہ شے ہے

روح انجوں صالح دتن تاقہ است	روح اندر وصل تن در تاقہ است
جسم را بنوہ کبیر جاں برہ	جسم پیش بھر جاں چوں قطرہ
میل جاں اندر میات و درجی است	نراںک اندر لامکاں اصل وی است

(مولانا روم)

اسی خیال کو فیثو میں افلاطون ترقی دیتا ہے۔ موت سے مراد روح کی جسم سے علیحدگی ہے  
اور یہی شے ہے جسکی تمنا ایک فلسفی کیا کرتا ہے۔ اس لیے کہ جسم تغیر و تصور کی راہ میں حامل  
ہوتا ہے اور جسمانی خواہشات سے فلسفی کی مدای جناب رہتی ہے جو باقی فرسوت کی مدد سے  
ختم ہوتی ہے۔

آزود م مرگ من در زندگی است چوں رہم زین زندگی پائیدگی است (منہ)  
فیثو میں افلاطون ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی نابینا بچہ کی تعلیم کی وجہ سے تجربہ کار  
سے قلع نظر نہیں کرنا چاہیے۔ جس کا کام یہ ہے کہ ہم میں چھپے ہوئے علوم کی یاد تازہ کرے اور  
حق کی تلاش میں شہک رہ کر احساسات کے قبضہ و تصرف سے آزادی حاصل کرنا چاہیے۔

مکالمات سمپوزیم و فیثو روس دونوں مسائل تصوف سے روشناس کرتے ہیں۔ افلاطون  
رومانیات سے ہے اور افلاطون نے مسئلہ عشق انسانی کو ان میں بیان کیا ہے۔ سارا عالم سن و  
جمال سے وابستہ ہے۔ عشق و محبت ہی صرف اکیلا سی شے ہے جس کی طلب بغیر کسی مفید و منافع  
کے کرنی چاہیے۔ ولولہ حسن و جمال خود اپنی جگہ پر مقصود بالذات شے ہے



عشقائے گرے رنگے بود عشق نبود عافیت ننگے بود

عاشق اپنے "جزو ثمانی" کی تلاش میں سہک نہیں رہتا بلکہ حسن و جمال کی تلاش میں رہتا ہے۔  
یہ تلاش حسن و جمال ہر شے میں ہوا کرتی ہے اس لیے کہ ہر شے میں حسن و جمال ہے اور جتنی موجود ہے وہ

ملکت حق و رتقا و در بدر کرد مارا عاشقان ہمد گرد  
لیک شمع عشق چوں آں شمع نیست روشن اندر روشن اندر روشنی ست  
بوسے آں دلبر چو پر ان می شود آں زانہا ملہ حیراں می شود

گلابیاس میں افلاطون انصاف کے ایک اعلیٰ درجے کے ہونے کے خیال کی تائید کرتا ہے  
اپنی جمہوریت میں ایک ذہنی سیاسی جماعت قائم کر کے وہ اس انصاف کی نوعیت کی شرح  
کرتا ہے۔ گلابیاس میں یہ بحث ہے کہ خوشامد ایک قسم کی ایسی سرت پونچا کر جو بلا علم کے حاصل  
ہوتی ہے آدمی پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ ملاقات لسانی کوئی فن نہیں ہے۔ اور ترغیب ایک قسم کی  
پوشیدہ قوت کا نام ہے۔ پس وہ یہ نتیجے استخراج کرتا ہے کہ:-

(۱) ظالم آدمی اپنی خواہش پر نہیں بلکہ اپنی پسند پر عمل کرتا ہے۔

(۲) ظلم کرنا زیادہ بُرا ہے علم سنا آتا پر انہیں۔

(۳) مجرم کے لیے سزا پانا سزا سے بچ جانے سے بہتر ہے۔

(۴) علم معانی و بیان و بلاغت کا سرور قائم ہے یہ ہے کہ دشمنوں کو سزا پانے سے محفوظ رکھے

رسالہ جمہوریت افلاطون کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے اس نے انصاف پر بحث  
کی ہے جو سب سے اہم مسئلہ ہے۔ پھر اس نے ایک ایسی ریاست کا جو کال لکھی جاسکے چرچہ کیا

ہے۔ اس میں انصاف کے حدود و تعریف بھی بیان کرتا ہے خواہ وہ حدود یا تعلق نفس ریاست  
ہوں یا تعلق افراد ہوں جو اس ریاست میں رہتے ہیں۔ پھر وہ اشتراکیت سے بحث کرتا ہے۔

اور اسپرادرار کرتا ہے کہ صورت حکما کو بادشاہ بنایا جائے اور جو عمال و حاکمان وقت ہوں انہیں

تہذیب افلاق و حکمت کی تعلیم دینی چاہیے۔ اسکے بعد پھر وہ بیان کرتا ہے کہ ریاست و حکومت

کا ازالہ کب اور کس طرح شروع ہوا کرتا ہے اسکے اسباب کیا ہیں اور خراب اور ظالمانہ حکومت

کے کتنے ہیں۔ افلاطون بڑے اور بیلے دونوں پہلو بیان کرنا چاہتا ہے تاکہ ایک کو حاصل کرنے

کی اور دوسرے سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ پھر وہ کچھ قواعد و منوال بیان کرتا ہے

افلاطون کی تحریرات میں جو شے عام طور پر نظر آتی ہے یعنی تصویر اتحاد اس سے یہ کتاب بھی خالی نہیں ہے۔ اور یہ اصول کہ دماغ کو جسم کے مقابلہ میں سیاسی برتری حاصل ہے صاف صاف صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔

منطقی مکالمات کے طور پر اس نے بعض رسالے لکھے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:-  
 یوتھو ڈیوس۔ پارسی نڈیز۔ تھیٹی ٹوس۔ سوفسٹ۔ آئیس مین۔ فلی ٹوس۔ اول الذکر میں وہ  
 سقراط کی زبانی یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک فلسفہ کی ضرورت ہے اور سب سے بڑا فلسفہ حکمت سلطنت  
 ہے۔ اسی سلسلے میں وہ سوفسطائیوں کے خیالات کی ہنسی اڑاتا ہے۔ ثانی الذکر میں ایسے صاف  
 مثلاً انصاف۔ من و جمال یا خیر و خوبی کی تعریف بمقابلہ اول الذکر کے درجہ بالا زیادہ ذہنی اور  
 بھر دینے والی کی گئی ہے۔ اسکا خیال ہے کہ ایک اصول کو تسلیم کرنے کے بعد اس سے جو نتائج  
 منطبق و مستخرج ہوتے ہیں ان کا صرف استفادہ کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اصول مذکور کو دیکھ کے  
 جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اُسے بھی دیکھنا چاہیے۔ اس میں زنیو کے سلک پر تحقیق حق یا تکمیل سلک مذکور  
 کی کوشش کی گئی ہے۔ ثالث الذکر میں نفسیاتی خیالات کو بہت زیادہ واضح اور صاف صاف ادا  
 کیا ہے اور فلسفہ میں ناقدانہ اور مؤرخانہ طریقہ بحث کو رواج دینا مقصود معلوم ہوتا ہے لیکن چہ  
 تو اذن کہ تجربہ، تصور اور شکاس میں قائم رہنا چاہیے اُس سے سبوتاہ و زخمیں کیا ہے۔ ان  
 الذکر میں پھر علم و وجود اشیاء سے بحث کرتا ہے۔ سوفسطائی کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ حقیقت  
 اشیاء کی غیر مشابہ تصویر کھینچا کرتا ہے اور ادیت اور تشل میں مطابقت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔  
 افلاطون یہ پوچھتا ہے کہ آیا مختلف تصورات ایک سے دوسرے تک منتقل ہو سکتے ہیں، اور  
 اگر یہ ممکن ہے تو کیا تمام تصورات بلا امتیاز منتقل ہو سکتے ہیں؟ نیز کیا صرف بعض اقسام یا موزا  
 میں شکل ممکن ہے اور بعض میں نہیں؟ اس طرح وہ پانچ قسم کے عنوانات زیر بحث لاتا ہے۔  
 وجود۔ سکون۔ حرکت۔ حیح۔ فرق۔ وہ کہتا ہے کہ سکون و حرکت فی ما بین غیر قابل استعمال  
 ہیں لیکن جس قدر عمومیت اور کلیت فرق کو حاصل ہے اُسی قدر وجود کو بھی ہے اور ایجابی  
 اور سلبی خصوصیتیں ہی نہیں کہ باہم موجود رہتی ہیں بلکہ ان کے حدود بھی برابر و وسیع ہوتے  
 ہیں۔ نفی۔ کذب۔ و رد یہ باہم الگ الگ نہیں ہیں۔ ہر سلبی صفت کے ساتھ ایک ایجابی  
 صفت کا ہونا بھی ضرور ہے۔ اور نفی حقیقی اور اثبات حقیقی دونوں لازم و ملزوم اور مناسب

ہوا کرتے ہیں۔ خاص الذکر میں اُس نے سیاسیات پر زیادہ عالمانہ طریق سے بحث کی ہے۔  
 پہلے وہ بادشاہ کی تعریف کرتا ہے کہ وہ آدمیوں کا چرواہا ہے۔ پھر قانون اور حقیقت کا وزن  
 سے بحث کرتا ہے اور طرز حکومت کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ اس میں پہلی سے دوسری تقسیم اور  
 پھر دوسری سے تیسری۔ علیٰ ہذا القیاس ایک دوسرے کی نسبت سے اچھے نمونہ کے مقابلہ  
 میں بڑا نمونہ پیش کرتی ہے۔ وہ پڑا :۔ (۱) دستوری شاہی (۲) دستوری حکومت بعض  
 (۳) جامع قانون عمومی حکومت۔ (۴) قانون شکن عمومی حکومت (۵) مخالف قانون حکومت  
 بعض۔ (۶) جبریت۔

خاص الذکر میں وہ : بیان کرتا ہے کہ سب سے بڑی نیکی نہ تو سرت میں ہے اور نہ علم میں۔  
 لیکن جہاں نیکی کا مستقر ہے وہ ایک ایسی ترکیب کا ثروت ہے جس میں ہر شے صحیح طور پر توازن  
 مناسب کے ساتھ ملی جلی نظر آتی ہے۔ اس میں ایک خاص اثر حسن و جمال ہے۔ اس کا وجود حقیقی ہے  
 فرضی نہیں۔ اس میں ذہانت، علم و حکمت، فن و اصابت رسلے ہر شے موجود ہے اور وہ ایک  
 ایسی خالص و پاک نعمت ہے جس میں دکھ اور درد کا کہیں نام نہیں۔

رسالہ طبیوس میں وہ کہتا ہے کہ عالم چنانکہ ایک جسم رکھتا ہے اسلئے اسکے وجود میں آنے کے  
 لیے سبب کی ضرورت ہے اور اسکی ایک ابتدا (ازل) ابھی ہے۔ اور اسکی ماضیت ایک ایسے  
 نمونہ پر کی گئی ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اسکے بعد وہ یہ بیان کرتا ہے کہ تحقیق عالم میں ذہن انسانی  
 کا حصہ اور تعلق کس قدر ہے۔ حاجت کے اثرات و نتائج کیا ہیں حقیقی نفسیات کے اصول کیا  
 ہیں۔ اسکے بعد پھر وہ فن طب و تشخیص امراض پر بحث کرتا ہے۔

انفلاطون نے اپنی عمر کے اخیر حصہ میں اس امر کی کوشش کی کہ قانون ملک کا ایک منابہ  
 تیار کئے چھوڑ جائے۔ اس لیے اس نے ایک منابہ قوانین تیار کیا جس میں ڈوروی اور ایوانی  
 قوانین کے بن بن ایک راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ تسلیم و شادی بیاہ کے قواعد بناتا ہے بہتاری  
 و لاغزہبی سینے مذکورہ نامتا، قادر مطلق سے انکار کرنا ایسے بدترین بد اخلاقی سے بھرے ہوئے باطل  
 خیالات کو قابل سزا قرار دیتا ہے۔ ان امور کو قابل سزا اور سخت سزا کے مستوجب خیال کرنے  
 کی وجہ سے بعض لوگ کہنے لگے ہیں کہ انفلاطون آخر عمر میں متعصب ہو گیا تھا۔ مگر جو لوگ کہ قید مذہب  
 سے آزاد ہو کر بخش و خرافات کی قید میں گرفتار ہونا پسند کرتے ہیں انہیں کے اکثر ایسے خیالات ہیں۔



رواداری اور آزادی کے جو سنی آجکل لیے جا رہے ہیں یہ شاید انفلٹون کے ذہن میں بھی نہیں تھے۔ یہ وہ شخص تھا جو سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد ہے۔ جس نے اپنے استاد سے علم ظاہر کے مقابلہ میں باطنی علم زیادہ حاصل کیا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ علم ظاہری کی طرح اسے بھی منصفہ شہود پر لائے۔ جہاں صراحت سے بیان کر سکتا تھا وہاں اس نے بہت مہارت سے کام لیا ہے اور جہاں اشاروں کی ضرورت تھی اس لیے کہ عوام میں غلط برداشت کی قوت نہیں تھی وہاں صرف اشاروں سے کام لیا ہے اور اپنی تحریریں کو سبھم اور غفلت رہنے دیا ہے۔ چونکہ تہذیب باطنی کا واسطہ تہذیب ظاہری ہوا کرتی ہے اور تہذیب ظاہری حکام شرع کی پابندی سے چلتی ہے اس لیے اس نے مقصد اہل باطنی تہذیب باطنی کے واسطہ حصول کیلئے آخر عمر میں تدوین حکام شرع ظاہری کو ضروری سمجھا اور تمام کوششوں کو چھوڑ کر اسی ایک ذہن میں آخر تک لگا رہا اور اپنے پیچھے ایک ایسی شرع چھوڑ گیا ہے جو اس کے علو مرتبت اور اعلیٰ مدارج ذہنی و روحانی کی طرف دلالت کرتی ہے۔

القرآن پاک کے اس ارشاد پر استدلال کیا جائے کہ یٰٰکُلُّ قَوْمٍ لِّدَارٍ ہر قوم میں ایک ایک ہدایت کرنے والا آیا ہے، تو ممکن ہے کہ سقراط اپنے زمانہ اور ملک کا پیغمبر ہو۔ جو آواز کبروت اس کے ساتھ دیا کرتی تھی وہ اور اس خیال کو تقویت دیتی ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو انفلٹون اس کا شاگرد و خلیفہ برحق تھا جس نے ایسے علوم کا نشر و افشا کیا جن کا سرچشمہ نبوت میں نظر آتا ہے۔  
واللہ اعلم بالصواب۔

حاجہ علی شاہ

(الناظر، اکتوبر ۱۹۲۶ء)

## ابن خلدون اور ان کا فلسفہ تاریخ

محمد بن خلدون پہلے مصنف ہیں جنہوں نے تاریخ کو بذات خود ایک خاص علم کا موضوع قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کو علم تاریخ کا بانی کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے جواب میں اختلاف آرا کچھ بعید از قیاس نہیں۔ لیکن ان کے مقدمہ کا کوئی منصف مزاج ان سے ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ کوئی قبل کے تمام مصنفین میں سے ہی ایک ایسے مصنف ہیں جو اس اعزاز کے مستحق سمجھے جاسکتے ہیں۔

ان کے سوانح نبات کے لیے ہم ان کی خود بخود ششہ سوانح عمری کے مابین امت میں لیکن یہ سوانح عمری ششہ سوانح یعنی وفات سے بارہ سال قبل پر ختم ہو گئی ہے اس کی صحت اور راست گوئی میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمیں ایک خبر یہ بھی ہے کہ کافی مفصل ہے۔ لیکن بڑے مختصر ہے۔ اس سے تو مصنف کے خیالات و مقدمات ہی واضح ہوتے ہیں نہ ان کی روزمرہ زندگی اور ان کے احوال ہی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس میں کوئی ایسی خوبی نہیں جس کی ہم کو ابن خلدون ایسے مصنف سے امید ہو سکتی تھی۔

ابن خلدون مسلمان عربین تونس میں پیدا ہوئے وہ ضرورت کے ایک قدیم عرب قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ایک ایسے خاندان سے تھے جس کا سپین پر بہت اثر پڑا۔ بنو اسید کے زوال کے وقت یہ خاندان آکر شمالی افریقہ میں آباد ہوا تھا۔ ابن خلدون کو خانہ اس ہتھام سے تعلیم دی گئی اور انہوں نے قرآن شریف کے علاوہ قدیم عربی نظم حدیث، صرف و نحو، منطق، ریاضی، فقہ و طبیات اور فلسفہ میں مہارت پیدا کی۔ اسی وجہ سے بہت حد تک تعلیم انفرصت رہتے تھے، اور ہمیشہ طلب علوم اور مطالعہ ابیات میں مشغول نظر آتے تھے۔ بیس بیس کی عمر میں وہ ابن اسحاق ثانی سلطان تونس کے ہاں ملازم ہوئے۔ اسی وقت سے ان کی سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ صرف دو سال بعد وہ ابو عینان سلطان تونس کے ہاں چلے آئے۔ ابو عینان کے وہ منقولہ نظر ہو گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درباریوں نے ان کے

خلافت سازش کی اور افران کو بے عزت کروا کے قید میں ڈلوادیا۔ ۳۵۹ء میں ابو عینان نے ہتھیال کیا ان کے جانشین ابو سالم نے ان کو را کر کے اپنا کاتب مقرر کیا۔ لیکن اس وقت وہ دربار یونان سے عسود اور مغوض رہے ابو سالم کی وفات کے بعد ان میں اور وزیر عمر میں ان بن ہوئی اور ان کو دربار چھوڑ کر سپین جانا پڑا۔ یہاں ابن الاحمر نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اس کے ہی سال ان کو سیر فرکر کے پیر شاہ قسطلانی کے پاس ایشیلیہ بھیج دیا۔

۳۶۰ء میں وہ اپنے ایک قیدیہ دوست ابن عبد اللہ کے وزیر اعظم مقرر ہو کر پیر افریقہ آئے لیکن یہ شخص عبدالعباس شاہ قسطلانی کے خلاف ایک جنگ میں مقتول ہوا۔ اس کے بعد ابن خلدون کی زندگی بہت خطرے میں گذری۔ کیونکہ وہ ایسی جگہ تھے جہاں کے والی ہر وقت ایک دوسرے کے خلاف آستینیں چڑھائے رہتے تھے، ان کی جان بھی صرف بعض طاقتور اور خود مختار عربی قبائل کے سرداروں کی دوستی کی وجہ سے بچی رہی۔ ۳۶۰ء سے ۳۶۲ء تک وہ شاہ مراکش کے اہزم ہے اور عرب قبائل کے ساتھ رسل و رسائل اور انصرام مہات میں خصوصیت کے ساتھ مشغول رہے۔ ۳۶۲ء میں وہ دوبارہ سپین گئے۔ لیکن جلد ہی وہاں سے واپس آنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد چار سال انھوں نے اقل عزلت میں گزار دیے۔ یہ نام مدت ایک بڑے مگر دیران قلعہ میں مطالعہ میں صرفت کی اسی عزلت میں انھوں نے شہرہ آفاق مقدمہ تیار کیا اور تاریخ عرب و بربر کی بنا ڈالی۔ مؤخرالاسم کو جاری رکھنے کے لیے ان کو بڑے بڑے کتب خانوں کی ضرورت لاحق ہوئی اور اسی وجہ سے انھوں نے ۳۶۲ء میں تونس کی طرف مراجعت کی۔

سلطان عبدالعباس اور عاتق الناس نے ان کا استقبال نہایت گرمجوشی سے کیا اور طلبہ نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ان کو تعلیم دیں۔ لیکن دربار یونان میں سے ایک فرقہ جس کے سرسکر مفتی اعظم ابن عرفہ تھے، ان کی اس مراجعت اور اس عزت و احترام کو اپنے لیے قابل ہر سمجھا چنانچہ ان لوگوں نے ریشہ دو انیان شروع کیں۔ ابن خلدون اپنے خلاف آئے دن کی سازشوں سے گھبرا گئے اور عہد کیا کہ تاریخ برابرہ ختم کرنے کے بعد وہ حج کے لیے روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ اکتوبر ۳۶۲ء میں وہ اجازت حاصل کر کے مصر کی طرف روانہ ہوئے اور نوہر میں اسکندریہ پہنچ گئے۔ اور صرف ایک ماہ قیام کر کے قاہرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کی شہرت تو چاروں گات عالم میں پھیل ہی چکی تھی اور اس وقت اتفاق سے



رہ جانے والا کوئی کاروان بھی تیار نہ تھا۔ لہذا دہان کے سلطان نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنا حج کا ارا  
 فتح کر کے قاہرہ میں پروفیسری قبول کریں۔ انھوں نے سر تسلیم خم کیا اور دہان میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔  
 رفتہ رفتہ وہ قاضی القضاۃ کے ہستاک ترقی کر گئے۔ اس عہدہ پر قوانین عدل و انصاف کی  
 پابندی نے سرکاری آدمیوں میں ان کے بہت سے دشمن پیدا کر دیے۔ اس کے علاوہ ان پر ایک  
 مصیبت یہ پڑی کہ جس جہاز میں ان کا خاندان مراکش سے مصر جا رہا تھا وہ ڈوب گیا اور بہ یک  
 گردش چیخ نیلو فری اپنی نرود دولت اور خوشی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس صدمہ سے وہ بہت دلگیر ہوئے مگر  
 سولے دنوں کے ان کے پاس بھی کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ۱۳۸۸ھ میں وہ لازم کہہ رہے اور دہان سے  
 ناہروا کر کچھ مدت تک تو تعلیم دیتے رہے اور مطالعہ میں مصروف رہے اور ۱۳۹۲ھ میں خود بنگا شہ  
 سوانح عمری لکھی جس میں اس وقت تک کے حالات درج کیے۔ ۱۳۹۸ھ میں وہ سلطان مصر کے ہمراہ  
 سلطان تیمور کے خلاف ایک ہمین شامل ہو کر شام گئے اور دمشق میں محصور ہوئے۔ لیکن انھوں نے  
 اپنے آپ کو فوج کے حوالہ کر دیا۔ تیمور نے ان کی بہت عزت و حرمت کی اور ان کی لیاقت و قابلیت  
 کی قدر کی۔ ابن خلدون نے بھی اپنے آپ کو ایک وفادار اور لائق رہ باری ثابت کیا۔ تیمور ان کو ترکستان  
 سے جانا چاہتا تھا مگر ان کا اصرار اس کے ارادہ پر غالب آیا اور یہ قاہرہ واپس چلے آئے یہاں دوبارہ  
 قاضی القضاۃ مقرر کر دیے گئے۔ اور آخر جو بہتر برس کی عمر میں ۱۴۰۸ھ میں انتقال کیا۔

مذکورہ بالا مختصر سی سوانح عمری سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابن خلدون ایک عجیب و غریب  
 آدمی تھے۔ ان کی تمام زندگی ایسے حالات میں گزری جو نہایت پیچیدہ تھے۔ ہر روز نئے نئے واقعات  
 و مہاموں نے تھے، آئے دن ان کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں جن جن حاکموں کے زیر سایہ وہ رہے وہ  
 صہد تھے اور ان کے درباری کہنے اور حاسدان تمام باتوں کے باد صفت انھوں نے بہت سے مواقع پر کارہائے  
 نمایاں کیے ان کے اہل ان کو اکثر بچا دکھانے میں کامیاب ہوتے رہے گروہ بھی اپنی خداداد لیاقت کی  
 و بک بلبہ ہی اپنی اصلی حالت پر آ جاتے تھے۔ فوجانی اور بزرگ چلے دانوں حالتوں میں اور زمانہ کے حادثات  
 کے باوجود وہ بہت ذی اثر اور ممتاز رہے۔ کبھی اعلیٰ خوشامد کی جاتی تھی کبھی ان کو دھمکا جاتا تھا اور کبھی  
 ان کی تعریف کی جاتی تھی۔ ہر حال میں ان کا جوہر ذاتی اس طرح صوفیوں میں رہا۔ وہ ایک اہر سیاست دان  
 کہ ہم ان درباری اور سوائسی کے ایک درخشاں رکن تھے۔ ان کی رے صائب اور ان کی گفتگو

ہوتی تھی۔ ان کو احوال کے مطابق اپنے آپ کو بل لینے میں خاص ملکہ تھا۔ وہ مختلف السیج جگہوں پر کام کر سکتے تھے اور ہر ان علوم و فنون میں طاق تھے جن کو ان کے مسلمان ہم عصرون نے ترقی دی ان کی طبیعت میں بھی سازشیں کرنے اور کروانے کا مادہ موجود تھا۔ مگر وہ اپنے حالی رتبہ ہونے کی وجہ سے مجبور تھے۔ ان کی طبیعت بھی مستبدانہ حکومت کی طرت مائل تھی۔ بنظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسیات اور ادبیات میں شہرت کے خواہاں تھے۔ لیکن وہ اس الزام سے بری ہیں کہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے انھوں نے اخلاقی قوانین پس پشت ڈال دیاتھے اگیز حرکتیں کیں۔ وہ ایک بچے مسلمان تھے۔

فلسفہ میں وہ کسی خاص مسلک سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ چودھویں صدی سے قبل تمام اسلامی ممالک میں فلسفہ بہت بدنام ہو چکا تھا۔ اور جہاں کہیں قرآن شریف کا فیصلہ معاملات مذہبی میں ناطق سمجھا جاتا تھا وہاں دینی تعصب اور جوش نے فصولی مسائل پر آزادانہ غور و فکر کو جیسے اکھڑ پھینکا تھا۔ اس لحاظ سے ابن خلدون اپنے زمانہ کے عوام سے کچھ الگ تھے عالم اذوق الاحسا کے مسائل میں ان کو عقل کی نسبت ابہام پر زیادہ اعتماد تھا چنانچہ انھوں نے اپنے مقدمہ کی مکمل ایک فصل میں یہ ثابت کر کے کی کوشش کی ہے کہ فلسفہ کو غلطی سے ظلم کہا گیا ہے اور یہ کہ یہ نہ صرف اپنے دعویٰ کو ثابت ہی نہیں کر سکتا بلکہ مذہب کے خلاف ہونے کی وجہ سے ضرر مان بھی ہے وہ صرف اس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کچھ مفید ہو سکتا ہے یہ کہ اس سے ہماری فہم میں ترقی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا مطالعہ صرف ان لوگوں کو کرنا چاہیے جو علوم قرآن اور فقہ میں ماہر ہوں تجربی علوم کی وہ بہت قدر کرتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو بے حیل دھجھتے نہ تھے اور مذہب اور مابعد الطبیعیات میں تمام عقلی مداخلت کو غلط یا بخرے انطوط سمجھتے تھے۔ چونکہ ان کا تعلق کسی خاص فلسفہ سے نہ تھا اس لیے ان کو اس بات کا بھی خیال نہ آیا کہ وہ تاریخ کی توجیہ فلسفہ کی روشنی میں کریں اور قرآن (شریف) میں علم تاریخ کی بنائے لیے کچھ مواد نہ تھا لہذا انھوں نے اپنے تمام تاریخی نظریوں کو براہ راست تاریخی واقعات سے سنبھال لیا ہے اس باب میں ان کا علم نہایت وسیع علمی ستھن اور عالمانہ تحقیقات اور ذاتی تجربہ کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ ان کو معاشرتی مظاہر کی اعلیت اور ان کے مفہوم تک پہنچنے میں خاص مہارت تھی۔ اور نہایت ہی سہولت

کے ساتھ ان کے اسباب اور تعلقات کو معلوم کر لیتے تھے تعلیمات کرنے میں ان کو مدد ملی حاصل تھا۔ اور  
حقیقت یہ ہے کہ یہ ہی خصوصیات ان کی تحقیقات میں کامیابی کا باعث ہوئیں۔ اس میں ان کے  
غور و فکر یا فلسفیانہ اصول کی جدت و عمدگی کو کچھ دخل نہیں۔

ابن خلدون نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ان کے بعض چھوٹے چھوٹے رسائل  
نوائسی وقت مشہور ہوئے اور بعد میں غائب ہو گئے ان کی تمام شہرت ان کے شاہکار "تاریخ  
اور خلاصہ اس کے پہلے حصہ مقدمہ پر مبنی ہے۔ دوسرے حصہ میں بلون شایون "ایرانیوں اسرائیلیوں  
قبیلوں، ایرانیوں، رومیوں اور ترکوں کی تاریخ ہے۔ تیسرے اور آخری حصے میں برابرہ اور اردگرد کی  
اقوام کا ذکر ہے۔ ان میں ذکر کردہ معدودے چند ماہر ہیں اپنی رسے ظاہر کر سکتے ہیں۔  
ان کا مصنف ان کی جدت علم و فہم کے قوانین کی مطابقت اور ان کی قدر و قیمت کے لحاظ سے بہت  
اعلیٰ درجہ پر تھا۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ وہ اس میں غلطی پر تھا۔ ڈوڈی دی سلین اور عمری جیسے  
لاحق نقاد، جو تاریخ عالم کے مطالعہ میں مصروف ہیں سب اس بات میں متفق ہیں کہ ایک تاریخی تصنیف  
کی حیثیت سے اس میں بہت کمزوری ہے۔ ان کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کا طرز تحریر غیر واضح اور غیر مختصراً ہے۔  
واقعات کے بیان کرنے میں بالکل لاپرواہی یا بے ارادہ اس کو بکا ماور فضول استدلال سے بھرا ہوا ہے۔  
مواد اور مضامین کی تقسیم اس میں سنگ کی ہے کہ مکرر لازمی ہو گئی ہے۔ اور ان اہل کو جن کی سند کو قابل وثوق  
قرار دیا ہے، اکثر غلط بیان کیا ہے کہ ان کی یہ رسے درست ہو۔ لیکن سوچنا یہ چاہیے کہ اگر ابن خلدون  
کی تصنیف زمانہ حال کی ایک سائنٹفک تاریخ کی محک پر کامل البیاری ترقی تو ان کا یہ کارنامہ معجزہ ہے  
کم نہ ہوتا۔ ایک تاریخی تحقیق کی حیثیت سے ان کا کام پہلے ہی عقل کو حیران کیسے دیتا ہے۔

اب ہم کو اپنی تہا ستر تہا جب مقدمہ کی طرہ منطقت کرنی چاہیے۔ یہ مذاہن خود ایک مکمل کتاب ہے  
اور اس کتاب کا ایک مختصر و محمل حال "وراثت آئندہ کی موضوع ہے۔

اس میں ایک دیباچہ ہے ایک مقدمہ اور پھر فصلیں۔

دیباچہ میں تصنیف کا موضوع تاریخ بتایا گیا ہے جو علم کی ایک نوع ہے جس کی ہر شاخ قدر اجماعی ہے۔  
عام طور پر ترقی دی گئی ہے اور بہت طرح مفید اور بکار آمد ہے۔ تاریخ کے متعلق کہا گیا ہے کہ بظاہر ان تمام  
واقعات کو بیان کرتی ہے جو واقعہ کے قریب ہیں ہر زمانہ میں ظاہر ہو رہے ہیں اور یہ باطن واقعات کا



مطالعہ اور ان کی تحقیق، ان کے اسباب و سببوں کا ظاہر کے ظہور کے طریق پر ایک جامع دافع اور مدلل بحث کرتی ہے۔ جب تاریخ ان دو صفحات سے متصف ہو کر اس کا شمار علوم میں ہو سکتا ہے۔ ابن خلدون کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح تاریخ بھی اور علوم کے ہم رتبہ ہو جائے۔ ان کا خیال تھا اور صحیح خیال تھا کہ ان سے قبل کسی مصنف نے ایسا ارادہ یا سلسلہ کوشش اس مقصد کو حاصل کرنے کی نہیں کی۔

مقدمہ میں مصنفین کے غیر ناقدانہ رویہ اور اس کے اسباب پر بحث کی ہے، شہادتوں کے قبول کرنے میں ان کی غلبت اور بیان کردہ واقعات کی غیر کافی اور غلط توجیہات کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ اسی سلسلہ میں مسعودی کے اس بیان پر بھی تنقید کی ہے کہ جہان اس نے حضرت موسیٰ کے زیر کمان اسیر پیلوں کی تعداد کا ذکر کیا ہے۔ اور جس بناء پر اس تعداد کو ناقابل اعتبار ثابت کیا گیا ہے وہ تقریباً وہی ہیں جو کوئن سونے زمانہ حال میں بیان کی ہیں۔ مورخوں کی غلطیوں کے اسباب انھوں نے یہ بیان کیے ہیں کہ یہ لوگ زمانہ اور قرن کے فرق کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اور دو واقعات میں تشابہ کی وجہ سے نتیجہ اخذ کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ خود رالی اپنے اوپر یا دوسروں پر اعتماد کو راہ نقایید اور تہذیب و تمدن کی اہمیت اور اس کے اثر کے متعلق قلت علم ان کو راہ گم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں سے آخری سبب پر بحث کے دوران میں ابن خلدون نے اپنی اس تحقیق و تفحص اور اس کے متوقع نتائج کو "علم تمدن" کے نام سے موسوم کیا ہے یہی علم ان کے نزدیک تاریخ میں خط و صواب کا معیار ہے۔

مقدمہ کی پہلی فصل میں مہیت اجتماعی پر بالعموم اور اس سے متعلق نسل انسانی اور زمین کے ان حصص پر بحث ہے جنہیں یہ آباد ہے اس بحث کا پہلا مقدمہ یہ ہے کہ انسان بالطبع مدنی ہے اس کا جسم اس کی روح اور اس کی تمام خواہشات و احساسات کے عمل اور ترقی کے لیے لازمی ہے کہ اپنا جنس میں تعداد اور رشتہ موافقت ہو۔ اور حیات عامہ اور حیات اجتماعی میں وہ ایک دوسرے کے شریک ہوں۔ یہ حیات عامہ یا حیات اجتماعی بتدریج ترقی پذیر ہوتی ہے اور اس ترقی میں تہذیب یا تمدن کے درجات و مراتب سے گذرتی ہے۔ جس طرح علم ہندسہ کیات پر علم مہیت اجسام فلکی پر اور علم طب جسم انسانی پر بحث کرتے ہیں اسی طرح یہ نیا علم یعنی علم تاریخ و تہذیب یا تمدن پر بحث کرتا ہے۔

اس کے بعد تاریخ اور تمدن کے اساس طبعی پر ایک طویل طویل بحث ہے۔ اس میں مدعی مسکن

سے حصص اُس کے بڑے بڑے حصوں بڑے بڑے دریاؤں اور اس کی آب و ہوا کا ذکر ہے۔  
 آب و ہوا کے لحاظ سے اس کو سات منطقات پر تقسیم کیا ہے اور پھر ہر منطقہ کو دس حصوں میں اور ان حصوں میں  
 ہر حصے کے باشندوں کی تفصیص کی ہے۔ ان میں سے تین معتدل منطقات کو تفصیل بیان کیا ہے اور اُنہی  
 باشندوں کی معاشری حالت اور ان کی تہذیب کے ممیزات پر بحث ہے۔ اسی بحث میں یہ بتایا گیا ہے کہ  
 نوع انسان کے جسمانی نفسیاتی اور اخلاقی خصوصیات پر آب و ہوا اور سردی گرمی کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے مثلاً  
 جیشیوں کی سیاہ رنگت اور اُن کے اوضاع و اطوار کی تمام خصوصیات آب و ہوا ہی کا نتیجہ بتائی گئی ہیں  
 یہی میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زمین کی زرخیزی یا تنحنا وغیرہ کا آدمیوں کی جسمی یا  
 نفسی حالت پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اور اس طرح ہیئت اجتماعی میں کیا کیا تغیر و تبدل ہوتا ہے۔

فصل جا کر نبوت کی بحث پر ختم ہوتی ہے اس میں غیر مرئی عالم جس کے علم سے چند برگزیدگان  
 کو عوام کی تعلیم کے لیے ہزار ہا فرستادے گئے ہیں۔ پر بحث ہے اس بحث میں بھی بہت سی دلچسپ اور سبق آموز باتیں ہیں  
 اگرچہ بعض ناظرین کے نزدیک بحث بالکل بے محل و بے موقع ہے۔ مگر چند نرات اس بات کو نظر انداز کرتے  
 ہیں کہ ایک مادی الاصل شخص کے لیے یہی نبوت تمام مذہبی سلوات کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ لہذا اگر مذہب  
 تہذیب و تمدن کا ایک جزو لا ینفک ہے تو یہ بحث بھی ناگزیر ہے۔

مقدمہ کی دوسری فصل میں خانہ بدوش اور نیم وحشی اقوام کی تہذیب کا ذکر ہے۔

ابن خلدون کا اصلی تبحر علم اسی فصل میں نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہاں اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی  
 تجربہ اور نہایت ہی وسیع علم کی بنا پر لکھا ہے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کی تمام  
 رسوم اور اس کے تمام تعینات اس کے کسب معاش کے طریقے پر منحصر ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے دکھایا ہے کہ  
 شروع شروع میں لوگ صرف ضروریات ہی پر قانع تھے مگر بعد میں وہ آہستہ آہستہ عیش پندار عشرت خواہ  
 ہونے لگے۔ ان کی اس ترقی کے تمام درجہ ماحول کے مطابق ہونے کے لحاظ سے باطل فطری تھے۔  
 اسی واسطے اُن کے نزدیک عربوں کی حالت بالکل طبعی ہے۔

اسی فصل میں اُنھوں نے بدوی اور بدنی زندگی میں تعلق دکھانے کی بھی کوشش کی ہے اور ان  
 عقیدہ ہے کہ مقدم الذکر زندگی میں حیرت انگیز زندگی پر مقدم ہے۔ یہی گہوارہ تمدن کسی جا سکتی ہے۔ اسی سے  
 تمام شہر پیدا ہوتے اور ملتے ہیں اور یہی اُن کو آباد کرتی ہے۔ وہ بادیہ نشینوں کی اخلاقی حالت کو ان کی

مشتون مزاج کے باوجود شہزادوں کی اخلاقی حالت پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ خاصکر بہت باہمت ہوتے ہیں۔  
اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حرکات و سکنات میں آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے اذنیاع والموارد شہت بڑا  
کسی نہ چننے کے احکام کے تابع نہیں ہوتے۔ اور اس طرح ان میں خود اعتمادی اور قوت حیات ہمیشہ  
تازہ رہتی ہے۔

بادیہ کی حیات اجتماعی پر بحث کرتے کرتے وہ لکھتے ہیں کہ عصبيت کی ضرورت سب سے زیادہ  
اہل بادیہ کو ہوتی ہے اور یہ احساس عصبيت ان لوگوں میں قوی ہوتا ہے جو آپس میں رشتہ دار ہوں یا جنہیں  
اسی قبیلہ کا کوئی اور حکم تعلق پایا جاتا ہو۔ یہی نیم وحشی اور اہل بادیہ اپنی صحت نسل پر بجا طور پر فخر  
کر سکتے ہیں اس قسم کے قبائل کے لیے لازمی ہے کہ حکومت کا حق ایک قوی ترین خاندان کو ہو۔ اس  
حق کا کسی غیر قبیلہ میں منتقل کرنا ہمیشہ ٹوٹک ہوتا ہے۔ ایسے ہی خاندانوں میں جو ایک دوسرے کے  
مشیر کار ہوں اور جن میں رشتہ روافات قائم ہو اصلی شرافت و نجابت پائی جاتی ہے اور خاندانوں کی  
شرافت محض بے نام ہوتی ہے۔ ان کے لیے اس لفظ کا استعمال بطور استعارہ ہوتا ہے شہر میں رہنے  
والوں میں کوئی خاندان ان معنوں میں شریف نہیں ہوتا۔ وہ نیک آدمی اثر اور ذمی عزت ہوتے ہیں  
مگر شریف نہیں ہوتے۔ ایک خاندان کی شرافت صرف اسی پر مبنی نہیں کہ وہ شریفوں کے اخلاقیات میں  
بلکہ اصلی شریف وہ ہے جس میں شریفوں کے اوصاف پائے جائیں۔ یہودی دنیا بھر میں سب سے زیادہ  
مشرافیت خاندان کے اخلاقیات ہیں اور وہ بجا طور پر اپنے بزرگوں کی عظمت شان پر فخر کر سکتے ہیں۔ مگر  
اس وقت ان میں خاندانی شرافت مفقود ہے۔ ایک خاندان کی شرافت مشکل سے چار نسلوں  
تک باقی رہتی ہے اور آج تک کوئی خاندان ایسا نہیں ہوا جس نے اپنی شرافت کو چار نسلوں تک  
قائم رکھا ہو۔ حکومت کرنے کی قابلیت صرف وہی لوگ رکھتے ہیں جو نیک خصلتوں اور نیک کاموں  
کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز کر دیں۔

اس کے بعد ابن خلدون بیان کرتے ہیں کہ ان نیم وحشی خاندانوں میں فتوحات کرنے کی  
زیادہ قابلیت ہوتی ہے بشرطیکہ ان کے دل میں اپنے قبیلہ کی عظمت کا احساس ہو ان کے  
مقاصد متحد ہوں اور وہ حیوانی لذائذ یا غلامی کے انھوں تباہ نہ ہو چکے ہوں۔ اپنے اس عزم کے  
ثبوت میں انھوں نے آنحضرت و صلعم و ادراپا کے خلفاء کے ریکارڈ مت عربوں کے حیرت انگیز غلبہ و



تسلط کو مثال کے طور پر پیش کیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ عرب میدانوں میں رہے  
:الون پر تو مسلط ہو گئے۔ مگر برابرہ اور ہڈی اقوام ان کے قابو میں۔ آمین۔

عربوں کی خرابیاں اور ان کے نقائص سے بھی وہ غافل نہ تھے۔ یہ بات اس عظیم المثال  
باب سے ظاہر ہوتی ہے جہاں انھوں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عربوں نے اپنے ہر مفتوحہ ملک  
کو تباہ و برباد کیا۔ اس باب کے کچھ حصہ کا ترجمہ خالی از دہی نہ ہو گا۔ وہ یہ ہے :-

”خانہ بدستانہ زندگی کی عادات، فضائل سے عربوں کو ایک وحشی قوم بنادیا ہے۔ ان کے

اصناع و افعال کی خشونت ان کی طبیعت ثانیہ میں چلی سر اور اسی میں ان کو لطیف بھی آتا

ہے۔ کیونکہ اسی کی بدولت ان کو خود مختاری اور آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس سہر کی حالت

تہذیب کے راستے میں بنزلا ایک سنگ گران کے ہے۔ ایک جگہ سوزری جاہل حرکت

کرنا اور صحر کو قطع کرنا، ازل سے ان کا مشغلہ رہا ہے۔ خانہ بدستانہ زندگی ترقی تہذیب کے لیے

اسی قدر ضرر ہے جتنی کہ مدنی زندگی اس کے لیے مفید۔ مگر عربوں کو اپنے چوٹے کے لیے اینٹوں

کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ایک مکان کو گرا کر اینٹیں جتا کہتے ہیں۔ اگر ان کو بیون کے لیے

لنڈن کی حاجت ہوتی ہے تو وہ بالکل ایک عمارت کی چھت گرا کر اس میں سے وہ ڈنڈے

بھال لیتے ہیں۔ ان کی بسر وقات کا طریقہ ہی ایسا ہے کہ وہ مکانات تعمیر نہیں کر سکتے اور عمارتیں

ہی تہذیب کا سنگ بنیاد ہوا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ تحصیل البحر مال و دولت کو تسلط انھیں

سے چھینا اور بغیر کسی حد یا اعتدال کے غصب و ہب ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے مگر ان کی آنکھ

کسی اچھے چھتے یا نفیس سامان آرائش یا ایک کارآمد چیز پر پڑتی ہے تو وہ پھر ان کی دست بڑے

معمولہ نہیں رہ سکتی۔ جب وہ ایک علاقہ کو فتح کر لیتے ہیں یا ایک خانہ کی بنیاد رکھتے ہیں

تو اپنے جذبہ غصب و ہب کی تشفی کے لیے تمام ان قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں جن کا مقصد

یہ ہوتا ہے کہ وہ جان و مال کی حفاظت کریں۔ ان کی حکومت میں ہر چیز رو بہ تباہی ہوتی ہے۔ وہ

تاجرون اور صناعتوں پر ناقابل برداشت بار ڈالتے ہیں اور ان کو یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ لوگ

ان کی مدد کے مستحق ہیں نہ کہ اس بارگران کے۔ یہی تجارت و صنعت مال و دولت کا ایک وسیلہ

ہوا کرتی ہیں۔ اگر راست کاری پر بجا ارادہ والا جائے یا اس پر بندہ شین عالم کی جائیں تو ان میں

نفع کی صورت نظر نہیں آتی اور فائدہ کی امید نہیں رہتی لہذا کوئی شخص اس پر منت نہیں کرتا۔ جب حالت یہاں تک پہنچ رہی ہو جائے تو نظام اجتماعی گہرا شروع ہو جاتا ہے اور تہذیب میں ترقی سکوس ہونے لگتی ہے اس کے علاوہ عرب حکومت کے تمام وظائف کو پس پشت ڈالتے ہیں وہ جرائم کو بند کرنے یا حفاظت معاشرہ کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی تائید کوشش یہ ہوتی ہے کہ رعایا کا تمام رویہ کھینچا اپنے خزانوں کو پر کر لیں۔ اپنے اس مقصد حاصل کرنے میں وہ لوگ جبر و تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اگر اس میں وہ کامیاب ہو گئے تو وہ بیکار ہو جاتے ہیں، وہ اپنی رعایا کی امداد یا جرائم پیشہ لوگوں کے استیصال سے سلطنت کا حسن انتظام کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لاتے۔ ایک رسم کے مطابق جو ان میں پشتہا پشتہ سے متواتر چلی آرہی ہے وہ جسمانی سزا کی جگہ جبرانوں کو رواج دیتے ہیں تاکہ اس طرح ان کی آمدنی بڑھ جائے۔ لیکن محض جبرانوں سے جرائم اور مجرموں کا استیصال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ برخلاف اس کے اس سے شریر نفس لوگوں کو اور جرات ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی کامیابی کی خاطر مالی نقصان کی پروا نہیں کیا کرتے۔ ان حالات کے ہونے ہوئے یہ کہنا بیجا نہیں کہ ایک عربی قبیلہ کی رعایا پر کوئی حاکم نہیں ہوتا۔ اور رعایا کی یہ خود سری رعایا اور ملک کی خوشحالی دونوں کے لیے یکساں مضر ہے۔ . . . .

شروع سے لیکر اس وقت تک عربوں نے جس ملک کو فتح کیا ان پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تہذیب اور آبادی غائب ہو جاتی ہے۔ بلکہ ان کی حالت یہاں تک زوال ہو جاتی ہے کہ اس سرزمین کی خصوصیات ہی برباد ہوتی ہیں۔ مین میں معدودے چند بڑے بڑے شہروں کے سوا آبادی کے نام و بکر اس وقت غیر آباد ہیں۔ عراق کا بھی یہی حال ہے۔ ایرانی حکومت کے زمانے کے باغات اس وقت تباہ ہیں۔ شام اب برباد ہے۔ اور شمالی افریقہ کے ممالک تا اندم زبان حال سے عربوں کی لوث مار کا گھر کر رہے ہیں۔

لگے اب میں عربوں کو غیر صالح، حاسد اور جھگڑا لکھا ہے۔ مصنف کے نزدیک یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام اقوام میں سب سے کم حیثیت ان میں ہے اور اسی لیے یہ لوگ اس قابل نہیں کہ بڑی اور سلطنت قائم کر سکیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے اندوہ و کی سادگی ان کے ارادوں کی پختگی اور اچانک کی عزت ان کا طغیانی ہے۔ ان کا تکیا ہے۔ اس موخر اندک خصوصیت کی وجہ سے وہ لوگ بہت جلد کسی رسول یا

دن لئے عقائد کو قبول یا ان کے مطابقت کرنے کی طرٹ مانل ہو جاتے ہیں۔ اور اسی مذہبی جوش کی حالت میں وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ نئی سلطنتوں کو قائم کریں یا موجودہ سلطنتوں کو تباہ کریں لیکن اس سے انکے بابت ہم کہہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ گو سلطنتیں قائم کر سکتے تھے مگر ان کا برقرار رکھنا ان کے لیے دشوار تھا۔ جب کبھی وہ ایک سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوتے بھی ہیں تو ان کا فطری غرور اور غیر مطیع رہنے کی عادت تو ترقی کر جاتی ہے اور جوش مذہبی یا تو کم ہو جاتا ہے یا بالکل مردہ ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آئے دن ایک نیا ایک نبی یا شرار عالم اعلیٰ کی اطاعت سے منھ موڑ لیتا ہے اور پھر وہی نیم وحشی حالت عود کر آتی ہے۔

تیسری فصل میں ابن خلدون نے سلطنتوں کے سرچے انتظام اور ان کے زوال کے متعلق بحث کی ہے۔ یہ فصل بہت لمبی ہے اور اس کا بڑا حصہ تاریخ کی نسبت سیاسیات سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور اس حصہ کو جو اس فصل کے درمیان میں ہے ایک اسلامی سلطنت کے نظام و انتظام اس کے وظائف و طرق اور اس کے عہد و ان اور حکمہ جات پر ایک مستقل مقالہ فرض کیا جاسکتا ہے۔ تمام بحث بہت دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے لیکن اس وقت ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ہمارا مقصد آئندہ میں ہم محلاً بیان کریں گے کہ مصنف کے خیال میں سلطنتیں کس طرح قائم ہوتی ہیں اور لپٹ جاتی ہیں اور کس طرح وہ طغات حاصل کرتی ہیں اور پھر اس کو کچھ مٹھتی ہیں۔

ایک سلطنت کو حاصل کرنے میں عوام الناس کا جوش و ہمت بڑا عنصر ہے۔ جب ایک قبیلہ یا فوج کے افراد میں ایسا اتفاق پڑا اور ان کے اغراض و مقاصد اور احساسات اس طرح متحد ہوں کہ وہ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں اور ہر قسم کا ایثار کرنے پر راضی ہوں تو ان کا نام نہایت آسانی کے ساتھ ایک سلطنت قائم کر سکتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو اپنے تابعین ہی کے جوش اور ہمدردی پر تکیہ نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کو چاہیے کہ ان لوگوں کو اپنے تابعین و اپنا مطیع رکھے جن کے جوش اور عقیدت کی وجہ سے اس کو سلطنت حاصل ہوئی ہے۔ وہ ایک دیر پا اور مستقل سلطنت صرف اسی وقت قائم رہتا ہے جب وہ انتظام اچھا رکھے عدل انصاف اور امن و امان کو برقرار رکھے، عاتقانہ قوانین سنائے ایک عادلانہ فتنہ کمری کرے اور اپنے اور اپنے خاندان کا رعا کو گرویدہ بنائے۔ اسکے بعد مصنف نے بیان کیا ہے کہ جبکہ مذہب ہی صرف ایک ایسی قوت ہے جس کی بدولت سلطنت میں امن و صلوات الٰہی چھائی ہے۔



رہنمائی کی جگہ دوستی، اتفاق، تعاون اور جوش کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے ایک بڑی سلطنت کے

اتحکام کے لیے اس سے بہتر کوئی اور بنیاد نہیں ہو سکتی۔ لیکن جوش مذہبی اس وقت تک بیکار ہوتا ہے جب تک اس کا حلقہ اثر وسیع نہ ہو۔ اور جب تک کہ طاقور گروہ اس کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے۔ خدا سے تعالیٰ اصحاب کا کام صرف ان لوگوں کے سپرد کرتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں یا جن پر کثر ان کا ایمان نہ لائیں۔ وہ اس کے رسول نہیں ہو سکتے۔ جمہور کا اجماع اور علیٰ یہ میانہ ایک ربانی صداقت پر شاہد ہوا کرتی ہیں۔ مصنف نے اپنے ان تمام دعاوی کی مثالیں ان واقعات سے دی ہیں جو شرقی تواریخ میں مذکور ہیں۔

اس کے بعد کے چند ابواب میں سلطنتوں کے مدت قیام پر بحث کی ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں کس طرح وسعت حدود زوال کا باعث ہوتی ہے۔ اور یہ کہ ایک عالمگیر سلطنت قائم کرنے کی راہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ عربوں کی فتوحات میں اس وجہ سے دیر پا نہ ہو سکیں کہ ان کو سر انجام دینے میں کچھ دیر نہ لگی۔ ان کی تہم فتوحات اور ان کا زوال قبول نہ کئے۔ چونکہ اب روانہ مدوچون ریاست اور ان رفت

اور ان کی سلطنتوں میں زوال عمرانی وجہ سے جلد ہی آگیا کہ ان کی حدود بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ مصنف کا عقیدہ ہے کہ مفتوحہ سلطنتوں کی وسعت اور ان کی عمر فائزین کی تعداد اور ان کی طاقت کی نسبت سے ہونی چاہیے۔ جن ممالک میں متعدد قبائل آباد ہیں ان میں فتوحات کی رفتار سست ہونی چاہیے۔ عراق اور شام آسانی کے ساتھ فتح ہو گئے اور مراکش شکل سے ادا آہستہ آہستہ بادشاہوں کے استبداد اور عیش پرستی کی طرف میلان اور اس کی وجہ سے فساد اور تباہی کے منہ میں جانے کو مصنف نے نہایت برا خوبی سے بیان کیا ہے۔ اور ان تمام تعلیمات کے لیے شرق کی تواریخ نے کافی مواد مہیا کیا۔

ابن خلدون کا عقیدہ ہے کہ ایک فرد بشر کی طرح ایک سلطنت میں بھی جان ہوتی ہے جو عموماً انسان کی تین نسلوں سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ یا بالفاظ دیگر ایک سلطنت کی عمر ایک آدمی کی اوسط عمر سے تین گنی، یعنی ایک سو بیس برس ہوتی ہے۔ اس مفروضہ اصول یا واقعہ کی تشریح و توجیہ اس طرح کی ہے کہ ہر سلطنت کے لوگوں میں پہلی نسل میں عصبیت اور فائزہ بردشون کی خشونت طبع بہت زیادہ ہوتی ہے۔ دوسری نسل میں طاعت اور دولت کی وجہ سے عیش پرستی و تمدنی زندگی کی غلامانہ عادات ظاہر ہو جاتی ہیں اور تیسری نسل یا نشینوں کے تمام معیارات مخصوصی سے لے کر دینی طبیعتی ہے اور اس طرح وہ

سلطنت ایک بڑے حلز اور کے حلون کو روکنے کی تاب نہیں لاسکتی۔ یہ تمام تعمیرات اور ترمیمات ایک مشرقی ممالک کے تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔ ان کا اطلاق مغرب کی سلطنتوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ اسی فصل میں ابن خلدون نے نہایت حیرت انگیز وضاحت کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ تاریخ میں تمام تغیر و تحول مسلسل ہوتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر سلطنت یہ کہی طامات گزرتے ہیں اور اس میں مختلف قسم کا تغیر و تبدل ہوتا ہے اور اس تغیر و تبدل کا اثر سوسائٹی کے ہر عنصر اور اس نسل کے افراد کے عقائد اور ان کے قول و فعل پر پڑتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا معلوم ہوتے ہیں کہ لوگوں کا عام رویہ تاریخ کے اس زمانہ حیثیت اور تعلقات کے مطابق ہوتا ہے جیسے وہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اس لحاظ سے وہ زمانہ وسطی کے عیسائی مورخین سے لسی رہتا ہے۔ یہ مورخین ماکسی مائیکل۔ اس کلیہ سے ناواقف تھے کہ زمانہ مختلف تغیرات کو اپنے بلو میں لیے ہوتے ہیں لیکن انہیں ابن اس سے غافل نہ تھے وہ بتکرار اور محلات و صورتوں میں بیان کرتے ہیں کہ تاریخ مسلسل و درجہ بہ درجہ تمام تر ترقی غیر مستقیم اور لازمی ہے۔ جس طریقے سے اٹھوان نے تہذیب کے تبدل یا پست ذیات طامات کے بیان اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس کلیہ کے مفہوم کو پیش طرح سمجھ چکے تھے۔ ان صفحات کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مصنف ایک فلسفی ہے اور فلسفی بھی ایسا کہ جس کے مقابلیں میں یورپ کے زمانہ وسطی کے تمام فلسفی بو نہیں ہیں۔ یہ فرد جدید نہیں بھل سکتا۔

اب ہم اپنی توجہ چوتھی فصل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس میں شہر دین انہیں یقین بود و باش اور ایک مدنی اور مجتمع تہذیب پر بحث کی ہے۔

سب سے پہلے مصنف نے شہروں کے قیام اور ان کے برآمد ہونے کا تعلق سلطنتوں کے عروج و زوال سے دکھایا ہے۔ ان کے نزدیک پہلے سلطنتیں قائم ہوتی ہیں اور بعد ازاں شہر و دیہاتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ شہر اس سلطنت کے ساتھ ہی تباہ ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے بعد ذاتی ہیں پھر ان اسباب پر غور کیا ہے جو اس سلطنت کے قیام کرنے والوں کو شہر و دیہات کی بنیاد ڈالنے پر مجبور کرتے ہیں اور ان حالات کو واضح کیا ہے جو شہروں کے بار و بار کے انتخاب میں زیادہ تر دخل دیتے ہیں۔

اسی فصل میں ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ کم از کم وہ خود کو اپنے ہمعوموں کی فطرت اور ان کے کاموں کو بیان کرتے ہیں۔ انکے آئینہ نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی عمارتیں ایسی قوم کے نمایاں شان نہیں جو اس تہذیب و تمدن اور دولت مند رہی ہو۔ یہ عمارتیں ان لوگوں کی عمارتوں سے

کہیں فرد تربیت جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، ان کا خیال ہو کہ عربوں میں فنِ معماری اور دیگر فنون میں ہمارے حاصل کرنے کی قابلیت ہی نہ تھی۔ وہ لوگ طبعاً غالیاتِ عمارتوں اور اور اور قسم کی نفاستوں کے خلاف ہیں، انکی تمام تعمیرات عموماً ٹھوس نہیں ہوتیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اندلس میں مسلمانوں نے مجملہ فون کو ترقی دی۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہو کہ وہ ان مسلمانوں کی تہذیب مسلسل رہی۔

آئندہ ابواب میں شہروں کا ارد گرد کے ضلع پر اثر، ان کے خاص خاص خانہ فون کے ال جاہ میں تعلق، ان کے اور اور لوگوں کی دوست اور اخلاق کے تعلقات، تمدن و فنون پر ان کے اثرات، ان کے سیاسی اور معاشرتی تغیرات اور ان کی تباہی پر بحث ہو۔

مقدمہ کی پانچویں فصل میں قوم کی حفاظت کے وسائل، اس کے ترقی اور خوشحالی کے سبب اور اسی کے متعلق تمام صنعتی، اقتصادی، طبی اور فنی فنون کی ترقی پر بحث کی ہو۔ چھٹی فصل تو گویا تمام علوم کا دائرۃ المعارف ہو۔ یہ آخری فصلیں بھی گزشتہ فصلوں کی طرح کچھ دلائل اور سبق آموز نہیں لیکن انوس ہو کہ یہ ہم سے نو شروع سے باہر ہیں۔ اگرچہ مصنف کے نقطہ نظر سے یہ بے موقع و بے محل نہیں۔ اور اسی لیے ان کو خارج کرنا خالی از نقصان نہیں۔

ابن خلدون کی اس تصنیف پر تنقید کرنا غیر ضروری ہو۔ جو غلطیاں یا نقائص اس میں پائے جاتے ہیں ان کی وجہ یہ ہو کہ مصنف یورپ کی تاریخ اور وہ ان کی تہذیب کا محقق و واقف نہ تھا۔ اگر ان کو قدیم اور جدید تاریخ کی تاریخ سے اتنی ہی واقفیت ہوتی جتنی کہ دنیا سے اسلام سے تھی اور اگر وہ ان کے متعلق اسی قدر ذہن، مہنی اور آزادی کے ساتھ تعمیرات کر سکے تو اس وقت دنیا کے تمام علم ادب میں کوئی کتاب انکی تصنیف کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ ان تمام باتوں اور صفات کی عدم موجودگی میں بھی یہ کتاب اس قدر جمید اور زبردست ہو کہ مہرِ ساس کی وجہ سے مصنف کا نام اس وقت تک کندن کی طرح دمک ہو۔

مقتصد ولی الرحمن ایم اے

(ماخذ)



## نواب دوم

نواب سادات علیخان <sup>۱۷۷۴</sup> سنہ ۱۷۷۴ء ہجری میں پیدا ہوئے۔ بہ نواب شہنشاہ احمد علی بیٹے علی احمد ترقی پانچ ماہ کی عمر میں سادات علی تھے۔ کٹا بگیم نام تھا۔ شرفیاب تھیں۔ نواب شجاع الدولہ سادات علیخان کے مرزا کہلاتے تھے۔ عین الدولہ ایالت دہلی اور مرزا تہذیب شنڈ کے بہر خدا علی بیٹے تھے۔ عین الدولہ شہنشاہ تو قتل حسین خاں انکی االیقی پر مقرر ہوئے۔ عین الدولہ بیٹے پانچ ماہ کی عمر میں شیر ماس ہوئے۔ ان کی زیر کی اور دہلی کے تشریف پین ہی سے عیاں تھے۔ شہنشاہ احمد علی بیٹے سے کہا کرتے تھے کہ بگیم اگر سنگو کے سر پر تم ہاتھ رکھو گی تو تمہارے دو بیٹے چھوڑا گیا۔ گیارہ سال بعد زہد کے اس پادشاہ کاڑھے لگاتے۔

عالم شہنشاہ عین الدولہ نواب سید بوجت علیخان باہر سادات علیخان کی نذر نواب شہنشاہ علی اکبر دوسری بار ہے گئے۔ شجاع الدولہ کی زندگی سے۔ باہر علیخان میں حکومت آتے تھے۔ سب نواب احمد علی الدولہ کے نواب پر تھے انھوں نے اپنے اہل بیت احمد الدولہ نواب سید مرتضیٰ نامی تھے۔ ایک کے لئے سننے سے سادات علیخان کو لکھنؤ لایا۔ یہ بلا مذہب آئے۔ نواب احمد الدولہ کو بہت دور جہان کے رنگ بہت لایا۔ پاس خاطر را۔ دربار اعظمی کا مال، کچھ کر پناہ نام باہر میں مناسب ہوا۔ تیس لاکھ روپیہ سالانہ دیار لکھنؤ سے ان کے خرچ کے لیے مقرر ہوا۔ اس رقم سے سادات علیخان نے اپنے فضل و مخرج کا انتظام اس حسن و خوبی سے کیا کہ چالیس لاکھ روپیہ اس کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ عین الدولہ نے غیر وکے کی آمدنی بار ہزار روپیہ ہوا۔ نواب سادات علیخان راجہ اور اسٹو سے روزانہ ملے۔ اپنی نایاب و غافل نہ تھے۔ نکاح کیا کہ سادات علیخان کو نسل سے دعویٰ اور ریاست آجانی ہوئے۔ کونسل سے ان کے احوال کو تسلیم کیا اور دکان کا وقت کا انتظار کریں۔ ایک دن دہلی کے جنرل نے نواب دکان سے شہر لکھنؤ کی کہ اگر لکھنؤ سے ہوا اور ہو کر آپ تلہ کی خندق پناہ باہر تھے تو غلام نامہ ہے۔ نواب سادات علیخان کے گھر سے ہوا اور ہو کر خیر کی ذاکہ بہت میں نون کے پار تھے۔ سب شہر نواب سادات علیخان نے غلام ہوئے ایسا۔ سبہ فتح جواب دہ کہ میری جائداد پر شہر آجائے۔ لیکن آپ کی خاطر سے ہوا اور ہو کر آپ کی

ملکیت قرار پے مقرر ہو گیا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ غرض نواب صاحب بنارس واپس آئے اور وقت کے منتظر رہے۔ جب نواب آصف الدولہ نے رملات فرمائی اُنکا سپر خواندہ وزیر علیخان سندھ نشین

ہوا یان چندا کے بعد معزول کیا گیا۔ نواب ہو گیا صاحب کاشغہ صاحب سند نشین کے لیے نواب بہمن الدولہ کے پاس ہو چنانچہ سند نشین ملیخان سے بیان کیا اور شب کو چپکے سے پاکی میں لکھنؤ روانہ ہوئے۔ اتفاقاً الدولہ آباد کے قریب پاکی کا بانس ڈوٹ گیا، نواب مضطرب ہو کر ایک درخت کے نیچے جا بیٹھ۔ اہم ذمہ کسی ٹکاؤں سے ایک پاکی خرید لایا۔ نواب امداد اسپر سوار ہو کر پلے تو لکھنؤ میں دم لیا۔ یاں تاکہ پرپا ہونے دیکھا۔ نواب بہادر انگریزی پوشاک میں تھے۔ مثل انگریزوں کے سپاہیوں کو ڈانٹا۔ اُنہوں نے کہا صاحب جا رہا ہمارا آپ کو نہ دیکھتے لیکن ہمیں یہ حکم ہے کہ نواب سات مائخان کو جہاں دیکھنا گرلی مار دینا۔ غرض سواری کا بلوں تاکہ پر تیار تھا، ارکان دولت استقبال کے لیے موجود تھے، نواب والا جناب اکتی پر سوار ہوئے اخیرات کرتے داخل شہر ہوئے۔ ہو گیا صاحب کو نذر دی، انہوں نے تلمت دیا۔ بعد ازاں سند وزارت پر جلوس فرمایا۔ ارکان سلطنت نے تدریس دیں۔ شہک سلامی کی پائی۔ شہر میں مناوی ہوئی۔ ایک سال میش و عشرت میں سیر کیا مگر باطن میں دوست دشمن کو دیکھتے رہے۔ بعد ایک سال کے انتظام ریاست میں متزلزل ہوئے۔ ہر کارخانہ کے متعلق احکام صریح مناسب سمجھے جاری کیے اور ایسے ہر شخص کو ملکیت یعنی سے ملکہ دیا جسے اپنے اغراض و مقاصد میں منحل سمجھا۔

تھان علیا بہ تغفل حسین خاں کو بہت سعارت لگاتے تھے لہذا نواب تاسم علیخان کی مصاحبت کا فائدہ فرہین مہرا کے سبب ہوا، سر فرازا الدولہ نائب تھے، مگر امی بخش اور چپس ہزار روپیہ ماہوار تھان علیا کو نواب مذکور نے اپنی خواہش میں نبھایا۔ ہلال ملک تھان علیا میں یہ خوش گب سنانا ہے اور ہر طور پر ایک اقد میں چھاننا، دوسرے میں بر جیل، غرض کہ یہ تھان علیا نائب۔ احب کے لیے تھان علیا مذاب سے کم نہ تھی اس خدمت سے انکا تاک میں ذمہ ہو گیا۔ دوسرے کو نائب صاحب سونے کے مادی تھے، وہی وقت سرکار عالی نے صاحب لینے کا کہا۔ اس سے انکا ذمہ عشق میں ہو گیا، نیابت سے ازا آئے۔ جب سر بان ثور نے جناب عالی سے نائب کے بارے میں کہا، نواب صاحب نے جواب دیا کہ سر فرازا الدولہ باہل بخش ہیں آپ ہی فرمائیے کہ انور ملکی کیو کر انجام پائیں، اور جب میں خود ہی کیا نیابت دیکھتا ہوں تو نائب کی ضرورت ہی کیسا ہے۔ سن کر لائے صاحب بھی قائل ہو گئے۔ انگریزی چھاؤنی بریا ہر مقابل، رشتہ تھی۔ اور مل کے کنارے برگٹ پر کا بنگلہ تھا۔ ایک دن نواب بہمن الدولہ ہو اکھانے چلے۔ سوار ہی ڈرٹا ہوا۔ برگٹ پر کے قتلے نے ڈنکے کو منہ کیا، نواب ہر صوت نے واپس آ کر شکایتی خط رزڈنٹ اور

اور نور جنرل کو لکھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اگر ہماری فوج کے قریب رہنے سے حضور کو تکلیف ہو تو تھپاؤنی لے لیے وہ سراسر انتقام تجویز فرمائیے۔ چنانچہ نواب صاحب نے منڈیاؤں میں چھاؤنی لگے لے

علم دیا۔ جہاں سولے رگیں رشت پانی کا نام تھا

تقسیم خدمات اہلکاروں کی یہ صورت ہوئی کہ کونچے بیچ محلہ وغیرہ کے مازنی الدین پیدرے تھے وہاں دیے، تجارت محلات جنرلی فوج اور نیابت بشورہ کو اور جنرل شمس الدولہ کے متعلق ہوئی۔ نور دہلی کی نصیر الدولہ کو انبار ملکی، عماد الدولہ کو، خزائن عامہ و خاص و ملکی و غیر خاص، خیرہ و غیرہ۔ نور الدولہ کو انبار ڈیوڑھیاں اور کوٹ کشتی شہر کے رتن چند کو، انبار خفیہ پورن چند کو، سررشتہ و اصلبانی تان دسے بے سکھ دسے کو بخشی گری تقسیم تنخواہ، دنگہ رشتہ لازم دسے مجلس دسے، دیو، ستانہ آبادانہ اور دواخانہ اشرف الدولہ کو، آبہ اری بڈھن خاں کو، اہتمام سہادی اشرف علیخان کو، دارملکی تجارت عابی سینا کو خطا ہوئی۔ خرابا چاہے پانی پر ایک انگریز لازم تھا۔ سکاڈوہن اس مقرر ہوا۔ اکثر انکم علی شریف حکیم مرزا علی ملاج کے لیے اسیاں نکلو خیا علی کے لیے۔ وہاں بھی نانے مقرر ہوئے، ایک غلام تلی کے وہ سراسر روشن کے اہتمام میں۔ اور ایک خواجہ اطمینہ خاص کا متعلق تھیں علیخان اکثر ملاقاتی سرکار سے مال کو امانی دیے جاتے تھے۔ کسی کو چار یا پانچ لاکھ سے زیادہ کا ملاقات دیا جاتا تھا۔ اس لیے صاحب قوت نہ ہو جائیں۔ اور زیادہ ملاقات دینے سے شمالی روپیہ کے رو جانے کا ہوتا ہے۔ غلام یہ کہ بہت کم ملاقاتہ اجارہ دیا جاتا تھا اور وہ بھی بہت سے شرائط کے بعد تاکہ سرکار کا روپیہ ملاقاتہ میں نہ جائے اور باغیہ برادری نہ ہو۔ بلکہ مال سے اقرار نامہ لیا جاتا تھا کہ جس حیثیت آبادی سے ملاقات دیا گیا ہے اگر رات چھوڑنے کے کچھ فرق ہو گا تو نید سخت اور جرمانہ سنگین لایا جائیگا۔ فوج ملاقاتہ میں ضرورت پھر رہی تھی۔ عامل کو برطرفی اور بجائی کا اختیار نہ تھا۔ جب کوئی تعلقہ اور سرکشی سے لڑا تھا، فوج مع فوج لڑائی تھا یہ کو بجائی تھی مال کی مجال نہ تھی کہ کسی تعلقہ اور سے بغیر حکم جناب عالی لڑ سکیں مالگہ آبادی پوری دوسری کیجائی۔ مجال نہ تھی کہ کسی پیشی ہو جائے۔ جیسے امور مالی، ملکی، فوجی اور مالیہ شہر کے ہوتے تھے حتیٰ الوسع آکھ سے دیکھ کر اور کان سے سُن کر نواب صاحب مناسب حکم دیتے تھے۔ اہلکاروں کی مدت نہ تھی کہ بے اطلاع حضور عالی کوئی امر سجالائیں۔ شہر سے کسی نے جس کی اہمیت نہ تھی کہ بغیر ٹھپائی کا حضور عالی کوئی اہر ملا جائے۔ منشی محمد بخش کو یہ خدمت سپرد تھی۔ اور حکم تھا کہ بغیر اساندر میں۔ یہاں سے زیادہ نہ لیجاسکے۔ اس انتظام اور ملکی تعینات کے کام پر خفیہ نویس اور انبار نویس مقرر تھے دسے دن چنہ مراد آبادی نے چاہا کہ جو کچھ ذرعتہ جمع کیا ہے اُسے اپنے وطن روانہ کر دیں دسے صاحب نام کے



آدمی تھے۔ انکو ارکان دولت عزرائیل سے کم نہ جانتے تھے۔ رائے ذکر نے پوشیدہ اپار اور مرتبے لے  
 ٹھروں میں کئی ہزار اشرفیاں بھر کر اور غنیوں میں سلوا کر چھکڑوں پر لاوے کے روئے انکس ہر کاروں نے سرکار  
 مالی مرتبت کو اطلاع دی۔ چنانچہ بہت بہت چھا گیا کہ یہ اشرفیاں کس کی ہیں، مگر کوئی انکس سامنے  
 نہ آیا۔ مختلف الی خزانہ میں داخل ہوئیں۔ میں ہنگیاں اشرفیوں کی تھیں۔ نواب سادات ملیخاں  
 اکثر رائے سے کما کرتے کہ آپ سے اچھے اپار مرے اور خیمے کوئی نہیں بنوا سکتا۔ بلکہ کبھی کبھی  
 رائے ذکر سے تعاد کر کے کہ جیسے اپار مرے آپ نے اپنے گھر کے لیے بنائے تھے، جیسے ہی پھر کبھی میرے  
 لیے بنوا دیجیے۔

نرخ نڈ کا جو انتظام نواب ذکر سے خود میں آیا، اسے زمین پر کبھی کسی دوسرے سے نہ ہوسکا۔ انکس  
 عہد سادات حمد میں ایک بار کی بارش کی وجہ سے نڈ گراں ہو گیا۔ اسپر نواب نے حکم جاری کیا کہ نڈ کاغذ  
 باہر نہ پائے۔ لیکن اس کا ردوائی سے بھی ارذانی ہوئی۔ پھر حکم جاری کیا کہ سرکار کے نڈ کا  
 جتنا نڈ گھوٹا میں ہے اور نیز وہ جو زمین کے نیچے کھنڈوں میں دفن ہے، با تحلف آج فروخت کر ڈالا جائے۔  
 ابھی تک تو کسی سے کچھ ہواغذ نہیں ہے، لیکن اگر تکرر سرکار میں دفن رہا تو اس کے مالکوں کو ہکا بھکا  
 روزانہ ادا کرنا پڑے گا۔ تمام بنالوں اور تاجروں نے دفن شدہ نڈ کا حساب لاکے حاضر کیا۔ معلوم ہوا کہ  
 اتنی مقدار میں اناج خود تکرر ذاتی میں موجود ہے کہ اگر تین سال تک گرونی غلہ رہے تب بھی کسی کو بار  
 نہ ہوگا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد نواب صاحب نے حکم نافذ فرمایا کہ تین سال تک اناج سہولی مروجہ نرخ پر  
 فروخت کیا جائے۔ چنانچہ با تحلف روپیہ کا تیس سیر گیوں پکنے لگا۔ ملحوظ خاطر رہے کہ ان دنوں  
 چنایا سے روپے کا سیر تھا۔

عہد ساداتی میں مرزا جہانگیر، مرزا مالیندر، مرزا جہد شہزادگان تیموری لکھنؤ آئے۔ نواب الامان  
 نے استقبال کیا۔ شہزادہ مالیندر کے ساتھ انگریزی کپڑوں کے صوبہ دار مرزا جام بگ جو ان کشیدہ قیامت  
 اور خوش رو تھے۔ نواب سادات ملیخاں نے وجاہت میں انکا مقابلہ اپنے رسالہ دار مرزا باقر بگ خاں  
 سے کیا، سب کی نظروں میں رسالہ دار کی شان و شوکت زیادہ معلوم ہوئی۔ نواب صاحب نے رے بار  
 اور خوش رو جو ان نوکر رکھے تھے، محمد شاہی خاں ایسا ہمارا اور دلیر تھا جسے سانٹوں سے شیر کے انجیر  
 بیٹے کر دیے تھے۔ جناب عالی سب کے نزدیک صاحب عقل و دانش تھے، انکا نسل حکمت سے خالی نہ  
 تھا۔ وہ ہر سال موسم بہار میں شکار کیلئے جاتے تھے۔ اس سفر سے تادمہ یہ تھا کہ مظلوم رعایا جو مال کے  
 ظلم سے آلاں اور تانگی ہوئی تھی اپنی داد کو چہنچتی تھی۔ تعلق اور بھی ہر حساب رہتا تھے اور انکس آواز

اور غیر آبادی اور زمین کے بے کاشت و کاروبار کا سبب سامم ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سرکار نے کارکنین  
 دھورہ تشریف لگے۔ رزڈنٹ جلی پین ہوا تھے۔ کئی سو لاکھوں کا ملنے کا کہ ایک شیر گھبرا کر رزڈنٹ  
 کے ہاتھ سے مقابل نکلا اور بہت کرے ہاتھ کی سونڈ سے پٹ آیا۔ ذیل بان نے لکھا کہ ارمی ہاتھ سے نکھر کر لکھا  
 اسکے ہونٹ سے رزڈنٹ جو تھے سے شیر نے۔ اسے گر پڑے۔ شیر چاہتا تھا کہ دبا بیٹے کہ رزڈنٹ ذاب بہادر سے  
 اس بجلی سے کوئی ارمی کہ شیر گڑا، صاحب اڈہ کھڑے ہوئے۔

ایک مرتبہ ذاب دال شان نے اپنے لڑکوں کو تعمیر عمارت کے واسطے موعید دیا۔ چنانچہ سب عمارتیں  
 بنوائیں لیکن نازی الدین حیدر نے کوئی عمارت نہیں بنوائی۔ ذاب موصوف نے ان سے پوچھا کہ بڑے مرزا  
 تم نے کوئی عمارت نہیں بنوائی؟ انھوں نے عرض کیا کہ جو عمارتیں مضمود تعمیر فرما رہے ہیں وہی میرے بے  
 کافی ہیں اس جو اب ذاب لایا ہے کچھ گئے کہ کتاب نقد پر نے میرے بعد نگران تحت نشینی اسی دلاور کے نام لکھا ہے  
 جب ذاب نے عمارت سلطان سے مسحت اپنی اور گھاہ حضرت عباس تشریف لگے اور شراب سے آج  
 کی۔ اور پھر کبھی تازہ سیت نہ پی۔

قبل مسند نشینی سر جان شور اور ذاب پین الدلہ سے عمارت جدید پر اتنا اس میں نصف لاکھ  
 دینے کی شرط تھی۔ چنانچہ مسند نشیں ہونے کے بعد اسکا تعاقب ہوا۔ ذاب صاحب نے عذر و دفع ہنگامہ ڈالنا  
 پیش کیا اور چار سال اسی طرح ٹالے۔ میں اس مضمون میں نصیب لاکھ کی ایت کچھ نہ لکھوں گا  
 ذاب بہادر کو اس بات کا یقین تھا کہ شہر لکھنؤ کی آبادی طوائفوں کے باعث زیادہ ہے۔ اس لیے  
 حکم دیا کہ کوئی طوائف لکھنؤ سے نہ نکلے پائے۔ اس عہد میں لکھنؤ کی آبادی نے بڑی ترقی پائی۔ شہر کی آبادی  
 تکیہ بود علی شاہ سے جی جی پور تک تھی جینگے در بیان پانچ کوس سے کم فاصلہ تھا اور عرض میں چار باغ  
 سے افسر سٹی اور ملی گنج تک پہنچ گئی تھی۔ اس طول و عرض کے اندر سیکڑوں مکے اور کٹرے آباد ہوئے  
 تھے۔ شہر میں اسباب امارت اس کثرت سے آیا اور اس خوبی کے ساتھ دوکانیں ہر راستہ ہوئیں کہ بن چیزوں  
 کا آکھوں سے دیکھنا شکل قمار و دواں قیمت پر ہاتھ آتے لگیں۔ جناب مالی نے مال تجارت قمار و کراہ  
 کے حصول کا ایسا انتظام کیا کہ گنجوں کی جس جیلے وقت سے جو کئی ہو گئی اور تاجروں کو بھی خاطر ذرا نفع حاصل  
 ہونے لگا۔ روئے زمین کی ہر قسم کی نہیں شہر لکھنؤ میں آسانی کے ساتھ سیر آتے لگی۔ سمارت ملیاں نے  
 عمارتوں میں تھانے مقرر کیے جس سے چوری اور دہشتی میں بہت کمی ہو گئی اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ لکے  
 سارے عہد میں شہر لکھنؤ کے اندر ہرانی لوگوں کا کوئی ڈاکہ یا خون نہیں پڑا۔ میاں تھو اس عہد کے نامی چار  
 تھے۔ اپنے عہد میں عدالتیں مقرر فرمائیں۔ عدل و انصاف نے روان پائی۔ ہفتہ میں ایک انجمن تھیں

قدموں کا نیا کرتے۔ ایک کے انتظامی معاملات اور مالی ضرورتوں کی طرف بذاتِ خود توجہ کرے  
 کا فدا کے لئے محض اور احکام جاری کرنے وقت کسی پر رونق بخش ہوتے، سن سے کم رنجت تھی  
 ایک دن پر پہنچ کر ہی ملا جلا عالی میں گزرا تھریر تاکہ "ملاں صاحب عدالت مثل بالیان بدوار  
 است" خود بھی خورد بگتوں، اسٹیج رانڈ۔ تمام کاروبار وزارتِ مختصر پر پہنچے، اخبار پڑھا، کیا باتوں کی  
 اخبار نویس یا ہر کارہ کچھ خبریات تحریر کرتا۔ اگر کوئی بات غلط ظہور میں آتی تو سزا پاتے۔ مانتی کا انداز  
 تہنستلیق لکھے جاتے تھے اور اس مترادف کے پناہیت خوشنما اور خوشنویس مستعدی اور منشی ذکر لکھے جاتے  
 اور یہ اتنا کم تھا کہ غایب نہ ہی پرانی حرکت اپنا پیہ اور فی نقطہ ایک سو پیہ جہان لیا جاتا۔ ایک مرتبہ کسی  
 ملازم قشیش نے لفظ "ذوع" کو "نور" لکھا، نواب صاحب کی نظر غلطی پر پڑی تو اس پر تحریر فرمایا کہ "اور  
 قشیش نے لفظ ذوع بطریق و نوشتہ میں غلط کر دیا است لہذا اعتماد رد پیہ جہان گیرند"۔ اعلیٰ درجہ کے اہل  
 میں مولوی تھیں تھے، انہوں نے ذر حساب میں اجناس "کو" اخبار لکھ دیا۔ نواب مسیحتی الذکر تو خود ہر سہ  
 پندرہ لکھتے تھے اس کی تباہی پر کئی مولویوں کو جواب نہیں دیا بلکہ کچھ ناموس اور کچھ صراح سے "دینا" کے  
 معنی بتائے کچھ تادم نحو سے ترغیم میں آئے۔ نواب صاحب نے سید انشا کو اشارہ دیا اور اس نے اسے  
 رہائش اور تحفوں کے اڈا کر دیا۔ ایک بار خود نواب وزیر کسی افلاک کا اعلیٰ غلط لکھ گئے، قشیش بھولا تھا۔  
 خود بدولت کی روئے تحریر کے پیش کی اور ادب سے عرض کیا کہ غانا زاد کو اس لفظ کا صحیح اطلاق معلوم ہوا  
 مگر نواب مولود نے نہ لکھتے ہی اپنے آپ پر اس طریقہ سے جہان لکھا کہ پورے قشیش غانا کی تنخواہ اور چند  
 کر دے۔

ایک مرتبہ نواب نور کا ایک سہل چوری گیا۔ مہینوں اس کی تلاش رہی لیکن سراغ نہ ملا۔ آخر ایک  
 شب نواب نامدار نے قائل بیگم کے لیے دیوان کا فضا اٹھایا اور خواجہ سرا کو حکم دیا کہ شہدائے دوشع  
 لیکر اس کو کھڑا ہو گیا۔ اب دیوان جو کھولا تو یہ مصرعہ نکلا  
 "چہ دل برت دزدے کہ کلفت چراغ دارا"

مستور عالی نے اب جو نظر اٹھا کے اس کی صورت دیکھی تو چہرہ کہہ رہا تھا کہ یہی چور ہے اور آخر اسے دہائی  
 دیکھا پڑا۔

ایک نیا ملائے حرمی انشاؤں معاش کی کڑائی۔ نواب بہین الودد نے اس پر دستخط کیے  
 "گرمیں رہا یہ آسمان داری" فرہندت زیا وہ از روزی  
 قشیش صاحب اسے تو مہر کا سہم پہ ایک ہورخ اور ای شاہ اس عہد کا تھا ایک حرمی سرکار مال



۱۰۵- هر چند گفت :-

ترک سے ایامِ ہولی میں کھو گیا کیسے جی رہا ہے کہ اس رات میں کنٹھی لیجے

گرتا شاکایتوں کا دیکھنا منہ پر ہو      تہا درون کے پہ پکارا بازت دیکھے  
ملکیم ذاب صاحب :- ”مفتاب را درون خانه چکار“

نواب سادات ملیحان ہمیشہ ہونگیم صاحبہ کی جائیداد۔ دولت کی آگ میں رہے۔ جب کہیں گے صاحبہ کی طبیعت کسلند ہوتی، سیر و شکار کے پڑے میں نواب صاحبہ فیض آباد کے قریب پہنچے کہ ایسا بڑا کھیلیم صاحبہ کا چراغ حیات کھل ہو جائے اور خواجہ سرا وغیرہ خزانہ اور توشہ خانہ پر اقامت دانت کریں۔ ایک مرتبہ جناب عالی سلطان پور میں تشریف رکھتے تھے کہ اس بذریعہ پرچہ اخبار ہنگیم صاحبہ کی حالت معلوم ہوئی بہت بلایہ داخل فیض آباد ہوئے۔ حاضر ہو کر نذر گزرائی اور سات مرتبہ تقبیل ہو کر اپنی آنکھیں ہنگیم صاحبہ کے ٹکڑوں سے لگنے لگے کہ غلام کو انہیں تھوڑے دیکھنے کی توفیق ملی اور حقیقت پیریں کا دم رکھنا منظر تھا انکے عہد میں پرچوں کی وصول تھی۔ ہر کاروں کو حکم ناطق تھا کہ روبرو جا کر خبر زبان عرض کریں۔ دن رات میں اختیار تھا جب پاہیں سوتے جاگتے عرض کریں۔ اس عہد میں ہر کاران اخبار کے پڑے کا دھانے تھے مشہور ہے کہ درگاہ حضرت عباس علیہ السلام کی مرمت دیکھنے نواب صاحبہ اکثر بنایا کرتے تھے۔ جس وقت تک عمارت کو ملاحظہ فرماتے سب کا دیگر ادب سے کھٹے رہتے اور یہ تک کلام کا ہرجا ہوتا۔ لہذا اس سرکار عالی نے حکم دیا کہ "تقصیر کار دیگر اس سادات"۔

نواب سادات علی خاں کو خیر ہو چکی کہ نواب فیض اللہ خاں وائی ریاست راجپور کے بیٹے مخالفت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لہذا نواب کو عدوت نے نصیر اللہ ولد بہادر اور مسٹر اسٹورک کے ساتھ پانچ یا چھ ہزار فوج راجپور بھیجی اور حکم دیا کہ ان صاحبزادوں کو گھنٹوں آئیں۔ یہ سپاہ راجپور کے قریب مقیم ہوئی، فیض اللہ صاحب کے بیٹے نواب نصیر اللہ کے پاس آئے۔ انہوں نے سب کو غلامت دیے۔ بعد ازاں صاحبزادوں کو گھنٹے آئے نواب سادات علی خاں سے ملاقات ہوئی، جناب مالی سنا صاحب کو غلامت، باہقی اور شمشیر منایت کو کے گھنٹوں میں رسنے کے لیے حویلیاں دیدیں۔ یہ صاحبزادے ڈیڑھ برس تک گھنٹوں میں رہے۔ لہذا ڈولہ زلی کے کہنے سے نواب ذکر سنا ان صاحبزادوں کو راجپور جانے کی اجازت دیدی اور ہر ایک صاحبزادہ کو غلامت بھگت یا چھوٹیل اور شمشیر منایت کی۔

ذائب بہادر کہ گمہ ذروں بہت خون تھا اور شہسوار می کہتا ہے زناہستے۔ فاما صے کے مات ہر گمہ ذروں  
نقد و زار نہیں اور نتیجہ ورا یہ ہو سیکہ کہ خراج معفت و ضمانتیں کے ساتھ تھا ایران، ترکستان،

فرنگستان، فرانس، انگلستان، اور ہندوستان کے نہایت عمدہ کھوڑے سرکاری اہٹیل میں موجود تھے۔ اور  
قسم قسم کے بھیرے پیدا کر لئے جاتے تھے۔ اُن کے لیے ولایت کی گھانٹس بوائے جاتی تھی۔ خانہ زاد بھیروں  
کو دادانہ و زور و مد میں بہو کر دیا جاتا، اور سب سے پانی کے درد و پانی یا جاتا تھا۔ ایسے ایا جب اور ناز پر وہ  
گھوڑے کسی ریاست کو نصیب نہ تھے اور نہ اُس وقت تک نصیب ہوئے۔ ساتھ ہی اسکے سرکاری  
نے بہت سے ارٹے بھینے جمع کیے تھے۔ اور گجراتی بل دکن سے منگوائے تھے۔ اس شوق نے ملاو کو پور  
سے بھی شوق تھا۔ اور سینڈھوں اور مرغوں کی لڑائی کے بڑے دلدادہ تھے۔ جنرل مارٹن سے بازی پر  
مرغ لڑاتے تھے۔ بھیر بازی بھی لکھنؤ میں انھیں کے عہد سے شروع ہوئی۔ پہلے پنجابی بھیر لڑاتے  
آئے تھے۔

ایک دن سرکاری اہٹیل میں ایک گھوڑا بھیروں کا دادانہ کھار رہا تھا کہ اتفاقاً نواب موصوف کی  
نظر پڑ گئی، فوراً اُسکی گرفتاری کا حکم دیا اور چند ماویاؤں پر بھیر ڈیا گیا جس سے مسترد و فخر پیدا ہوئے۔  
نواب صاحب کی جڑوسی کی انتہا یہ ہے کہ اہٹیل اور قیل خانہ کا آخور تک منایع نہ ہونے پانا۔ وہ  
وانے اور پیلے کی بچت اور جانوروں کے راتب میں کام آتا تھا۔

نواب یمن الدولہ نے اپنی خوش سلیقگی سے تیرہ یا چودہ کروڑ روپیہ نقد جمع کیا تھا۔ اس پر بھی جو بہت  
تعمیر مکانات شہر جدید برائے اٹھا، اہل زمین مرشدزادوں کو تعمیر مکانات کے لیے نہایت فرمایا، لاکھوں کی  
نقداد میں تھا۔ اخراجات صاحب عالی اور تنخواہ مرشدزادوں کی مشیر اچھی اگر نہ جو صاحب تھے انکے ہزار  
روپے تھے۔ اور جو صاحب المال یا اہل سپاہ وغیرہ دکن سے یا کوئی صاحب لیاقت یا عالی خاندان  
نباہ و پریشان ہو کر آیا اور چند روز سلام کیا تو از روئے اخبار یا کسی کے وسیلے سے بعد دریافت  
حقیقت حال اُسکی پرورش ہو جاتی تھی، شہر کے مکالم نہیں جاتا تھا۔ مرزا محمد مسین قاتل لکھنؤ آئے،  
نواب بہادر نے اُنکو طلب کیا۔ قاتل نے عرض دیا کہ اگر سب ذیل امور منظور فرمائے تو حاضر خدمت ہو  
(۱) دار یہ عہد سے طبیعت بہت مازوس سے اور اُس سے ہر دم شغل رہا ہے (۲) دستار سے طبیعت  
اُٹھتی ہے، کھانا سادہ و مطبوع طبع ہے (۳) جو علم حاصل کیا ہے اُسکی تعظیم و تکریم کا اس دار میں  
من و رجب باا اور کو شکر سرکاری نے بے شکستہ آنے کی اجازت دی مگر تعظیم کو کس پر دے میں بجا  
کہ جس وقت مرزا قاتل کے دروازہ پر پہنچ جانے کی خبر ملی، پہلے سے اُٹھا کر آنا شروع کیا۔ جس  
وقت مرزا ان کے دروازے میں قدم رکھا پہلے لکڑے کھڑے ملاقات بری، بے راسخ بیٹھے۔ بالی  
راستہ، اُنکی طاقت نواب صاحب نے آپ توجہ نہیں فرمائی اور قاتل نے بھی دم نہیں ادا، وہی

محمد سادہ کی ایک کی آمدنی ۱۵۷۶۱۱ روپیہ سالانہ تھی علاوہ ترقی محالہ کتب کے

س میں کتب میں بائیں کتب اور بہت سے بازار مشہور تھے۔ اس جہزی محالہ کتب کی پار پانچ لاکھ روپیہ تک پہنچی تھی۔ لاکھ روپیہ سال کا خرچ ریاست تھا۔ چھتیس ہزار روپیہ اور پانچ سو نو سو روپیہ سال لاکھ روپیہ سالانہ فوج کی تھی۔ فوجی جہز تک پہنچنے تک خرچے سے ملتی تھی۔

دکروں میں ہر رات فوج لے کر آئے۔ میں جمع رہتا تھا۔ ہرنگہ اور کام کی بڑی انتظامات تھے۔ ان کی بات تھی۔ جس کمرے میں حضور عالی کا غذا لے کر آتے تھے اُس کے ایک طرف طاقوں اور دھانوں کی چوکی جمع رہتی تھی۔ اُن پر پکیروں اور خواب کے دریاں ایک دروازہ شیشے کے گواڑوں کا مائل تھا جس وقت خواب کا بدل لانا ڈھکے کا غذا لے کر آتا تو کسی سے ڈھکے شیشوں میں سے نکال کر بازی کرتے اور نقص و خیر کا نشانہ کہتے۔ دوسو بھشتی اور تین سو بھٹے دسٹ مہج و شام بھڑوں پر چھڑکاؤ کے واسطے مقرر تھے۔ اور کئی سو سوئے پانچویں کی بھشتیں بنوائیں جو رات کے وقت خواب صاحب کی سواری کے ساتھ ہوتی تھیں اور ان میں کئی شیشیں اور بھٹے تھے۔

محمد سادہ میں حسب ذیل عمارت باغ اور گنج وغیرہ بنے۔۔۔ کربلا سے تال کوٹہ، کربلا سے باجھ سیتا، درگاہ حضرت عباس، غامین اور اسکے سامنے والی مسجد، مقبرہ بناب ٹالیہ، امام بڑہ مرزا اسکند رشک، جوار تیوری، کوٹھی موسیٰ باغ، بانی گارو، کنگا والی کوٹھی، جاد خانہ، نور شہ نزل، گول، دروازہ، لال بار، درسی، کوٹھی مہات بخش، نور بخش، نزع بخش، بازارام، سوتی محل، ٹیڑھی کوٹھی، کلاں، کوٹھی، چوڑکا، سبیل، کوٹھی، لکھنا، رستہ محمد باغ، نور شہ باغ، خامس بازار، چباز بازار، سارنگ، کاب گنج، مقبول گنج، سوادی گنج، گود گنج، بھٹی گنج، رستو کی ٹولہ وغیرہ۔ علاوہ اسکے مرشدانوں کو زمین اور تعمیرات کے لیے روپیہ بھی عنایت کیا، کہ حسب دلخواہ عمارت بنالیں جتنے رسالہ اور امراء، ملازمین خاص تھے ان کو بھی حکم دیا کہ تم سب بھی اپنے حسب دلخواہ مکان بنوا کر رہو۔ غرض کہ لاکھ روپے کی مالیشان عمارت موسیٰ باغ سے بی بی پوزک بنوائی۔ فی الحقیقت خواب سادہ بنانا

سے اور احمد کو ہندوستان کا بائیں بنا دیا تھا۔

خواب والا باہ کو مرزا جعفر کا رزڈنٹ کو درغلالتا تھا کہ اگر باوجود ان شرائط کے، راجہ جعفر کے خواب والا نشان نے مراعات سے چشم پوشی نہیں کی لڑکیوں کی شادی میں دیدار، دستہ خانہ میں خواب صاحب اگر کسی رزڈنٹ سے جیسا کہ چاہیے کہی ہو انشت نہ رہی، ہمیشہ جان کٹی جاتی۔ خواب



ریڈیٹ کی اس قدر نزول سمجھتے تھے کہ وہ سرکار انگریزی کی طرف سے فقط اخبار خیر و ممانیت کے رباقت کرنے کے لیے مامور ہیں، اور طرفین کے خطوط و کائنات کا یہ سنا ان سے متعلق ہے اور کسی دوسرے کام میں ان کو ممانیت نہیں اور ریڈیٹ اس کے خیالات اپنے آپ کو تصور کرتے تھے۔ ریڈیٹ کوئل بلی کی مدت قیام ۹ برس میں ہو گزرا، ظاہر ہے کہ ہر امر جزو کل میں بہت سے امور و حالات ریڈیٹ کی خود رانی و سینہ زوری میں آئے اور ذواب انکی مخالفت سے بہت تنگ ہوئے تھے بلکہ گئے اخبار میں ان سب خرابیوں کا ملل اور ملل ریڈیٹ کی شرارت اور حکم صاحب کا خوب لکھا گیا تھا۔ جس سے سراسر الزام کوئل بلی پر آتا ہے اور ذواب بین الدولہ حق بجانب نظر آتے ہیں۔ جتنے امور و حالات قانون و خلاف مزاج ریڈیٹ بلی سے سرزد ہوئے تھے ان میں سے ایک سو چودہ قصور فقہیہ تاریخ و حوالہ مقدمہ تعلقہ فرمائے تھے اور یہ سب محول لارڈ صاحب کی رونق انگریزی پر تھا، مگر تقدیر نے نہ چاہا زندگی کے وفائے کی، اچلے نئے ملت نہ دی۔

ادوات ذواب صاحب :-

قبل از طلوع آفتاب مجلس اسے انگریزی پوشاک پہنے برآمد ہوتے۔ سیاہ مخملی ٹوپی و زنجیر سبز لاجینی زیب کمر، پہلے مرشد زادوں، دامادوں اور امرے خاص کا سلام دیتے۔ ذواب شمس الدولہ اور ذواب نصیر الدولہ انکا سلطنت تھے، لہذا سلام کر کے اپنے فرائض انجام دینے چلے جاتے۔ ذواب صاحب ہوا خوری اکثر کوٹھی دکشا، یا سوسی باغ یا دریا پارک کرتے اور بعد دو گھنٹے کے واپس آتے۔ سواری کا طریقہ یہ ہوتا کہ کبھی گھوڑے پر کبھی لم تھیں پر سوار ہوتے۔ چلوں سواری سے انکار آئے ہوتا دیگر حاضرین اپنے اپنے اہیل پر سوار ہوتے۔ جب حضور گھوڑے پر سوار ہوتے فقط رد خاص بردار یا دو چو بردار اپنے بائیں تھوڑے فاصلے پر ہوتے، یا مرزا کریم بیگ یا محمد غلامی خاں خانہ زادان حضور کی پر سوار لباس انگریزی میں آگے ہوتے، یا چند شکاری کتے یا باز بردار وغیرہ کچھ فاصلے سے پیروی۔ چلوں میں انگریز صاحبان خاص ہوتے۔ رامیں اکثر مسافر یا داد خواہ عرصی و استناد دیتے۔ جب در دولت پر واپسی ہوتی، اکثر مسلح لگا، اشت سواران جدید کی ہوتی۔ اس وقت رمضان علیخان اور اشرف علیخان حاضر رہتے۔ بعض دن حضور عالی شمس الدولہ یا نصیر الدولہ کو سل دیکھنے کا حکم دیتے۔ ہر روز چوکی میں انیس سو آدمی ہر فرقے کا حاضر رہتا۔ از انجملہ دو سو کئی سواری بھی ہوتے تھے۔ بس سچ کی سواری کا، باہو چکا۔ امرا یا معززین در دولت سے رخصت ہو جاتے۔ ذاب کے صحیح چاہانی بہ آہ کر سی نشین امراء، مقرران خاص، شل صدام الدولہ، مرزا جوا، مرزا محمد تھیں خاں شاہر جہلم

کرسی پر بیٹھتے۔ اور گٹاؤ ڈھنڈس، ڈاکٹر لا وغیرہ اگر کسی پر سامنے بیٹھتے ہیں کسی خاص میراثنا و املاہ خاں،  
میر ابو القاسم خاں وغیرہ۔ اسوقت بحرئی، معززین، خواجہ سرا، باب سلاطین ہوتے۔ عرض ہو گئے۔

سامنے ٹھہرا ہوا کرسی کو بدنامت سلام کرتا۔ باہر پر آمد سے میں انگریزی بیڈ بچا جس جیسی سے ذاب صاحب  
خاں لب ہوتے، گنگا، قاتمانہ اور باؤ تار ہوتی۔ اس بچے کے بعد چائے پانی پر خاصتہ ہو جاتا۔  
شنبہ کو روزینٹ کی چائے پانی میں صحبت ہوتی۔ جتنے انگریز چپاؤنی سے ساتھ آتے۔ بالی پر  
زیر کوٹھی اترتے۔ ہر ایک کا حقہ چوپان میں ہوتا۔ ٹھٹھے کی آواز سے کمرہ کوخ جاتا۔ باب پر روشنی  
ایک کمرے میں غایت خاص ہوتی۔ اسے ذاب اور روزینٹ کے کوئی نہ ہوتا۔ اسوقت املاہ  
ظرفین میں گنگا ہوتی۔ ہر شنبہ کو ذاب صاحب کا چائے پانی روزینٹ کی کوٹھی یا صوبہ میں ہوتا۔  
اس بچے کے بعد خاصہ تناؤ دل فرماتے۔ اسوقت مقرران بارگاہ یا اردلی خاص اور کبھی ذاب بھال الد  
یا ذاب رکن الدولہ شریک خاصہ ہوتے۔ گیارہ بجے کے بعد خاصہ سے فرصت ہوتی اور ذاب آ  
مجلس میں تشریف لیجاتے اور کوچ پر استراحت فرما کر حقہ سل فرماتے۔ باب بارہ بجتے، ذاب ہوا۔  
کا غذات ملاحظہ فرماتے۔ ذاب نصیر الدولہ، بلالغافہ کاغذ میز پر رکھا رکھتا آتے۔ ذاب شمس الدولہ  
اپنے کا غذات کے لگائے میز پر رکھا رکھتا کمرے میں تا انتہام ملاحظہ کا غذات حاضر رہے  
علیم ہدی علیخان، راجہ دیا کرشن، رے رتن چند، رے صاحب رام، منشی رفیق علی، منشی برہان  
اور معزز منشی اپنا اپنا لگانہ میز پر رکھا ہر ایک اپنے مقام پر پہنچا۔ بیٹھنا بیٹھنا بعض درت خیمین قلب  
فرمایا، فوراً حاضر ہوا۔ جب لگانہ کو ملاحظہ فرما چکے دستخط کر کے میز پر یا ہلوے میز میں پھینک دیے  
جس کاغذ کو حضور اقدس عشت آب میں ڈال دیتے تا خواجہ، کمار اسی وقت کاغذ کو پانی میں  
خوب مل کر کنارے رکھتا، ایسا شمس پڑھا لکھا اس کاغذ کی خدمت کے لیے جاہل بیکار لازم ہوا  
ذاب صاحب نے اسکی آزمائش اس طرح کی کہ ایک فرد کاغذ پڑھ کر پچھلکے اور اس آدمی سے  
کہا کہ وہ فرد اٹھا لا۔ اس نے فرد کو دیکھ کر اسکی پشیمانی صیغہ کی گھر کے حاضر کی۔ ذاب سمجھ گئے کہ  
یہ پڑھا لکھا ہے۔ لہذا انوکری سے برطرف۔ غرض کہ پھر کمال سب کا غذات کو ملاحظہ فرما کر خدا  
فرماتے۔ جب ذاب صاحب اٹھ جاتے، پچاس ہدی حاضر ہوتے۔ سب کا غذات جمع کر کے  
جسکے نامہ فقط موتے جہاں کے ہر دن ترس اسی وقت بھیجا دیتے، اور اسی دن، نتراجا سے  
سب ادبہ جاری ہو جاتے۔ چہ کہ جاڑے کے موسم میں دن چھپتا ہوتا ہے، لہذا جو کاغذ ٹھیک  
سے رہ جاتا رات کو ملاحظہ ہوتا۔ اخبار بلالغافہ کرتا۔ مہر خاص کے وقت ظہر الہیہ ماء نہ کر

ما سنے حضور کے ٹھہر کر کے صند و قچہ ٹھہر بیٹھے۔ پرچہ پیام یا محبت نامہ رزڈنٹ کا مرزا جعفر لایا کرتے تھے ایک دن خواب اعلانے اندراج مناب فرمایا کہ کرنل بلبل میرے سامنے بات نہیں کر سکتا، یہ بڑا کرنے والا تم ہو۔ اس دن سے فتنی میر میر جاسٹنگے۔ جواب تحریر کیا ہی دن بنا تھا۔ خواب بہادر کی طرف سے مولیٰ رزڈنٹ: اس وقت ہوتے تھے رزڈنٹ سے بد رفتاری کی وجہ سے رشتہ جو اب بیا کر گئے۔ کے ذات خواب مولیٰ کا گڑی یا آجیان پر سوار ہوئے، جڑی کی راس خود لیتے۔ اور مولیٰ نام میں راہ بننا دیکھتے تھے اور سوار کی پلوں میں سوار ہونے خواب ذکر کہیں کس کچ کی عزت کی جانتے اور غیر میں پرورش ماہارٹ غلہ خود ہی تھے۔ اس سے بہانہ ہی ڈرتے رہتے کہ کم و زیادہ فرشتہ نہ کریں۔ سال بھر میں وہ غریبا نہیں رزڈنٹ کی کوئی میں پر قیں ایک سالگرہ نہاؤ لندن کے قیام و دوسری پناہ دن کہ۔ ان دنیا فتنوں میں خواب صاحب کا ساٹھ ستر ہزار روپے مرمت ہونا۔ اس قدر حال کشیاں مرشد زادوں اور والدین کے ملحقین، امراء کو گوتے کے بار اور غلام و غیرہ۔

خواب صاحب کے ہمد میں بخوبی پر اوس پڑ گئی تھی۔ دیکھتے تھے کہ خود حضور کو اس سے پہچان نہ تھی لیکن پھر بھی اس فن کے کئی کمالین لکھتے ہیں جو دیکھتے۔ مثلاً میر میر علی سوز خان، ان کو ظلم ہو سکتی میں مرتبہ کمال حاصل تھا، دوسروں پہ در ماہہ سرکار عالی نے مقرر کر دیا تھا اور انچ سو روپے کا فائدہ بھی دیا تھا۔ ہمارا راج پر تلاش اپنے میں بے مثل تھا، بتاتے اور کوئی پتھر کرنا تھا، کوئی دقیقہ عالم بن گیا تھا اس سے نزدیکداشت نہیں ہوا تھا۔ خواب کا ملازم تھا۔ مسلمان دافری راج میں بہت نامور تھی۔ کر لیا بھانڈ بھی اس میں تھا۔ تھادی گویے کا لڑکا خوب گاتا تھا، مرنے سے چند گھنٹے قبل خواب نے اس کا گانا سنا تھا اور انعام بھی عطا فرمایا تھا۔ اگر یہ خواب گورنر جنرل نے بھی یاد کیا تو ان کا مرزا سادات علیا واد پانچ گنگ کی تیار کیا۔ سید کا دیا تھا، پھر بھی خود اختیار راست نہ دیکھتے تھے پھر تھے عدلانہ و برہنہ و غیرہ کی بنیادی۔ خواب ذکر ہتر آشام، ظلم و ستم، متعلق مزاج پیدا فرمایا اور دوسرے اند کے تھے سمجھدار سزاوار کے قدر و ان پڑھتے گھوٹ کی عزت کرنیوالے تھے بڑے صنعت فراج، انانیت شاد و بزدلی تھے۔ اور خواب سچ گوئی میں کمال، تیر اندازی میں شاعر بند، ق و شمشیر زنی میں بوق دم تھے ہر امر میں حلیہ اثر و اثر کے پابند تھے۔ عمارات و درزش اور سیر و شکار سے شوق تھا۔ اکثر بڑی لباس سے بلی شوق تھا۔ بلبل اکثر انگریزی لہجہ میں گفتگو کرتے تھے۔ اپنے اوقات کے بڑے پابند تھے۔ ہا ہا ہا سے نفرت تھی تو خواب بڑے سیر سپہ تھے۔ تیرہ باچہ و بکر و نقد جمع کیا تھا، لیکن اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وقت بہت مرث ایک وقت کی مان جو کے لیے کافی ہو گا۔ خواب کی بد رفتاری کا ہندوستان بھر میں جواب دہ تھا



عبارت تھے اور سچے لکھتے تھے۔ انتہا پر داری میں بے باک تھے۔ خیر خواہیت، سفلیت، دلی خیر، وہ خطہ  
شکستہ قوت لکھتے تھے، کاغذات نکھار، اشت خود ملا خندہ فراتے۔ رہتے اپنے سندھ نشینی سے انتقال تک۔

نواب کا کوئی دن ملا خندہ کاغذات سے غائب نہیں گیا۔ اسی ناکر نظر سے کاغذات ملا خندہ فراتے کر سکا۔  
میں فرق آگیا تھا۔ جس امر میں قانون اور تادمہ جاری کیا آخر عمر تک بخوبی منام کو پہنچایا اپنے  
عزم میں مستقل تھے اور کسی مشکل اور دقت سے جو انکو پیش آتی ڈرتے نہ تھے۔ ملک کی ترقی اور دیار  
کی خوشحالی کا بہت خیال تھا۔ اپنی طبیعت پر ڈاڑھ بڑھاتے تھے۔ سو اے خاص محل کے کوئی دوسرا کل  
متاثر نہ تھا سب کا خرچ یا جاگیر مقرر کی جاتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ کی جائیداد نواب گنج میں خاص محل  
کے لیے تھی۔ اس عہد دولت میں ملازم جدید کے واسطے کوئی جائداد کوئی متجوڑ نہیں ہوتی تھی۔ ایک  
ہند میں کوئی اندرونی اور بیرونی فساد نہیں ہوا۔ یہ چلے شخص تھے سینوں نے محفوظ خزانہ قائم کیا۔  
شلہ حضور کی ایجاد ہے۔ لکھنؤ میں اربعین تک عزاداری کی رسم انھیں کے زمانہ کی نکالی ہوئی ہے۔  
سندی کی نکلتاں کے اس وجہ ثابت تھے کہ ہر وقت اپنے سرانے رکھتے۔ انکے بعد سے امید علی شاہ  
تک ابابیدار مغر، عالی نعم اور عقیل کوئی فرماں روا نہیں گزرا۔ نواب کی بلویت میں عبت  
پروری بہت تھی۔ انکے طرز عمل اور انکی پالیسی میں ایک ایسی مضطربانہ ہوشیاری اور ہراس  
بمقدار ہی نظر آتی ہے کہ چاہے عوام کو پتہ نہ چلے مگر مانتے مارم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والے  
تھے اور انکے تیور بہت ہی پُر معنی تھے۔ ملک کا انتظام انھوں نے غیر سہولتوں، ہوشیاری اور خوبی و  
شائستگی سے کیا۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر انکو آخر عمر تک پورا اطمینان نصیب نہ جاتا تو تمام  
گزشتہ پٹریاں اور خرابیاں دور ہو جاتیں۔ اور وہ ایک کی پوری پوری اصلاح کر لے جاتے۔  
لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ انکے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ انھوں نے جو  
املا میں کہیں بہت کچھ قابل تریف ہیں۔ انکی کارروائیاں دیکھ کے ذی ہوش اور منصف مزاج لوگ  
انکی لیاقت اور خوش تدبیری کے قائل ہو گئے۔ ان کے دبا میں بالکالوں اور قابل تدبیر لوگوں  
کا انا بڑا مجمع ہو گیا تھا کہ اُس وقت ہندوستان کے اور کسی دربار میں ایسے صاحبان کمال نہ نظر آسکے  
تھے۔ ایسے لوگ اکثر اُس جگہ جمع ہو اکوٹے ہیں جہاں کے رئیس مہول سے زیادہ نیامنی ظاہر کرتے ہیں  
سادت علیاں، جیسا کہ ہم بیان کو چکے ہیں جُزس تھے، مگر اس کثابت شہری کے ساتھ یہ سذت  
تھی کہ انکی ذاتی قابلیت دوسرے بالکالوں کی لیاقت کا امتزاج کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی اور

لہذا ابابیدار جو مزدور کے وقت کام آئے۔

اسی بات نے اُنکے ہاتھوں سے یاقین لوگوں کی بڑی بڑی قدریں لڑائیں۔ اور لکھنؤ پہلے سے زیادہ اہل کمال کا مرجع بن گیا۔ جو قابل آدمی جہاں ہوتا سادات علی قاسم کی قدردانی کی شہرت سننے ہی اپنے وطن کو خیراب کے لکھنؤ کا رخ کرتا، اور یہاں آکر ایسا آرام پاتا کہ پھر کبھی وطن کا نام نہ لیتا۔

انشاء، محققان، قاتل، ناسخ اس عہد کے نامی شاعر تھے۔ سید انشا نے نواب مسائب کے حکم سے دہلی، تھانہ، بکرا، سوات، قنوی شکر رانا، اور دہلی کے لطافت لکھی۔ یہ کتاب زیادتی کا ہر پہر اُٹھتی تھی، دایرہ دارت کا لہا لہا، ہوا بخار، لکھنات کا خزانہ، اور بنی نکات کو کچھ تیر ویا مدنی کے شہر آفاق شاعر اور زیر دست ادیب، سید انشا کا وہ قابل تہذیب کا زمانہ ہے۔ انشا نے دہلی، سران کمال پر پہنچا دیا اور سب سے پہلے فارسی اور عربی کی تہذیب سے آزاد لڑنے کو اس کی مہرت و سخاوت کی مثال ڈالی تھی۔ اس کتاب میں مہرت و سخاوت، سنلین، بیان، مسابقی، عربی سب کچھ موجود ہے۔ مگر شوش مزاج مصنف نے ہر علم کو مزاج و تہذیب کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اور وہ زمان اس کے احسان سے کبھی سجدہ و شکر نہیں ہو سکتی۔

افسوس نواب سادات علی قاسم کو زہر دے کر دشمنوں نے زمین کا پیوند کر دیا۔ زباز زہر دیا ہے کہ حب دیت کو قبر میں ڈنارا تو دشمنوں نے کہا کہ آج عقیقہ زمین میں دفن ہوئی۔ میں اس سنگین میں زہر دینے کی کیفیت نہیں لکھوں گا۔

سید اسرار حسین خاں طباطبائی

(الناظر، دسمبر ۱۹۲۹ء)

# واجد علی شاہ

(از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

۱۔ سفر کی ۲۲ تاریخ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۵۳۱ء ہر شام سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بہار کی آپوشی اور تخت نشینی کا غلغلہ تمام شہر میں ہے۔ آدمی پر آدمی ڈوب پڑتا ہے۔ پلیٹیں سلامی کو پھاڑتے کھڑے ہیں۔ کارچونی خوشنماور دیاں پنے ہوئے سوار ٹل رہے ہیں۔ رسالہ داروں کے نئے ٹھاٹھ ہیں در دست سے مہکتاں ارم اور کٹھی فرخ بخش تک۔ روشنی کے ٹھاٹھ لٹے ہیں۔ ہر برج پر تھامی کی جھنڈاں نصب ہیں۔ غاص بازار سے رستے تک تیلہ لگا ہے۔ دُند پھر رہی ہے۔ تاشائیوں کا شرک پر ہجوم ہے۔ اتھائی روشنی سے دیوالی کی رات معلوم ہوتی ہے۔ دریا میں چراغوں کی روشنی کے عکسے پانی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دریا میں بھرے سجے ہوئے کھڑے ہیں۔ شاہوں کے بادبان چبوتے ہوئے ہیں۔ پھلے والے پیرے پر ڈنکا ٹرم بج رہا ہے۔ انکھی ڈانڈوں سے میٹر ٹاب بجا رہے ہیں۔ باغ گلستان ارم رنگا بہشت بنا ہوا ہے۔ کٹھی فرخ بخش ڈھن کی طرح بھی ہوئی ہے۔ لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ غربی اور شرقی دونوں بیٹا تک رستے کے بند ہیں راستے میں ہمارا جہانگیر کی سوار سی آئی، بیٹا تک کھانا، روش پر نواب امین الدولہ ٹل رہے ہیں۔ فتح الدولہ اور عنایت علی رسالہ دار کو اپنے ہمراہ لیکر بارہوری کی طرٹ سے کھڑکی سے گلستان ارم میں چلے آئے۔ ہمارا جہانگیر نے فرماں جلوس سنایا۔ دوسری طرٹ منسلح السلطان اہتمام الدولہ تید حسین خاں شہرت الدولہ غلام رضا خاں۔ مرزاوسی علی خاں۔ حفیظ الدولہ موادی میر باقر علی۔ سفیر شاہی کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سوار سی کی آمد آمد کا غل ہوا۔ چوہدری میرے، چکار رہے ہیں سوار سی ہے بادشاہ عالم کی نگاہ رہ برود چاروں طرٹ سے بڑی بچ کی آواز آرہی ہے۔ کرنل رجینڈرنڈینٹ بہادر خاں ہو رہے ہیں کہ کیوں اتنا غل مچا یا ہے، آہستہ آہستہ بولو۔ اس شور و غل میں



نستاکوت ہے۔ آخر پھر اسی سے دلائی لیکر کمر میں لگائی اور صاحب بہادر بھی قرینے سے کھڑے ہو گئے۔ جب سواری کا بوجھ زینے پر چڑھنے لگا۔ ہمراہیوں کی کثرت سے آہنی جھنڈا جو زینے کی کڑیٹ میں لگا تھا، ٹوٹ کر نیچے آ رہا۔

بادشاہ کی سواری بارہ درزی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑے صاحب سے ہاتھ ملایا۔ بادشاہ کے مقرب خاص، میرالدولہ میرزہ دہلی خاں سولنے کا خاصہ ان ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ نواب علی نقی خاں تبسج ہاتھ میں لیے وظیفہ پڑھتے ہوئے بیٹھے آئے ہیں۔ سعید الدولہ علی حسین خاں داروغہ دیوان خانہ محسن میں کھڑے ہیں۔ بادشاہ تختِ رواں پر سوار ہوئے۔ بارہ درزی کے کمرے خاص میں جا کر دو گانہ ٹنگرا ادا کیا۔ عیادت خاص دوش پہ ہے، سعید ایرانی ہاتھ میں ہے آئے ہیں بوتیوں کا الا پڑا ہے، کمرے چمکانہ بھا ہے۔ مشرور کا ہاتھ بڑے پاسینچے بھاپنے موس، سرشا کشمیری شال کی تباہ پرستن زیب سیم ہے، دوپٹی ننگے دار کا دانی کی پچاں ٹوپی زیب سر ہے، زلفیں چھٹی ہوئیں، گھنٹیل جو تا کا مادہ زیب پائے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے زینے سے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ نواب امجد الدولہ نے جھولی کشنی جس میں آج شاہی رکھا تھا پیش کی۔ بھی پٹاؤ تخت پر کھڑے تھے کہ جناب محمد العصر نے آج شاہی سیم اللہ لکڑیاب سر کیا۔ ایک طرف بڑے صاحب بھی تاج میں ہاتھ لگائے ہوئے ہیں۔ ہا آواز بلند کہا "واہ علی شاہ، بادشاہ اودھ ہوئے"۔ پھر بادشاہ تخت رواں پر چارہ زانو ہو بیٹھے۔ تخت کے اوپر ایک کارچولی منڈھا بھی کھنچا ہے جسکی ڈوریاں بٹھی ہیں۔ اور کعبے سولنے چاندی کے ہیں۔ اس کے نیچے پتر مرغ خواں لیے کھڑے ہیں پشت پر دو جنور بردار کھڑے ہیں (یہ درزی تخت و تاج و پتر ہے جو غازی الدین حیدر بادشاہ کے وقت میں دیکر ورور روپیہ میں تیار ہوا تھا) پہلے نواب نے نذر پیش کی۔ پھر شہزادوں نے نذرین ہین بڑے صاحب زیر تخت کرسی پر بیٹھے اور سب صاحب لوگ کھڑے رہے۔ ملازموں نے بارب سلام کو کے نذرین پیش کیں۔ تمام رجاء اردوں کی طرف سے نذرین گزریں۔ نذر کی اشرفیاں ہینوں خول میں جمع ہوئیں۔ بادشاہ نے چلے نام سادات حسین کے دستخط فرمائے۔ مبارک سلامت کا غل ہوا۔ کئی ہزار لکھوں پرچوں پر پڑے لگی، اونچے سر میں شہنائی بجائی گئی۔ نور کے ٹائٹل جتنے سہری رہے پہلی موبائل پر پڑے، دوپٹوں پر کادار پٹریاں بنی ہوئی، پچکے کی تین ٹیس کی گوٹ

ہاتیاں لگائے ہوئے، مکر چکیتی ہوئی۔ سردی کا زمانہ ہے۔ سرخ، سبز، کار، چابی، بوشالے جہاں ذرا  
کھسک گئے، کانٹوں کی سبلیاں ترپنے لگیں۔ اٹکا بھاؤ بتا کے ناز سے پھرتا۔ راکھی کا سناڑ کے پٹے  
سے نکلنا، تان کا ٹھٹھا، خوب لطف دکھا رہا ہے۔ سرزمی پشور میں بہار دکھا رہی ہیں۔ دھار  
دکھتے انداز سے ساز بجا رہے ہیں، کلا نوت، پرہین، کندھوں پر اچھے لپچے رکے کھڑے ہیں  
اشارہ ہوا اور مٹیوں گئے۔ ٹپے، غزل، کٹھری، ترانہ، خیال اُڑا رہے ہیں۔ آوازوں میں سوز کا  
پاٹ ہے۔ چینی لوگ مزے سے جانزنگ بجا رہے ہیں۔ نرنگی ارگن بجا رہے ہیں۔ کہیں بانیہ بجاتے  
اہل دربار کو خلعت لے۔ نمک خواروں نے مزے لوٹے۔ فرمان جانی جاری ہوئے۔ سلاخی کی  
توپیں شہر کے چاروں طرف پھیل گئیں۔ ڈھنڈور اٹپا۔ خدا کا نامک بادشاہ کا آج۔ بادشاہ کے  
بادشاہ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بہادر ہوئے۔ جو کوئی عدول حکمی کر چھپا سخت سزا پائے گا۔ پھر  
تخت سے اتر کر تخت رواں پر سوار ہوئے۔ ایک طرف بڑے نائب، ایک طرف چھوٹے نائب  
ہرکاب ہوئے۔ روشن چوکی والے شادیاں بجاتے ہوئے ساتھ ساتھ ہوئے۔ کہیں بہار کی طرح  
فوج واسطے حفاظت کے آئی۔ نواب امین الدولہ مع اہل خانہ رخصت ہوئے۔ چھاؤنی سے پانچ  
کینیاں واسطے انتظام کے آئیں۔ حضور کی سواری محسرا میں اتری۔ جنرل مرزا سکندر رخت بھائی  
کو نذر دے کر بہت آبدیدہ ہوئے۔ بادشاہ بہادر نواب اکبر کھنڈر غفر الزمانی، نواب آج آرا بیکم  
والد بادشاہ نے بلائیں لیں، سیلے صدقے اترنے لگے۔ محسرا کے تمام محلے نے نذریں دیں۔  
اتنے میں ابر رحمت پھر کر آیا اور کچھ ترشح ہونے لگا۔ صبح کو نواب امین الدولہ مع اہل خانہ  
دربار منتظر تھے کہ حضور تشریف لائے۔ پھر وہی جشن وہی جلسے ہونے لگے۔ انعام اکرام تقسیم ہوا۔  
کچھ دنوں بعد نواب امین الدولہ معزول ہو گئے۔

۵ اگست ۱۸۳۷ء کو نواب علی نقی خاں بہادر کی سفارشیں ہوئیں۔ بادشاہ نے طلب فرمایا۔  
حاضر ہوئے۔ سلام کیا۔ نذر دی۔ انتہائی پارچے کا خلعت وزارت مرست ہوا۔ لیکن کہیں خلافت  
جہاں داری اقتدار و سلطنت و شہراری امیر الامرا دارالہام و زور المالک معتمد الخاقان ملین  
السلطان سبع مسائل روح معقول مرکز دشمن گاہی ساعد ساعد کیرنگی و صفایاں جناح صدق  
و تمام مرشد پرست اخلاص گزین غامد داد عقیدت سرشت صفوحہ آئین ممتاز دی انتہا ار پار  
و تادار سپہ سالار رستم ہند دارالحد و مستلک نواب علی نقی خاں بہادر سہراب جنگ فدی خاں  
جان بھارہ ہندو دارالحد و مستلک نواب علی نقی خاں بہادر سہراب جنگ فدی خاں

پچیس ہزار روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ انہوں نے دست بستہ عرض کی کہ فیض آباد کا دار و نہاد انت  
(رج) حفیظ اللہ نرنگی محل کا مولوی بے تصور محسن وزیر سابق کے قصاب ہیں آگیا ہے میری دوستی کے  
بعلے میں غمانہ نشیں ہے، مرزے سے بید ہے کہ میں خلعت وزارت پہن لوں اور زور محرم دو جائے۔  
حکم ہوا اچھا اسکو بھی پیش کرتا۔ دوسرے روز مولوی صاحب طلب ہوئے۔ انکے گھر میں سیرا  
ناتہ تھا کہ شاہی چوہا رہنے آکر سلام کیا۔ اور کہا کہ آپ کو وزیر اعظم نے یاد فرمایا ہے۔ یہ اسکو

ادائیگی بھی لڑے مگر آستانہ عالی ہوئے۔ دربار لگا ہوا ہے۔ وزیر علی نقی خاں دست چپ  
کرسی پر جلوہ فرما ہیں۔ شہزادے داہنی طرف کرسی پر جلوہ افروز ہیں اکابر سلطنت، رفقاء  
مصابین اپنے اپنے مراتب سے بیٹھے ہیں۔ کہ ڈیوڑھی سے چہرہ ہارنے آواز دیتی بادشاہ عانیاس ہو گیا  
حفیظ اللہ حاضر ہے۔ گہرہ پرو۔ اسی طرح ڈیوڑھی سے دربار تک دو طرفہ چہرہ کھڑے ہوئے آواز  
کے بعد وگیٹ لگا رہے ہیں۔ کہ میرد ہے کو خبر ہو گئی۔ اس نے دست بستہ عرض کیا "موزی حفیظ اللہ  
حاضر ہے۔" بادشاہ نے اشارہ ابرو سے اجازت حضور ہی دی۔ مولوی حفیظ اللہ لال پروہ کے  
پاس کھڑے تھے۔ دار و نہاد ڈیوڑھی نے حکم دیا جانے دو۔ پروہ اٹھتے ہی اذکار کا اٹھاڑا توڑا۔  
یہاں سے جھجک جھجک کر برادر سلام کرتے ہوئے بھاڑے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے رہنے باقیہ  
پانچ اشرفیاں (جو کسی مہاجن سے سیویا لے گئے تھے) رکھ کر درباریاں ہاتھ نیچے رکھ کر تڑکھائی باجیاد  
نے صرٹ ہاتھ رکھ دیا۔ نذر قبول ہو گئی۔ ہفت پارچہ خلعت ملا اور دوسرا دپہا ہوا رتخاوا سابق پر  
بہال ہوئے۔ خلعت میں چہرہ، گوشوارہ، "دشالہ، دواں، نقان کخواب، پٹلا، تیسرے منگے کی  
مرصت ہوئی۔ رخصت ہو کر گھر آئے اور نے سرکاری ہاتھی پر سوار کر کے بیٹیا۔ گھر پر آ کے ایکسٹہ  
روپیہ مہاجن سے اور سیویا لیا۔ شام کو میرد ہے، چوہا، شاہی ملک کے الگ انعام کے لیے حاضر  
ہوئے۔ پشکل تمام پانچ سو روپیہ انعام دے کر جان بچائی۔ لوگوں نے کہا یہ مولوی صاحب ہیں  
جو کچھ دین تبرک سمجھ کر لے لو۔ دوسرے روز واجب العرفین پیش کی کہ بخش گری میں تمام بیٹے باجیاد  
جو منظور ہو گئے۔ مولوی صاحب اپنے سابقہ عہد پر مستاء ہو کر فیض آباد گئے۔ اسی طرح آجپیشی کا پیش  
مہینوں رہا۔ رفیق نامی خواجہ اسد علی خاں تین کو خلعت سر فرار می ملایا ہوا۔ مصائبین خاص میں  
اسم ہو گیا۔ پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ آفتاب الدولہ ہر الماک خواجہ اسد علی خاں  
ہوا شمس نیگ کا خطاب ملا۔ خدمت دیوانہ تفویض ہوئی۔ ہمارا راجہ بالکرشن کو شیر الدولہ  
فرمان ملا۔ خدمت دیوانی حاصل ہوئی۔ حیدر حسین کو انعام، اردوہ خطاب ہوا۔ دیوان عام کے



مستقر ہوے۔ بشیر الدولہ، گلشن الدولہ، ارباب الدولہ، حسن الدولہ، فیروز الدولہ، خواجہ سراؤب  
 ناظر مہکات، شاہی مقرر ہوے۔ حاجی شریف ترک سواران خاص اور کئی بنالین کے رسالہ اور  
 ہوے۔ شہادت الدولہ، ولاح الدولہ، لازمست سے موقوف ہو گئے لیکن شاہی وظیفہ جاری رہا۔  
 شامان اور دھکے مہم میں بلکہ تمام ہندوستان کے راجہ ہمارا راجہ بادشاہوں کے زمانے میں یہ بات تھی کہ  
 جب کوئی شخص بادشاہ کے دربار میں پیش ہوا اور اسکی نذر بادشاہ نے قبول فرمائی، سمجھ لیا چاہیے  
 کہ اسکو لازمست سرکاری مندر لگی۔ یا کسی کو بادشاہ نے خطاب مرحمت فرمایا، تو خطاب کے  
 ساتھ ہی ساتھ معقول تنخواہ ضرور مقرر کی جائیگی جس میں عزت و آبرو کے ساتھ بسر کر سکے۔ اور یہ  
 تنخواہ پشت در پشت چلی آتی تھی۔ تمام اوروں کی سلطنت میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جسکو خطاب  
 ملا ہو اور شاہی وظیفہ نہ مقرر ہوا ہو۔ آخری شاہ اوروں کے دربار میں تو تمام ہندوستان کے پیدہ  
 لوگ مصاحبوں میں لازمست تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر شاعر، مولوی، دانا، حکیم۔  
 اسی زمانہ میں جناب عالی کا مزاج کچھ آسان ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اکھڑہ صحت حاصل  
 ہوئی۔ ہزاروں سمدتے اترے، تیل ماش بڑے ترک و اختتام سے آئے، بشتیں، حرا، پیر  
 ہوئیں، غسل صحت کی تیاری ہونے لگی۔ حکم ہوا کہ جلد سنان کی جائے۔ سلطان عالم حضرت عباس  
 کی درگاہ تشریف لے جائیں گے۔ بلا ناسے میں سب، چوبوں، بھرنی بھی سب حاضر ہوں۔ چوک  
 میں آئینہ بندی ہونے لگی۔ تاریخ صبیحہ پر بادشاہ حمام میں تشریف لیگے۔ نثار صحر کر جائے غنائیں رائق  
 افزہ ہوے۔ پشاک کی کشتیاں آئیں، لباس فاخرہ زیب جسم فرمایا اور ہوادار پر ہوا ہوا کر باہر تشریف  
 لائے۔ ہماری وارہا تھی پر ہوا رہے۔ جھنڈیاں نامی کی جھک گئیں۔ سلامی کی توپیں چھوٹیں شہر  
 میں سواہی کی دھوم تھی۔ در دولت سے درگاہ تک تھانی پینکھ تو سر ہی سر جائے۔ سواران بہت  
 ترینے نکلے۔ آگے آگے تمام فوج، ہسکے بعد جلیو میں برتن، مہاشیں، سواروں کے پرے دور سے  
 غل ہو گیا، نواب ڈھکا آیا، کینا دہا، ہی مراتب آپہنچا۔ اسٹے میں برق اور پرچم دکھائی دیا۔  
 نشان، علم نظر آئے۔ آگے آگے سچے چہر کا اکر تے ہوئے مشکوٰۃیں، ٹکاب، درگاہ، پیرے ہوئے،  
 تمام کی نکلیاں بانہے ہوئے۔ دھن سو شتر سوار، زنا، شے، بانہے ہوئے پندرہ روایاں ٹکادیں کی طاق  
 ست ساڈنیاں جہاد، ایک ایک منزل کے دھادے کی۔ انداز چوبدار روشن ہوئی، اسٹے شہنائی  
 نواز جلودار غنچہ رو، مگنم، ہننے باپیں چور ہلاتے دے، چہر، پر سہ، چہر، کسی لگائے ہوئے، صبیحہ شہاد  
 کا سامان قرار دل غضب کے شکاری ہیں، سقا، تیز، خالی بوچے اور ہوادار سوزن، لکپاں، نفیس پاکیاں  
 انگریزی اچے بچے ہوئے جاسبت ہیں۔ اسٹے میں جلوں خاص آیا۔ برچھے و لے برتن ادا، بولے

۱۔ اے خاص بردار کندھوں پر غاصیاں رکھے ہوئے۔ پکڑی ساز مرص کار۔ نقیب آواز دگاہے ہوئے  
 ادب ارفع دولت و انتہا کی ترنی۔ ساتھ میں ہاتھیوں کے غول مٹھلی کا رچلی جھولیں پڑتی ہوئیں۔  
 ریشمی رستے۔ لایانی مرغ کا رگٹ۔ شکوں پر چاند سورج ٹپے ہوئے، دانتوں پر چوڑی چڑھی ہوئی،  
 فلیبان بھی بکھرے ہوئے، سر پر چیرے بانٹے ہوئے، ہڑتے اور گوشوارے لٹکے ہوئے، گنگنا جہنی  
 گججا گھیں لیے ہوئے، جن پر بادشاہ کے عزیز قریب جلو، انگن۔ پنج میں بادشاہ سلامت، (ادھر ادھر  
 تمام دولتخواہ ارکان دولت ہر اسی میں اشرافیاں، پے لٹاتے ہوئے۔ اس شان و شوکت  
 سے سوار بن درگاہ میں داخل ہوئی۔ پہلے اٹھل اٹھا کے زیارت پڑھی، پھر مزید مبارک آٹھوں  
 سے شس کی۔ دو ہزار روپیہ کی نذر چڑھائی۔ اسی شان و شوکت سے واپس آئے۔ ذرا سے درگاہ  
 تک جانے میں لاکھوں روپیہ تقسیم ہو گیا۔ اسی طرح رات دن چلے رہتے تھے۔ ہر گاہ اس آرزو میں  
 رہتے تھے کہ ایک مرتبہ بادشاہ ہمارا سلام لے لیں، پھر دولت کی کچھ پروا نہیں ہے۔ جس کا سلام  
 قبول ہو گیا، مال مال کر دیا۔ غلٹ دیا تو زبردستی دیا۔ خطاب دیا تو تنخواہ بھی کر دی۔ اس آواز  
 و ہش کا یہ فیض تھا کہ گھنٹوں میں تین برس رہا تھا۔ الماس علی خاں خواجہ سراؤ اب ناظر کے چیلے  
 فتح علی خاں وحید بخش کی فقط سیر شب، میں لاکھ روپے کا تار بقیش کترا جاتا تھا، بمیر کی طرح اڑا  
 جاتا تھا، جس کی سرور چاندی صبح کو ہترانی چُن لے جاتی تھی۔

(الناظر، اگست ۱۹۳۴ء)

## قَالَ اللَّهُ وَاَنَا إِلِيَّ رَاجِعُونَ

ان نظر کا حصہ منہا میں چھپ چکا تھا جب یہ الم آگئیں خبر آئی کہ مسلمانان ہندوستان کے سب بڑے رہنما حضرت نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے ۲۶ جنوری کو اپنے وطن اروہہ میں انتقال فرمایا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

یوں تو حضور مدوح کی صحت کئی سال سے جواب دے چکی تھی جس کی بنا پر میدان عمل سے کنارہ کشی اختیار فرماتے اور اروہہ کی مستقل اقامت اور گوشہ گزینی نے گویا سپاہ قومی کو اب سے پشتر ہی بے سر کر دیا تھا اور ہمارے شیرازہ قومی میں جو چراگدگی آج نمایاں ہے، انکی بڑی وجہ یہی تھی۔ لیکن جب تک سانس باقی تھی اس بھی لگی ہوئی تھی۔ اب کہ داعی اجل نے اس تبرک سے بھی قوم کو محروم کر دیا ہے، دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ مرحوم کی روح پاک کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور ہم پر گشتہ بختان ہند کی رہنمائی کے لیے کسی ایسے بزرگ قوم کو مامور فرمائیں جو نواب وقار الملک مرحوم کے نعم البدل ثابت ہوں۔ آمین یا رب العالمین۔۔۔

نواب مشتاق حسین کی زندگی پرمٹل تعبیر کا تو یہ وقت نہیں ہے لیکن مرحوم کی ان نمایاں اور ممتاز خصوصیات کا اعادہ بے موقع نہ ہوگا جو ان کو سارا قوم بنانے کا ذریعہ ہوئی تھیں اور وہ

مسب ذیل تھیں

(۱) وہ دین و دنیا میں متقی اور عبادت گزار تھے

(۲) وہ خدا اور ہر فرد خدا کا خوف کرتے تھے



- (۲) وہ اسلام اور مسلمانوں کے غلصہ خا دم اور ہی خواہ تھے۔
- (۳) وہ دل کے سخی اور صمیم معنوں میں اختیار کے عادی تھے
- (۴) وہ ارادہ کے مستقل اور ذاتی اغراض سے بے لوث تھے
- (۵) وہ باتیں کم اور کام زیادہ کرتے تھے۔
- (۶) وہ منکر، مواضع اور پردہ دار تھے
- (۷) وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور اسرار سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے
- (۸) وہ صلح پسند تھے مگر راستبازی سے کبھی منہ نہیں موڑتے تھے
- (۹) وہ حق گو تھے لیکن دل آزاری سے احتراز کرتے تھے
- (۱۰) وہ جناکش اور محنتی تھے۔
- (۱۱) وہ جو کہتے اُس پر عمل بھی کرتے تھے۔
- (۱۲) -نواب صاحب کثیر الاولاد نہیں تھے مگر ان کے پہاؤ گاہوں کی تعداد میں سب سے زیادہ ہوگا۔
- کہ ریاست حیدر آباد سے جو گراں قدر زمینیں ان کو ملتا تھا اُس کا بیشتر حصہ دوسروں کے لئے مستقل وقف تھا اور جن لوگوں کی بھی ایک آمدنی تھی ظاہر ہے کہ وقفہ اس سلسلے کے منقطع ہونے سے انہیں کس قدر پریشانی کا سامنا ہوگا۔ مرحوم کے جانشین اور اعزاء کے ساتھ ساتھ ان بیچاروں کی مصیبت کا خیال اور بھی اذیت دہ ہے
- ارمہ الرحیم انہیں توفیق مبرور تکمل عطا کریں اور دیگر دستگانِ مرحوم کی کارستانی
- فرائیں۔ آمین۔

## بھارت پر پوت

ماورہند کے بانیہ صد از فرزند، ہندوستانیوں کے شخص ترین دوست، خود آزاد می کے  
نایت درجہ بیباک حابی اور ذورِ حاضرہ کے سب سے بڑے رہنما، موہن داس کرم چند گاندھی کے  
نام نامی سے اس عظیم الشان جزیرہ نما کا بچہ بچہ واقف ہے۔ یہ کتاب انہیں کے مختصر سوانحی حالات  
کا مرقع ہے۔ اس کے مطالعہ سے اردو خواں مصائب کو ان کے ابتدائی حالات، افلاق و عادات،  
اور عقائد و خیالات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا، اور ساتھ ہی ساتھ جنوبی افریقہ میں ان کے شہر و منزلت  
”غاموش مقابلہ“ کی کیفیت بھی معلوم ہو جائیگی۔ جس کے بعد ان کی تحریک ستیاگرا یا عدم تعاون و  
”انسانیت قانون وغیرہ کی اصل حقیقت کو سمجھنا اور ان کے مقصد و حیات کو اچھی طرح سمجھنا ممکن  
ہو جائے گا۔

قالباً یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ گوتم بُدھا، رام چندر اور سری کرشن کے بعد اس وقت تک سرزمین  
ہند سے کوئی ایسا فرزند نہیں پیدا ہوا جو اہل ہند کی اس درجہ عظمت و عقیدت کا مرکز بننا چاہیے  
کہ اس وقت جہاں گاندھی ہیں، اور اس بیان میں درجہ بھی مبالغہ نہیں کہ خاک پاک ہندوستان کے  
کسی باشندہ کو یہ منزلت پہلے نصیب نہیں ہوئی کہ وہ دنیا کے اعظم رجال کے مقابلہ میں سے  
بڑا شخص ”کہا جائے۔ اسی طرح یہ امر بھی بالکل مسلم ہے کہ ہندوستان کے موجودہ دور و ارتقا میں  
کسی بڑے سے بڑے وائی ٹاک، دولت مند سے دولت مند تاجر یا فاضل سے فاضل فکیر، عالم، شاعر یا

ماہر فنون لطیفہ اور مشہور سے مشہور دہرا اخبار نویس، مصنف یا خطیب کو ہندوستانیوں کے نام  
طبقات کے اندر یہ ہر لغزیزی اور رسوخ حاصل نہ ہوا جو اس وقت گاندھی جی کا مقصود تیار ہے  
گزشتہ ایک سال کے اندر انگلستان کا کوئی ممتاز اخبار بار سالہ ایسا نہیں جس میں مسٹر گاندھی  
اور انکی ترکیب ترک ہوا اہل پر ایک سے زائد معنائیں نہ سکے ہوں۔ خود ہندوستان میں تو انکا ذکر  
دائیں بائیں سے لیکر پانچ برس کے بچہ کی زبان تک ہر ہتھکے معنی کہ بہن کا مشہور انجلو ڈین اخبار  
ایڈوکیٹ آف انڈیا گیسٹ کر لکھا ہے کہ خدا را لوگ اب اس ذکر کو چھوڑ دیں۔ اہل ہند کی زندگی کا

کالونی، شبہ اور اس ایک کی کثیر النوع مختلف المذہب آدمی کا کوئی طبقہ ایسا نہیں بتایا جاسکتا  
جو ہمانہ گاندھی کی شخصیت سے متاثر نہ ہوا ہو۔ دن ڈین نیشنل کانگریس جو ہندوستان کی سب سے بڑی  
قومی مجلس تھی، ستمبر ۱۹۲۷ء میں انکی تابع فران بن علی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ بھی جو عرصہ سے کانگریس  
کی رفیق کار بنی ہوئی تھی انکے قدموں پر تیار ہونے کو تیار ہو گئی۔ سنٹرل خلافت کمیٹی بھی تو گویا  
انکی پروردہ آغوش ہے۔ غلیکندہ، بنارس، دہلی بند اور لکھنؤ ہر جگہ انکی بے 'منائی جاتی ہے۔ ہندو  
سجائے بہت کچھ چوتھی کرتے کے بعد پانچ سال رواں میں گاندھی کیپ ہی کو اپنا جلسہ پناہ قرار  
دیا۔ سیکھ لیگ۔ "آہنسا" کے حق میں دوڑ دینے ہی سیکڑوں اکالیوں کو منکائے کے گرد و دارہ  
میں دار فناء تک پہنچا دیا۔ بھیئ کے اریسوں نے تلک سواراج فنڈ کے بے گاندھی کی جھوٹی میں  
لاکھوں روپیہ بھر دیا۔ برصاوا نے انگ بگڑے بیٹھے میں بات بات پر بائیکاٹ اور ہڑتال کرتے ہیں۔  
غرمنا ملکیت ہند کے اس سرے سے اس سرے تک نظر دوڑائیے، تو خدا کے بعد میں گاندھی ہی  
گاندھی دکھائی دیں گے۔ ایسے شخص کے حالات زندگی کا مطالعہ حسب قدر ضروری ہے انکے متعلق  
اب کچھ کہنا فضول ہوگا۔ ذیل میں اجمالاً کچھ حالات بھارت ہوت سے افذکر کے درج کیے  
جاتے ہیں:-

۱۔ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ریاست پور بندر کا ٹھیاوار (میں ہندوستان کے اس اور ہوت

نے جنم لیا۔ جہاں انکے باپ اور دادا دونوں دیوان کے عزیز عہدہ پر مامور رہے تھے۔ ابتدائی  
تعلیم میں شروع ہوئی۔ پھر اپنے والد ماجد کے ساتھ راجکوٹ میں جا کر رہے اور وہیں کا ٹھیاوار



ہائی اسکول سے، اس سال کی عمر میں میٹرک ویشن کی ڈگری حاصل کی۔ جسکے بعد ایک عزیز کے مشورہ سے ولایت جا کر بیرٹری کی سندھی۔

گاندھی کے والدین دشنودھرم کے پیر اور نیکی، راستبازی و راسخ الہ تعالیٰ میں متاثر تھے۔ چنانچہ ہونا، فرزند میں بھی، اعلیٰ صفات شروع ہی سے نمودار تھیں۔ گو مغربی تعلیم کے ذہنی اثرات برابر اپنا کام کرتے اور قدم قدم پر اسکے دامن سلامت روی کو گھسیٹتے رہے لیکن بالآخر گاندھی کی فطرت پاکیزہ اور ناقابل فتح جرأت اخلاقی کو اسکے مقابلہ میں چوری کامیابی ہوئی چنانچہ تیام رندن ہی کے زمانہ میں گاندھی نے انگریزی سوسائٹی کی فریب کاریوں اور مغربی تہذیب کی ظلم سازوں کا جال توڑ کر بھگوت گیتا کے ساریہ عاطفت میں پناہ لی جسکی مدد ملی تعلیمات نے انکے تولدے باطنی کو تجلیات سے آراستہ اور اخلاق ظاہر کو پاکیزہ گویں سے پیراستہ کر دیا۔

انگلستان سے واپسی کے بعد ڈیڑھ سال تک گاندھی بھی بی بیٹیکورٹ میں دکالت کرتے رہے۔ تاکہ پرتوریہ (جنوبی افریقہ) کے ایک ہندوستانی سوداگر کے مقدمہ میں دیکس ہو کر انکو افریقہ جانا پڑا۔ افریقہ میں گویے آبادکاروں کا سلوک ہندوستانیوں کے ساتھ حد درجہ حقارت آمیز و ناقابل برداشت تھا جبکہ تلخ تجربہ گاندھی کو اپنے چند روزہ قیام میں برابر ہوتا رہا۔ اور بین اس زمانہ میں جبکہ وہ مقدمہ فراغت باکر وطن کی طرف مراجعت کر نوالے تھے ایک مقامی اخبار میں انھوں نے پڑا کہ وہاں کی پارلیمنٹ میں ایک سودا قانون اس غرض سے پیش کیا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو ووٹ دینے کا جو حق حاصل ہے وہ زائل ہو جائے۔ جسکے بعد اسی قسم کے دیگر قوانین پیش ہونگے۔ گاندھی نے وہاں کے سربراہان ہندوستانیوں کو خطرات سے آگاہ کر کے باہم متحد ہو کر پوری مستعدی کے ساتھ اُنکا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اور بالآخر اُنکے اصرار کی بنا پر اپنا عزم سفر ترک کیا۔ تیام رندن کی لڑائی کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی شخصی ترقیات کے خواب اور ذاتی راحتوں کے سامان کو الٹا اٹھارے خیر باد کہہ کر مثال کی سوپریم کورٹ کے دکن میں انجنا نام دست کرالیا۔ اور اپنے ابناء وطن کو گویے آبادکاروں کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے جماعت کی تنظیم اور ہر قسم کی رہنمائی و آئینی جدوجہد میں ہمہ تن شگاف ہو گئے۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں دو اپنے اہل و عیال کو لٹے کی غرض سے ہندوستان واپس آئے اور کچھ دور  
 ٹھہر کر اپنی بیوی بچوں سمیت واپس گئے۔ مگر اس منقر قیام کے زمانہ میں جو یہاں کے مختلف جیسوں  
 میں انھوں نے ان تمام حق تلفیوں، حقارتوں اور تشددوں کی پُروردہ داستان بیان کی جنکے جوئی  
 افریقہ کے پرنسپ ہندوستانی ایک مدت دراز سے شکا رہو رہے تھے تو ریورٹیلارمنٹ کی نیت و  
 مقصدی کے بہت اہلی اطلاع افریقہ کے گوشے آبادکاروں کو گاندھی کی واپسی سے پہلے ہی پہنچ  
 رہی بسے اُنکے دلوں میں گاندھی کے فائدے بے انتہا غلط و غصب پیدا کر دیا۔ چنانچہ جب گاندھی  
 اپنے اہل و عیال سمیت بندرگاہ میں داخل ہوئے تو ایک پُر شور ہجوم کی وجہ سے انھیں سخت دہلی  
 کا سامنا کرنا پڑا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں انگریزوں اور بوڑوں کی لڑائی کے موقع پر گاندھی نے یہ سوچ کر کہ اس  
 نازک موقع پر اگر ہندوستانی حکومت کی امداد کریں گے تو اُنکے حقوق کا آئندہ پورا الحاق کیا جائیگا  
 افریقہ کے ہندوستانیوں کو دالینئر (رہنما کار) بننے کی ترغیب دلائی اور اگرچہ وہ دفعہ اُن کی  
 درخواست خدمت و اعانت مسترد کی گئی تاہم تیسری دفعہ جبکہ انگریزی حکومت کو جنگ میں کافی  
 نقصان ہوا ہندی باشندوں کی خدمات قبول کرنی گئیں۔ (جو لوگ ہاتھ گاندھی کی اس روش  
 پر نہ چینی کرتے رہے ہیں کہ انھوں نے گزشتہ محارہ یورپ کے دوران میں اسٹرلائڈ جارج ویز  
 انگلستان اور وائسرائے ہند کی اپیل اور جگن کا نفرس منعقد دہلی کی قراردادوں کے بموجب  
 دالینئروں کی بھرتی کیلئے اسکاٹل کوشش کی، انہیں عیاں ہو جانا چاہیے کہ اس خدمت اعانت  
 کی اہلی نیت کیا تھی)

خاتمہ جنگ پر گاندھی نے یہ خیال کیا کہ حکومت برطانیہ کی نفع سے ہندوستانیوں کی  
 مشکلات کا بھی خاتمہ کر دیا اور وہ ہندوستان واپس چلے آئے۔ لیکن ٹرانسوال کی جدید حکومت  
 نے ہندوستانیوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کے بجائے ایک نیا ایشیائی محکمہ قائم کیا جسکے ذریعہ  
 نہایت فحاشات و عیاری کے ساتھ ہندوستانیوں کو افریقہ سے خارج کر دینے کی تدبیر سوچی گئی گاندھی  
 پھر افریقہ واپس پہنچے جہاں وکالت شروع کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے سنہ ۱۹۴۷ء میں انڈین  
 اوپینن نامی ایک اخبار نکالا جو انگریزی، تامل، گجراتی اور ہندوستانی چار زبانوں میں شائع

ہوتا تھا۔ دوسرے سال انھوں نے انگلش کی پھاڑی پڑھنے آشرم کی بنیاد ڈالی جہاں وہ  
ریکن کے اعلیٰ تھیل کی مشابہت میں تمام لذات و مرغوبات کو ترک کر کے نہایت سادہ و سادہ  
کرنے اور ہر قسم کی ہوس (ریاضت) میں مصروف رہتے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں ٹرانسوال کی حکومت نے یہ ذلت آفریں قانون بنانا چاہا کہ جن ایشیائی  
مزدوران کی سیارہ بارہ ختم ہو چکی ہو وہ انگوٹھے کے نشان دیکر از سر نو اپنے نام درج چھڑکریں۔  
اور گائندھی اور اُن کے رفقاء کی تمام کوششوں کے باوجود قانونی کونسل نے اُسے منظور کر لیا۔  
البتہ عورتیں اسکے دھبہ دسے بچ گئیں۔ چنانچہ گائندھی کی رہنمائی میں ہندوستانیوں نے اس قانون  
کو مدافعت کیلئے "خاموش مقابلہ" شروع کیا۔ اور کچھ ہی روز کے اندر افریقہ کے جیلوں میں

معلوم ہندوستانیوں سے پڑ ہو گئے۔ خود گائندھی کو بھی دو سال کی سزا دینی۔ آخر کار حکومت نے  
اپنی اخلاقی شکست تسلیم کی اور سمجھوتہ کر لیا۔ اس سمجھوتہ کے دوسے ہندوستانیوں نے از خود اپنے  
نام درج چھڑ کر لے مگر حکومت نے اپنے عہد و پیمان کے مطابق قانون کو منسوخ نہ کیا۔ جسکی بنا پر  
دوبارہ اسی روحانی جنگ کی تیج ڈالی گئی۔ ایسے "خاموش مقابلہ" نے مہبت لہول کھیلجا۔ ہزاروں  
ہندوستانی پھر جیلوں میں جا بسے اور سخت سے سخت مطالب نہایت مردانہ ہمت و جوش کے ساتھ  
برداشت کرتے رہے۔ گائندھی کو بھی دوبارہ جیلوں میں جانا پڑا، جہاں سے مجلس پانے کے بعد اُنھوں نے  
دو دو تیار کیے۔ ایک خود اُنکی سرکردگی میں انگلستان گیا اور دوسرا سٹریٹوٹک کی نمایندگی میں  
ہندوستان آیا۔ انگلستان کے وفد کا تو اس سے زیادہ کچھ نتیجہ نہیں نکلا کہ اگر اکین حکومت برطانیہ نے  
ٹرانسوال کے ذمہ دار وزراء کو جو اُس زمانہ میں وہاں موجود تھے مناسب تصفیہ پر آمادہ کرنے کی  
تاکید کیے بغیر، لیکن ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ گئی اور  
اہل ہند کو پہلی دفعہ اُن ذلت بار حالات کا صحیح احساس پیدا ہوا۔ جن میں اُنکے جنوبی افریقہ کے  
ہموطن عرصہ سے مبتلا تھے۔ اُدھر خود افریقہ میں یہ صورت پیش آئی کہ ایک طرف تو گیسے آباد کاروں  
کی ایک کمیٹی سرولیم آسکن کے تحت میں ہندوستانیوں کی نہایت داد دیکھنے والی ہو گئی اور دوسری  
طرف عمال حکومت نے اہل وطن کو پکڑ پکڑ کر جلا وطن کرنا شروع کیا۔ ابتداً اُنھیں مثال کے



دوسے خارج کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی کیونکہ انہیں باہر چھوڑ کر آئیہوا  
 واپس نہ آنے پاتے تھے کہ یہ ان سے بھی پیشتر آموجہ دھوئے۔ آخر انہوں نے ایک جماعت کو جہاز  
 پر بھر کر ہندوستان روانہ کر دیا۔ مگر یہاں سے یہ لوگ اپنے ہوملوں کی دعاؤں کو ساتھ لیے دوسے  
 پھر لوٹ گئے۔ ان جلا وطنوں کے خلاف حکومت ہند نے جب وزیر برطانیہ کو توجہ دلائی تو بالآخر  
 اسکا مسئلہ رک گیا۔

جب ۱۹۱۷ء میں جنوبی افریقہ کی مختلف ریاستوں نے باہمی اتحاد کر کے "یونین گورنمنٹ"  
 قائم کی، تو حکومت برطانیہ نے پھر تحریک کی کہ جو قانون ان سب مسائب کی بنیاد ہے اُسے منسوخ  
 کر دیا جائے۔ چنانچہ بعد دو دفعہ بسیار اس بات پر ہندوستانیوں سے سمجھوتا ہوا کہ ۱۹۱۷ء میں  
 ایک حلاوت بخش قانون جاری کر دیا جائیگا۔ اسی سال مارچ میں مسٹر گوگلے آئینہانی کی تحریک

ایبیرل لیبلٹیو کونسل نے اجارہ دار مزدوران کے سلسلہ کو منسوخ کرنے کی تجویز منظور کی مگر حکومت  
 افریقہ نے معاہدہ کے مطابق قانون میں جو ترمیم کی ہندوستانیوں کی اُس سے تشفی نہ ہوئی۔ لہذا  
 گاندھی کی دعوت پر مسٹر گوگلے جنوبی افریقہ گئے اور بحث و مباحثہ کے بعد یونین گورنمنٹ کے ذریعے  
 خاطر خواہ بندوبست اور ملی انخصوص تین پونڈ والے ٹیکس کو منسوخ کرنے کا وعدہ کیا لیکن

وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو رہا ہے

۱۹۱۷ء میں جب نیا قانون "یونین گورنمنٹ" کے، بردپیش ہوا تو ہندوستانیوں نے جانا کہ ان کے  
 مرض کی دوا یہ بھی نہیں ہے۔ اس زمانہ میں ایک تازہ اور غیر معمولی حمیہ کی پیدا ہو گئی کہ ستھو ریاستوں  
 کی عدالت نے ایک مقدمہ میں یہ فیصلہ کیا کہ قانون ریاست کے مطابق وہ جلا نواح منسوخ و کالعدم  
 ہیں جو ہندوستان میں ہوتے ہوں۔ پس اب دوبارہ جو خاموش مقابلہ شروع ہوا تو اب کی ٹوٹیں بھی  
 مردوں کے دوش بدوش اس جنگ میں شریک ہو گئیں۔ جسکی بنا پر یہ روحانی محاربہ تاریخ میں ہمیشہ  
 یادگار رہیگا۔

اس محاربہ کی داستان اتنی پُر اثر اور سبق آموز ہے کہ بغیر تمام و کمال پڑھے ہوئے محسن اجمالی  
 تذکرہ سے ناظرین کی تشفی نہ ہوگی، اس لیے بخوبی حوالہ سے نظر نہ اندک کرنا پڑتی ہے اور ناظرین سے

بجائی ہے کہ بھارت بدھت کا ایک نسخہ منکا کر اپنے شتمل شدہ شوق کو پورا کریں۔ بہر حال اس جذبہ میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو نہایت شاندار فتح حاصل ہوئی۔ جسکے بعد گاندھی کو افریقہ میں مزید قیام کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی اور وہ ہندوستان واپس چلے آئے۔ یہاں آکر جو کارہائے نمایاں انہوں نے انجام دیے ہیں انکی مفصل روداد ابھی حوالہ قلم نہیں کیا جاسکتی۔ گو بھارت بدھت میں اشارۃً چمپارن دکنیر کے واقعات اور سلسلہ عمر کی ستیا کرہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہ نہایت کافی صراحت و تفصیل کے ساتھ اسوقت خوب بیان ہو سکیں گے جبکہ عدم تعاون کی غنیمت نشان روحانی جنگ کا فتح و نصرت پر خاتمہ ہوگا۔

ڈاکٹر ٹالسٹائے نے جو دوس کے ایک مشہور فلسفی اور امور تعلیم تھے، اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے ضرور دس کے پاس ایک پیام بھیجا تھا جس میں انوالی صیب لڑائیوں کا خاکہ ایک عیب انداز میں لکھ کر لکھا تھا۔ اگر اُنکے اُس پیام کو ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی پیشین گوئی کہا جائے تو عجیب نہ ہوگا۔ یہ کہ جتنی باتیں اُنہوں نے مجازاً بیان کی تھیں تقریباً وہ سب گزشتہ سالوں میں جزوی اختفاقات کے ساتھ حقیقت بنکر رہنا ہوتی رہی ہیں۔ اس پیام میں اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جنگ جہاں کے ہتھیار پر جب دنیا کی تعلیم جدید ہوگی تو یورپ کے موجودہ معتدات ناپا ہو جائیں گے اور اُنکے سب سے اہمیت باری قتالی کا عقیدہ از سر نو اور بالکل نئی شان کے ساتھ اشاعت پذیر ہوگا۔ اور صلح و امن کی یہ رجن تازہ کسی تاجدار سپہ سالار یا مدبر کے ذریعہ سے نہیں لکھا۔ ایک مسیحا نفس اہل قلم کے واسطے سے پہنچی جائیگی۔ جو اسوقت (تریل پیام کے وقت) بھی دنیا میں موجود ہے گو عام طور پر لوگوں کی نگاہوں سے چھپا ہوا ہے۔

عدم تعاون کی لڑائی کو جو لوگ محض ایک قسم کا طریق حقوق طلبی جانتے ہوں اُنسے یہاں بحث نہیں البتہ جو یہ یقین کرتے ہیں کہ اس محاربہ سے دنیا کے تمدن کا کوئی گہرا تعلق ہے وہ اس نتیجہ پر غماز آسانی پہنچ جائیں گے کہ اگر کاؤنٹ ٹالسٹائے کی پیشین گوئی کا آخری جزو بھی امر واقعہ کی صورت اختیار کرنا والا ہے تو یقیناً عدم تعاون کا اپنی دوہرہ ہی دراصل وہ شخص ہو سکتا ہے جو مغربی تہذیب اور معتدات اہل یورپ دونوں کو ایک ہی معرکہ میں فنا کر کے دنیا کو اہل صلح اور اہل کیز و مذہبی

تخیل سے بہرہ اندوز ہونے کی دعوت دیگا۔

بھارت سبوت کی تحریر لکھش 'ترنیب موزوں اور عنوانات پسندیدہ' میں بکثرت واضح ہدف  
عدہ اور لمباعت صاف ہے۔ شروع میں ایک ملکی تصویر لگائی گئی ہے جس میں ہاتھ لگاؤ نہ دیا گیا اور  
انکی اہلیہ محترمہ استادہ نظر آتی ہیں۔ مگر سرورق اور پٹت مولیٰ اہل ہندو صاحب کی ایک جمعہ کی تمہید  
کو سید کے حروف سے چھاپکار ناشرین نے خواہ مخواہ کتاب کے حسن ظاہری کو برباد کر دیا۔

آخر میں ایک بہت ہی قابل انوس و طامت واقعہ کا ذکر کرتا ضروری معلوم ہوتا ہے جسکی  
وجہ سے کتاب اگرچہ نہیں گرا ناشرین و مرتب کتاب دونوں حد درجہ سزاوار سرزنش قرار پاتے  
ہیں۔ مدراس کی گنیش کمپنی نے جو قومی دیبا سی ادبیات کی اشاعت میں منازعہ ہے شائع میں  
ہاتھ لگاؤ نہ دیا کی تقریریں اور تحریروں کا ایک مجموعہ انگریزی میں شائع کیا تھا جسکا پورا نام

Specimen of the Hindoo Literature is

کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ شائع میں دوسرا اور تیسرا بار میں تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔  
آخری طبع کا ایک نسخہ سامنے رکھا ہے اور اس کے مطالعہ نے یہ حقیقت منکشف کر دی کہ بھارت  
سبوت نامہ اسی مجموعہ کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ ہے جس میں ہاتھ لگاؤ نہ دیا کی سوانحی لکھی گئی ہے۔ پٹت  
مولیٰ اہل ہندو صاحب نے اپنے تمہیدی الفاظ میں تحریر فرمایا ہے کہ

”مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ ایک مسلمان نوجوان نے ایک ہندو بزرگ

کی سوانحی مرتب کی۔“

اس وجہ سے اور نیز اس بات سے کہ ایک طرف بھارت سبوت کے سرورق پر سب سے پہلی سر  
میں لکھا ہوا ہے ”مطلوبہ حقوق محفوظ“ اور دوسری طرف ساری کتاب میں کہیں اشارہ نہیں اس امر کا  
اعتراض نہیں پایا جاتا کہ گنیش کمپنی کی شائع کردہ انگریزی کتاب کے ایک جز کا ترجمہ ہے۔ اس  
طور پتہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید امتیاز علی خان الہیڑی سالہ لکھنؤ (فلسفہ جناب مولوی سناز علی صاحب)  
لکھنؤ پنجر اخبار تہذیب النساء لاہور، جس کے سر پر اس کتاب کی ترنیب کا سہرا لٹھکایا ہے پاک



کو پار کرنا چاہتے ہیں کہ یہ سودا خمری واقعہ انہیں کی مرتب کر دے۔ بیشک اس انگریزی کتاب میں بے سرفیاں نہیں ہیں اور عبارت میں بھی کہیں کہیں اضافہ، اختصار اور تغیر کے آثار پائے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کتاب چونکہ دوسرے ایڈیشن کے بعد ترجمہ کی گئی ہے، اس لیے جدید الطبع ایڈیشن کے مقابلہ میں نامکمل بھی ہے۔ لیکن کیا ان قبیلہٴ نفیث کی وجہ سے اصل مصنف کی کوششوں پر پانی پھیرا اور اسکے حقوق کا تلف ہونا ممکن ہے؟ دارالاشاعت پنجاب لاہور کو جسکی طرف سے یہ کتاب غالباً شایع ہوئی ہے شاید یہ محسوس نہیں ہوا کہ جس محترم بزرگ کی یہ سودا خمری ہے اسکی تمام خصوصیات میں ممتاز ترین صفت حق و راستی کی پابندی ہے۔ کم سے کم ایسے شخص کی سودا خمری شایع کرنا اس کے افکار و اس قسم کی سفاہتوں سے پاک ہونا چاہیے تھے۔ ایک مسلمان شخص کے لیے یہ حرکت بغایت نازیبا اور قطعاً ناقابل معافی ہے۔ کیونکہ ممانا گانہ بھی کا یہ احسان عظیم مسلمان کہیں فروش نہیں کر سکتے کہ انھوں نے مسئلہٴ خلافت کو ہمارے حسب راجح ادھے کرانے کی مرض سے اپنی اور ساری ہندو قوم کی اجتماعی قوتوں کو سینہ سپر کر دیا ہے۔

طاہر عبداللہ ادلی الالبصار

(الناظر، نومبر ۱۹۶۲ء) ابو سلیمان

## لی اٹال

ناز ہے قدرتِ صانع کو تری ہستی پر  
 جس پہ قربان ہوں سوزِ لیتِ عدم تیرا ہے  
 تیری تعمیر میں سراپا غیرت پہناں  
 درسِ اثیار کچھ اس طرح پڑھایا تو نے  
 زندگی تیری صداقت کا اک افسانہ ہے  
 ہر روش و ہر کی پیغامِ اہلِ دیتی ہے  
 رشاک کرتا ہے ترے سوز پہ اعجازِ شرر  
 جس پہ چلتا ہے جہاں نقشِ قدم تیرا ہے  
 تیری نصرت میں اک احساسِ حمیت پہناں  
 ایک عالم کو روحِ حق پہ لگایا تو نے  
 جو نہ سمجھے تری دعوت کو وہ دیوانہ ہے  
 پر تری زیست : تعلیمِ اہلِ دیتی ہے

زندگی نذرِ رولت بیفتا کر دے

ذرہ خاک کو ہدوشِ ثریا کر دے

آنکھ نے چوٹ ہے گوشتِ غم کی کھائی  
 اور حق دیکھتا ہوں خاک میں تیری مستور  
 فاک میں ہمت پر وازا بھی باقی ہے  
 دیدہ دل نہیں شرمندہ تابستانی  
 جسکے ہر لمحہ میں ہو جائے فنا شدہ طور  
 اڑکے ہر بار سوے عرشِ بیں جاتی ہے

ذریعے جب شدتِ انوار سے تھرانے ہیں

دامنِ نبتِ پیر سے لپٹ جاتے ہیں

## حسین شریف مکہ

دو سال ہوئے جب کہ مسئلہ (ذواللہ شریف) حاضر ہونے کا شرف میرے نصیب میں آیا۔  
تو شریف حسین سابق ملک انجائز کے حالات سے آگاہ ہونے اور اُن سے استدلالا قاتیں کر کے اُنکی  
ذہنیت کا کسی قدر اذہ کرنے کا مجھے موقع ملا۔

لکھنؤ سے روانگی کے وقت تک اُن خبروں کی بنا پر جو کہ خیارات کے ذریعہ سے سالہائے اہل  
میں وصول ہوئی تھیں شریف حسین کی طرف سے میرے دل میں ناگواری اور ناراضی کے جو خیالات  
جاگزیں تھے، قطعاً ارادہ نہ تھا کہ میں شریف صاحب سے ملوں گا۔ اسی لیے جب جناب مولانا  
عبد الباقی صاحب فرنگی محلی نے جنگے تعلقات شریف مذکور سے عالم آشکارا ہیں، ایک تعدادی  
تحریر اپنے کاغذ ارادہ ظاہر فرمایا تو میں نے اُسے قبول نہ کیا، اور اُن سے صاف عرض کر دیا  
کہ میں شریف سے ملنا نہیں چاہتا۔

کہ مسئلہ حاضر ہونے کے بعد مجھے دو قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ ایک وہ لوگ تھے جو شریف  
حسین سے دلی نفرت رکھتے تھے اور شریف صاحب کی جگہ کا اردو ایوں کو بعینہ اسی نقطہ نظر  
سے دیکھتے تھے جس سے ہم لوگ ہندوستان میں دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ دوسرے وہ لوگ  
تھے جو شریف صاحب کو اعلیٰ درجہ کا بد خیال کرتے تھے۔ خصوصاً حجام کے معاملات میں شریف صاحب  
طرز عمل ایسا بتایا گیا کہ مجھ کو اپنے بھتیجیوں کی تمام باتوں کے باوجود یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جنگ  
کے دوران میں شریف صاحب نے دھوکا کھا کر، یا ذاتی اغراض سے متاثر ہو کر جو کچھ کارروائی کی،  
اُس کے بعد شاید اُنکی آنکھیں کھل گئیں اور اب وہ مجاز کو غیر اسلامی تسلط ہر طرح آزار دہانہ کر  
ایک پادار و مستحکم عربی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔



بیس سال سے زیادہ زمانہ گزرا کہ جب علامہ جلال الدین سیوطی کی مشہور تصنیف تاریخ الخلفاء کا انگریزی ترجمہ میرے مطالعہ میں تھا۔ اُس میں ایک مقام پر ایک حدیث قدسی درج تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ ملت محمدیہ کی بربادی کا سبب ترکی قوم ہوگی۔ میں تاریخ یا حدیث کا طالب علم تھا جو اس روایت کی جانچ کرتا۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ میرے دل میں اُسی وقت سے یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ جمیع ممالک عربیہ کو ایک عربی تاجدار کے اقتدار میں رہنا چاہیے۔ اور یہ امر بطور ایک عقیدہ کے میرے ذہن میں راسخ ہو گیا تھا کہ صرف ایک مستحکم عربی سلطنت ہی ملت محمدیہ کے بقا و تحفظ کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ گزشتہ جنگ نے جب عرب کے تمام اجزاء کو ترکی حکومت سے جدا کر دیا تو اگرچہ ترکی حکومت کی بربادی کا مجھے حدودِ غم تھا، مگر ساتھ ہی میرے دل میں وقتاً فوقتاً یہ خیال ضرور پیدا ہوتا تھا کہ عربی حکومت کے قیام کا جو خواب میں عرصہ سے دیکھ رہا ہوں، اُسکی قبیلہ اب ردنا، دنیا الی ہے۔ اسلام کی عظمت کی طرف سے میرے دل میں ایک لمحہ کے لئے کبھی ایسی پیدائش نہیں ہوئی چنانچہ انہیں اوراق میں سلسلہ کے نہایت تیرہ شمار زمانہ میں میں اپنے اس عقیدہ کو نہایت دہانت و صراحت سے ظاہر کرتا رہا ہوں۔

ان خیالات کی بنا پر شریف حسین کے متعلق جو حالات میں نے سُننے اُنکی وجہ سے سچے سچے کہ میری نفرت و ناراضگی میں اضافہ ہوتا میرے دل میں شریف صاحب کی ذات سے اچھی امیدیں پیدا ہونے لگیں۔ اور جب میں مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرت ہو کر واپس آیا اور سب مرگت پائی تو میں نے ارادہ کیا کہ میں شریف صاحب سے ملوں۔ حجاج و زائرین کی تفریبات جو میرے مشاہدہ میں آئی تھیں بیان کروں اور اُنکو رفع کرتے پرستارہ کریں اور ساتھ ہی اُنکے دلی ارادوں کا حتی المقدور پتہ لگاؤں۔ اور اگر واقعہ وہاں تک عرب میں ایک مستحکم و پادشاہ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو میں ہندوستان واپس جا کر اہل ہند کو یہ خوشخبری سناؤں کہ جزیرۃ العرب کے متعلق اُن کا جو مسلح نظریہ اُسکی تکمیل کا سامان شریف حسین کو رہے ہیں جسکے بعد کچھ یقین و اثبات تھا کہ کم سے کم ہماری خلافت کمیٹی کے تعلقات حکومتِ حجاز کے ساتھ نہایت درست ہو جائیں گے۔

شریف حسین کے جو حالات مجھے معلوم ہوئے اُنکا اجمالی تذکرہ بیان مناسب ہوگا۔ شریف حسین نہایت فطین و اپنے عقیدوں شباب ہی میں جب سے باتہ باتوں نکالے تو اُس نے انکے شریف کرنے کو اسکا بچا ہوتے تھے ہر اندیشہ کے سوا

اسکی دل سے کوئی تشنہ اٹھ کر حسین کو قسطنطنیہ بھیج دیا جہاں وہ بھی قدر و منزلت سے بطور شاہی مہمان کے رہا۔ اسکی نظانت کا اذازہ صرت اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ جس زمانہ میں سلطان عبدالحمید خاں اور نوجوان ترکوں کے درمیان سخت کشاکش ہو رہی تھی تو یہ شخص جہاں ایک طرف سلطان محمد کا منظور نظر اور مستعدالیہ تھا وہیں انجمن اتحاد و ترقی کا ایک سرگرم اور بااثر رکن بھی تھا۔ پھر جب قسطنطنیہ سے وہ شریف کو بنا کر بھیجا جانے لگا تو سلطان عبدالحمید خاں نے جنگی ذہانت اور تدبیر کا تمام اسلامی دنیا پر سکھ بٹھا ہوا ہے اپنی نظر بندی کے مقام سے حکومت قسطنطنیہ کے ارباب حل و عقد کے پاس یہ پیام بھیجا کہ تم لوگوں نے حسین کو شریف کو بنا کر بھیجا تو ہے، مگر تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ تم نے صوبجات غرب کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ زمانہ حال کے واقعات سے ہر شخص نتیجہ نکال سکتا ہے کہ سلطان عبدالحمید خاں کا یہ خیال کس قدر صحیح ثابت ہوا۔

کہ منظمہ میں آنے کے بعد حسین نے ابتداً ایسی پاکیزہ زندگی بسر کی کہ تمام اہل کہ پر اسکی وجہ بنا رہ گئی۔ اُسکے زہد و ورع کو دیکھ کر لوگ سمجھتے تھے کہ سلف صالحین کے زمانہ کا کوئی شخص اس عہد میں پیدا ہو گیا ہے۔ اُس زمانہ میں کہ منظمہ میں ایک ترکی گورنر رہا کرتا تھا۔ جب اڑائی چڑھا اور شریف حسین نے انگریزوں سے خفیہ مراسلت شروع کی تو ترکی گورنر کو لوگوں نے اطلاع دی اور نے اکیبا ر جبکہ دونوں مسجد الحرام میں موجود تھے حسین سے کہا کہ آپ انگریزوں سے ساز کر رہے ہیں تو شریف صاحب نے قطعاً اس سے انکار کیا اور اُسکے مزید اطمینان کے لیے ملتزم شریف (اے کعبہ) پر کھڑے ہو کر کعبہ اللہ شریف کی قسم کھائی اور اُسے یقین دلایا کہ حسین ترکی حکومت کا دل سے وفادار ہے، اور یہ جو کچھ اُسکے متعلق کہا جاتا ہے اسکی کچھ اصلیت نہیں، بلکہ محض اُسکے دشمنوں کی افواہ پر دازی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب انگریزوں سے تمام نجست و پز ہو چکی اور حسین نے اعلان بناد کا ارادہ کیا تو اُس سے چند روز قبل پھر خبر رساؤں کے اطلاع دینے کی بنا پر ترکی گورنر نے حسین کو حرم شریف ہی میں ٹوکا۔ ایک دفعہ حسین نے اپنی معصومیت کا اطمینان دلانے کے لیے خانہ کعبہ کو کھلایا اور اندر جا کر ترکوں کے ساتھ وفاداری کا عہد لیا۔ جسکے بعد ترکی گورنر کو حسین کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ رہا اور وہ موسم گراہر کرنے کے لیے طائف شریف چلا گیا۔ اور بخیری میں حسین نے بناوت کر کے ایک طرف کہ منظمہ کی منتقری ترکی فوج کو اور دوسری طرف طائف شریف میں گورنر اور اسکی فوج کو

گھیر لیا۔ کہ منظمہ کی ترکی فوج کو جس شقاوت اور شنگلی سے حسین نے ذبح کرایا ہے اُسکا بیان تو  
استدردردناک ہے کہ اُن واقعات کو سنکر سخت سے سخت دل والے انسان کے بھی روئے ٹکڑے  
ہو جاتے ہیں۔ یہ جنگ کے ابتدائی زمانہ کی باتیں ہیں۔ جنگ کے دوران میں اس نے انگریزوں کے  
بے حساب روپیہ حاصل کیا اور بدوؤں اور اپنے ہوا خواہوں کو بے دریغ اشرفیاں دیتا رہا۔ جنگ  
کے بعد اُس نے حکومت کا نظم و نسق اس طرح کیا کہ ایک متمدنہ حکومت کے طرز پر صلہ محکمات حکومت  
قائم کیے اور اُن پر اپنے خاص چیلوں کو مقرر کیا۔ اس طریقہ پر ظاہر میں اگرچہ ہر شبہ حکومت بجا ہے تو  
موجود ہے مگر دراصل کسی کو ذرہ برابر کوئی اختیار نہیں۔ تمام وزراء اور بڑے بڑے عمال صرف نام  
کے لیے ہیں۔ اُنکی اصلی خدمت صرف حسین کے دربار کی حاضری اور اُسکے ہر حکم کی بجا آوری ہے۔  
کام سارا اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

اسی سال کے قریب حسین کی عمر ہے۔ مگر جس مقدی سے وہ کام کرتا ہے ایک نوجوان سے  
بھی اُسکی توقع نہیں کی جاسکتی۔ نصف شب کے بعد اُٹھتا ہے۔ کبھی تہجد کے وقت طواف کرتے  
دکھائی دیتا ہے اور کبھی اول وقت جماعت شافعی کے ساتھ نماز میں شریک نظر آتا ہے، کبھی  
تبدیل لباس کر کے شہر کا گشت لگاتا ہے، صبح کو آٹھ بجے قصر الملوکی میں آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے  
جہاں شاہی دفتر ہے۔ جملہ وزراء اور اکیں سلطنت حاضر رہتے ہیں۔ اور ۸ بجے صبح سے ۸ بجے  
شب تک حسین ہیں بٹھیکر تمام امور سلطنت انجام دیتا ہے۔ وہ اپنے اخبار القبلہ کا خود ایڈیٹر  
ہے۔ اخبار پریس ایڈیٹر کا نام لکھا رہتا ہے وہ محض دنیا کے دکھانے کے لیے ہے ورنہ اُسکی حیثیت  
ایک عریا کا تب سے زیادہ نہیں۔ تمام اخبارات پڑھ کر خود سنتا ہے اور ہر قسم کے سفارین خود ہی  
لکھوا دیتا ہے۔

محاصل کی توفیر کے لیے ہر وقت نئے طریقے نکالتا رہتا ہے۔ جدہ کے چنگی خانہ کی آمدنی  
ترکی عہد حکومت میں کبھی ایک لاکھ پانچ سو سے زائد نہیں ہوئی اب اسکی بدولت پانچ لاکھ پانچ سو سے  
بڑھ گئی ہے۔ کہ منظمہ کے اندر چلے کسی قسم کے محاصل نہ تھے، مگر اب آئے دن نئے نئے ناموں اور  
چیلوں سے محصول ماڈ کیے جاتے ہیں۔

شریف نے ایک دوکان کھول رکھی ہے جو شہر بھر سے ارزاں نرخ پر اشیاء فروخت کرتی ہے



جسکی وجہ سے ہر وقت دوکان پر ایک سیدھا لگا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ کوئی شریف انسان جسے اپنی آبرو عزیز ہو وہاں نہیں جا سکتا۔ ارزاں نرخ پر فروخت کرتے کی وجہ سے عوام الناس میں بہ دوکان جانا

ت ہر دلفریز ہے وہاں شہر کے تاجروں کو اس سے سخت نقصان ہے۔ اور پھر اس دوکان کے عاملین کو نہایت وسیع اختیارات دیدیے گئے ہیں کہ جس تا جر کا چال جب چاہے بغیر اُس سے معاملہ کیے ہوئے، بغیر قیمت ادا کیے براہِ راست جدہ کے محمول خانہ سے لے لے، اور پچھ سال دو سال میں جب چاہے اور جس شرح سے چاہے اُس مال کی قیمت ادا کر دے۔

ابتداء میں اہل مکہ پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر اب جب جیسے زمانہ گزرنا جاتا ہے سختی بڑھتی جاتی ہے۔ جب کسی سے ناراض ہوتا ہے فوراً گبہ (بندی خانہ) میں ڈال دیتا ہے۔ یہ گبہ مکانوں کے نیچے تہ خانوں کی صورت میں ہیں، جہاں نہ ہوا کا گزر ہے نہ روشنی کا۔ گبہ میں بند کرنے کے لیے نہ کسی پر مقدمہ چلایا جاتا ہے نہ کوئی عدالتی کارروائی ہوتی ہے۔ نہ حکومت کی طرف سے قیدی کو خوراک ملتی ہے۔ یا تو اُس کے اعزاء و احباب کھانا بھیجیں! بخیر لوگ تو اس کھا کر خود اک کا انتظام کریں۔

پھر جس دوکاندار سے ناخوش ہوے اور کہ مغلہ میں زیادہ تر دوکاندار ہی ہیں تو ان کی دوکان پر قفل لگا دیا۔ اب نہ وہ بیچارہ تجارت کر سکتا ہے نہ اپنا مال اٹھا لیا سکتا ہے۔ اور پھر یہی کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ تصور کیا ہے اور تعطل کی میعاد کتنی ہے۔

ہرزبیدہ کی صفائی کے لیے چندہ سے جو رقم کثیر فراہم ہوتی ہے اُسکو حسین نے اپنی تجارت میں لگا دیا ہے اور دو تجارتی جہاز خرید لیے ہیں جو ساحل عرب کے مختلف چھوٹے چھوٹے بندرگاہوں کے درمیان مال تجارت اور مسافروں کو لاتے لیجاتے ہیں۔

غرض کہ ہر طرح پر باشندگان حجاز کو لوٹ کر حسین اپنا گھر بھر رہا ہے۔ اور جو کام کرنا چاہتا ہے اُسکے کر ڈالنے میں اُسے دباک نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی اپنا ظاہری قدس بنائے رہتا ہے بات بات پر قرآن و حدیث نوک زبان ہے۔ اور جب کوئی بیرونی شخص آتا ہے تو اُس سے خود ہی در خواست کرتا ہے کہ اگر شہر میں کوئی بات غلاب شریعت دیکھو تو اُس سے بہت مطلع کر کے داخل حسنا ہو۔ اہر والہاں اس طرح اپنی چرب زبانی سے اپنا گردیدہ بنا لیتا ہے اور موقع پڑے تو دو چار کو

مزائیں دیکر اپنی نیک نیتی اور خواہش اصلاح کا بھی یقین دلا دیتا ہے۔  
 بدوس کے پتے بڑے بڑے قبائل ہیں اُنکے سرداروں کو روپیہ دیکر اور شہر میں بٹھار پانا  
 قرب مکان اور حقیقتاً اپنا قہر بنا کر اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ اور تھوڑی سی فوج اور پولیس  
 کے ذریعہ اسی دھماکے بٹھار بھی ہے کہ کوئی شخص چوں خیر کر سکتا۔

حجاج پر بھی کسی قسم کا محسول نہ تھا۔ اس نے بھی ظاہر میں حجاج پر کوئی محسول نہیں بارھا  
 لیکن تمام مشوین کو اپنے قابو میں کر کے انڈوں کے متعلق جملہ انتظامات اپنے تحت میں کر لیے ہیں  
 اور انڈے کے کرایہ میں کثیر اخلاذ کر دیا ہے۔ اس طریقہ پر باہر کے آئے والے حجاج سے تقریباً  
 اسی فی کس حکومت کو مل جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اگر کوئی حاجی مر جائے تو اسکا کل سامان  
 بیت المال میں داخل کرایا جاتا ہے۔ اب اگر اسکا کوئی وارث موجود ہے اور وہ اس مال کو واپس  
 لینا چاہے تو اول تو یہ کوئی آسان کام نہیں، دوسرے جب اسکو واپس ملتا ہے تو مختلف رسومات  
 کے نام سے ایک حصہ اس کا خزانہ سرکاری میں داخل کرایا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی وارث نہ کھڑا  
 ہوا یا پوری کوشش واپسی کی نہ کر سکا تو پھر سب کا سب ال سہم ہو جاتا ہے۔

انگریزوں کا بٹھا ہر دوست ہے مگر انکو بھی دن رات پریشان رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ  
 اسکی مرضی کے مطابق چلیں۔ عربی زبان کی تحریر و تقریر دونوں میں اس درجہ کمال حاصل ہے کہ  
 جب اسکی کوئی تحریر یا تقریر سند کے طور پر پیش کی جاتی ہے تو ہمیشہ اسکے نئے سننے بتا کر اپنا مطلب  
 پورا کر لیتا ہے۔

ایک سال حجاج کی خدمت کے بہانہ سے انگریزوں نے ایک فوجی اسپتال بھیجا۔ حسین نے بلد  
 مٹو فوں کو بلا کر حکم دے دیا کہ اگر کسی مٹو ف کا کوئی حاجی اس اسپتال میں جائیگا تو اسکی جان  
 کی فکر نہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری اسپتال خالی پڑا اور دوسرے سال انگریزوں کو اسپتال  
 بھیجنے کی جرأت نہ ہوئی۔

پھر انگریزوں نے اپنا ایک نائب قنصل (کپتان عجب خاں سرمدی) کہ سٹک میں رکھنا چاہا۔  
 راجن صاحب نے ہندوستانی حجاج کے معاملات میں مداخلت کرنا چاہی تو ایک طرف تو اسنے  
 انکے اوپر جاسوسوں کا ایسا سنت پر د بٹھایا کہ اہل مکہ میں سے کسی کو ان سے ملنے کی عہد نہ ہوتی

تھی۔ حرم شریف تک میں لوگ اُن سے پٹکے پٹکے رہتے تھے، اور دوسری طرف، طوفین کو اشارہ کر دیا کہ ذرا کسی سالہ میں یہ دخل دیں اور فوراً انکی خدمت کر دی جائے۔ چند ہی ماہ کے بعد جناب خاں صاحب بہادر کو اپنی آبرو لیکر ہندوستان بھاگ جانے میں ہی ربی خیرت نظر آئی اور اس طرح کہ مسئلہ کے نائب قنصل یا نمائندہ حکومت برطانیہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

دربار میں حسین جس وقت بیٹھا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم کا وہ بار ہے۔ دروازہ پر ایک پہرہ دار ضرور کھڑا رہتا ہے مگر وہ صرف ثالثی معطلت کے لیے ہے۔ اسکو کسی کے روکنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہر نفس بنی رسی روک ڈک کے حسین کے پاس ہاں کہتا ہے اور حسین سے اپنا طلب و دعا بیان کر سکتا ہے۔ دربار کے کمرہ میں بھی سولے سادگی کے کوئی بات قابل لحاظ نہیں معلوم ہوتی عام شرفائے مکہ کی مجلسوں یا ملاقات کے کمروں کی طرح چاروں طرف یہاں بھی اونچے اونچے کوچ بچھنے ہوئے ہیں۔ ایک دریا کے پاس حسین اپنے سادہ لباس میں جو عام شرفائے مکہ سے صرف حریر کی عدم موجودگی کی وجہ سے ممتاز ہے بیٹھا رہتا ہے۔ پاس ہی قلندر ان رکھا ہوتا ہے۔ لوگ آنے رہتے ہیں اور بستی یا ستی یا کمر ہاتھ کو بوسہ دیتے اور سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ملا اور معززین کو حسین اشارہ سے یا اجلاس کمر کو بچوں پر بٹھا دیتا ہے باقی لوگ کھڑے کھڑے جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہتے ہیں اور جواب پا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ جب ذرا ملاقاتیوں کا ہجوم کم ہو جاتا ہے تو خدام پیشکاران دربار کا غذا لاتے ہیں اور حسین اپنے قدم سے سب پر احکام لگتا ہے۔ صبح سے ہنر تک ملاقاتیوں اور کائنات و دونوں کا اتنا بندھا رہتا ہے۔ دربار کے کمرہ کے قنصل ایک کمرہ ہے جس میں سے ہو کر لوگ دربار میں آتے ہیں۔ یہیں چند سیہ فام غلام کمر میں سترے رد پہلے اور کنگا جمنی قبندوں اور رنگ برنگ نخلی میانوں کے پیش قبض (خبر) لگانے اور حریر کے لیے بچنے چنے ہوئے حاضر رہتے ہیں۔ جب حسین کو ضرورت ہوتی ہے فوراً آہستہ سے تالی بجاتا ہے اور اُن میں سے کوئی ایک اندر آکر حکم سن لیتا ہے اور فوراً ہی تعمیل ارشاد کے لیے بھاگتا ہے۔

حسین کے دربار میں آنے سے پہلے لوگ اسی کمرہ میں بیٹھ کر حسین کی آمد کا انتظار کرتے ہیں یہیں جب پہلی مرتبہ گیا تو ہجوم بہت زیادہ تھا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ اس ہجوم میں کوئی اطمینانی ملاقات نہیں ہو سکتی، وہیں چلا آیا۔ دوبارہ دلیا تو ہجوم میں کمی



تھی، پھر بھی اتنا مجمع تھا کہ جب میں دربار کے کمرہ میں داخل ہوا تو حسین کے سامنے ہر دوں کی ایک ٹولی کی ٹولی کھڑی تھی۔ ایک عہدہ دار کے اشارہ پر میں ایک کوچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب سب بدو سامنے سے رخصت ہو گئے تو میں پاس گیا۔ شریف نے اپنے قریب کے ایک کوچ پر بٹھالیا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا کہ میں آپ سے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے تھوڑا مخصوص وقت چاہتا ہوں اور ایک ترجمان — فوراً آئی بھی، ایک غلام آیا اور اس کے ہمراہ میں روانہ کیا گیا اُس نے لیجا کر مجھے صدر مملوین سے ملا یا جنھوں نے ایک ترجمان (مطلوب) کے ذریعہ پہلے تو مجھ سے دیر تک میری ملاقات کا مقصد دریافت کیا۔ مگر جب میں نے اپنا مقصد بالوصاحت ظاہر نہ کیا تو پھر نیچہ کو شور مچا دیا کہ دارالعدا میں جا کر عہدہ سراج قاضی القضاۃ سے لوں۔ صدر مملوین

کے انداز و گفتگو سے مجھ کو یہ محسوس ہوا کہ وہ ڈرتے ہیں کہ مجھ کو اپنے مطلوب سے کچھ خطیعت پہنچی ہے اور اسکی شکایت حکومت سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے انکو یقین دلایا کہ میرے تعلقات اپنے مطلوب عبدالقادر سکندر اور اُن کے بیٹوں سے بہت اچھے ہیں اور مجھ کو اُن کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے۔ مگر غالباً اُنھوں نے اسکو یاد نہیں کیا اور اسلئے مجھ کو ٹالنا چاہا۔ جب بعض اصحاب سے ذکر آیا تو اُنھوں نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور اُن کے شور سے میں قواد خطیب وزیر خارجہ سے ملا اور اُن سے لکر کہا کہ میں شریف صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ قواد خطیب انگریزی جانتے ہیں اسلئے اُن سے ملاقات میں بہت آسانی ہوئی۔ وہ بہت اخلاق سے ملے۔ میرے کھڑکے لباس کو دیکھ کر اپنی پسندیدگی و مسرت کا اظہار کیا۔ اور ہندوستان کے حالات پر دیر تک گفتگو کرتے رہے اور وعدہ کیا کہ میں آپ کی ملاقات صاحب جلالۃ الملک سے جلد کرادوں گا۔ مگر اسکے بعد بھی کئی دن تک شریف صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ غلات کعبہ کے ساتھ مصر سے جوتا فلاح آتا تھا اسکی واپسی کے باعث معاملات کسی قدر پیچیدہ ہو رہے تھے اور شریف صاحب بہت مصروف تھے۔ اسی اثنا میں ایک دن کے لیے اُنکو جدہ جانا پڑا۔ میرے لیے یہ موقع اچھا تھا کہ میں اسی بہانے سے دوبارہ دربار خارجہ میں گیا اور ہر دفعہ گفتگو آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہرا۔ اور اس اثنا میں نہ صرف قواد خطیب سے اطمینانی گفتگوئیں ہو سکیں بلکہ متعدد دوسرے اراکین حکومت سے ملنے، اُنکی بات چیت سننے اور آپس کے طور طریقوں کو دیکھنے کا بھی موقع ملا۔

ہاتھ نہ رکھی دن کے بعد شریف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایک مملوٹ ترجمانی کر رہا تھا۔ مولیٰ  
 مزاج پرسی اور رسمی باتوں کے بعد صاحب نے اصل مدعا پر گفتگو شروع کی تو مجھے جلد محسوس ہوا کہ جو کچھ میں  
 کہتا ہوں مترجم صاحب اسکا آٹھواں حصہ بیان کرتے ہیں اور سات حصے غائب کر دیتے ہیں۔ اور خود شریف  
 صاحب میرے ہر ایک جملہ کے جواب میں تقریباً پانچ سات منٹ گفتگو فرماتے ہیں۔ اور اس میں جیسا کہ  
 مجھ سے دوستوں نے کہا تھا زیادہ حصہ قرآن و حدیث کے حوالوں کا ہوتا ہے۔ میں نے یہ خیال کر کے  
 کہ جماع کی تکالیف کے متعلق جو کچھ مجھ کو کہنا ہوتا ہے اس مملوٹ ترجمان کی معرفت شریف صاحب نہیں پہنچ سکتا،  
 نصیحت گھنٹہ کی ملاقات کے بعد یہ کہا کہ بہتر ہو گا کہ جو کچھ اس بار میں مجھے کہنا ہے اسکی تحریری یادداشت  
 میں آپ کو دیدوں اور کئی ایسا مترجم تلاش کروں جو پوری طرح حق ترجمانی ادا کر سکے۔ شریف صاحب  
 نے اسکو پسند کیا اور کہا کہ پھر جب چاہو آؤ اور جس مترجم کو مناسب سمجھو ساتھ لاؤ۔

(الناظر، جون ۱۹۲۵ء)

## حسین شریف مکہ



میں نے اپنے خیالات ظہیر کے ایک کرمفرما کے واسطے سے علی میں ترجمہ کر لئے اور انہیں سے عبدالبقی کشمیری کا پتہ حاصل کیا۔ نیگو آئندہ ترجمان بنانا منظور تھا۔ تلاش کر کے عبدالبقی سے ملا تو انہوں نے کہا کہ اگر حکومت کی طرف سے طلبی ہو تو میں حاضر ہو جاؤں گا ورنہ اندیشہ ہے کہ مجھے نقصان پہنچ جائے گا۔ چنانچہ میں نے فواد خطیب سے مل کر پھر ملاقات کا وقت مقرر کرایا، اور انہوں نے میرے سامنے ایک شخص کو ہدایت بھی کر دی کہ عبدالبقی کشمیری کو ترجمان کی غرض سے بلایا کفلا۔ میں وقت مقررہ پر پہنچا تو فوراً شریف صاحب کے پاس بٹھا دیا گیا۔ عبدالبقی نہیں آئے تھے لہذا ان کے لیے فواد خطیب نے ایک آدمی روانہ کیا۔ شریف صاحب اس وقت فارغ تھے اور ترجمان کے انتظار میں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ جب عبدالبقی آئے، تو میں جس کو پنج پر بٹھاتا تھا شریف صاحب خود اپنے مقام سے اٹھ کر وہیں میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اور ایک کرسی منگا کر عبدالبقی کو قریب ہی بٹھا دیا۔ گرمجہ میں نے اپنی بارداشت دینا پا ہی تو شریف صاحب نے مجھ سے کہا کہ جو شکایت ہو ذبانی کہوتا کہ اسکا تدارک کیا جائے۔ میں نے ہر چند چاہا کہ شریف صاحب کی سمجھ میں یہ بات آئے کہ میں اپنی کوئی ذاتی شکایت نہیں بیان کرنا چاہتا بلکہ عام طور پر حجاج کو جو تکالیف ہیں ان کو ظہیر کو دیا ہے تاکہ مناسب توجہ سے رفع ہو جائیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جسکے توجہ و دشمنی کی دھاک بندھی ہوئی تھی، تھوڑی دیر کے گئے لایققل محض ہو گیا تھا کہ اسکی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آئی۔ کچھ دیر تک رد و قدح کے بعد اپار میں نے عنان گفتگو دوسرے مباحث کی طرف پھیری اور خود حکومت ہاشمیہ کے حالات اور ارادوں کے متعلق سوالات شروع کر دیے۔ پھر کیا تھا، شریف صاحب کے سمند زبان و عقل میں سمندر کی سی روانی پیدا ہو گئی۔ میرے اک



جلد کے جواب میں وہ مسلسل دیر تک تقریر کرتے رہتے۔ اس اثنا میں میرٹھ کے شیخ علاء الدین کو لیکر  
 ذوالخطیب بھی آگئے۔ شریف صاحب نے اُن سے کچھ باتیں کیں، کچھ مجھ سے۔ جب دیر بہت  
 ہوئی تو ذوالخطیب نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے اٹھنا چاہا، مگر شریف صاحب نے سلسلہ گفتگو شروع  
 کر دیا اور مجھ کو نہ کنا پڑا۔ یہاں تک کہ ذوالخطیب نے تنک آکر شیخ علاء الدین کو توجہ دلائی  
 اور اُنہوں نے مجھ سے اُردو میں کہا کہ بادشاہوں کے یہاں اتنی دیر نہیں بیٹھتے۔ میں نے پھر  
 اٹھنا چاہا مگر شریف صاحب نے پھر سلسلہ سخن شروع کر دیا اور مجھے روکا۔ ذوالخطیب اور علاء الدین  
 تو رخصت ہو گئے مگر ہماری گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تا آنکہ اثنائے گفتگو میں ایک موٹ پریری زبان  
 سے یہ جملہ نکل گیا کہ آپ عالم الغیب تو نہیں کہ کچھ ہونا ہو اُس سب کا علم آپ کو ضرور ہو جائے۔ قرعہ  
 بیچارہ قرعہ کر گفتگو کرتا تھا اور نگہ بگدب شریف صاحب رعایا کے ساتھ اپنے حُرم سلوک اور  
 محتاج کی مذمتِ عظیمہ کا ذکر کرتے اور اُس سے نقدیق کرنا چاہتے تو وہ غریب دیر تک اُنکی تائید  
 کرتا رہتا، مگر جیسے ہی میری زبان سے یہ جملہ نکلا اور اُس نے رُک رُک کر اپنے الفاظ میں ادا  
 کیا، شریف صاحب کا رنگ رخ متغیر ہو گیا۔ غصہ سے سُنہ تھما اٹھا اور کھڑے ہوئے۔ اُن کے  
 کھڑے ہو جانے کی وجہ سے میں اور عبد الباقی بھی کھڑے ہو گئے۔ کھڑے ہی کھڑے شریف صاحب نے  
 منابتِ غصہ کی حالت میں اور کسی قدر بلند آواز سے کہا ”میں اخبار نویسوں سے نہیں دُرتا، آپ کو  
 اختیار ہے جو چاہیے لکھیے۔ میں کسی کی پروا نہیں کرتا“ میں نے کوئی جملہ ایسا نہ کہا تھا جس سے  
 یہ سمجھتا کہ یہ میرے تہدید آمیز فقرہ کا جواب ہے۔ اس لیے یہ خیال کر کے کہ غصہ نے شریف صاحب کی  
 عقل میں فتور پیدا کر دیا ہے، مناسب سمجھا کہ ملاقات ختم کر دی جائے۔ اور بتیران باتوں کا کچھ  
 جواب دے دینا ہی یہ ذکر پھیر دیا کہ میرے جانے کا وقت قریب ہے، جہاز آئے والا ہے ٹکٹ کا اتمام  
 کر لیا گیا ہے لہذا ایک ادب کا حکم دیدیا جائے۔ اس ذکر سے شریف صاحب کا مزاج کسی قدر اُزل  
 پر آ گیا اور اُنہوں نے عبد الباقی سے کہا کہ انکو یقین دلا دو کہ جیسے ہی جہاز بند کاوجہ میں  
 لنگر انداز ہوگا مجھے اطلاع مل جائے گی اور میں سواری کا بندوبست کروں گا۔ اور میرے مزید  
 اطمینان یا اپنے خلوص کا اظہار کرنے کے لیے یہ بھی اضافہ کیا کہ ان کا جہاز ہرگز نہ چھوٹے پاسے گا  
 میں اسکی پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔

لغات ختم کر کے جب میں نیچے کے کمرہ میں فواد خطیب کے پاس آیا تو انہوں نے بہت شکایت کی کہ آپ نے آج سارا وقت لے لیا جس سے ہمارے تمام مزارعی کا غذا تو وہ گئے ہیں نے اپنی معذوری ظاہر کر کے ان سے شکایت کی کہ میری روانگی کے لیے انٹ کا انتظام تو شریف صاحب نے کیا ہی نہیں۔ فواد خطیب نے وعدہ کیا کہ میں خود صاحب الجہازہ الہاشمیہ سے اس اس بارے میں گفتگو کر کے انتظام کرا دوں گا۔

دوسرے دن جب فواد خطیب سے ملا تو انہوں نے کہا کہ میرے ذکر کرتے سے پیشتر ہی صاحب الجہازہ الہاشمیہ نے خود آپ کے قصہ روانگی کا حال بیان کیا اور مجھ سے فرمایا ہے کہ اگر انٹ تنگ ہوگا تو میں اپنا بوٹر دیوں گا وہ اس میں بیٹھ کر دو گھنٹے میں جدہ پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے فواد خطیب سے کہا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں بوٹر کی سواری کی حیثیت اور عادت نہیں۔ اسکے علاوہ میرے ساتھ وزنی سامان مثل آب زمزم وغیرہ کے ہے۔ بغیر انٹ کے کام نہیں چلے گا۔ ورنہ ممکن تھا کہ جس طرح میں آیا تھا اسی طرح ایک رات میں گھسے کی سواری پر واپس چلا جاتا۔ اور اسکے لیے حکومت کی اجازت بھی ضرور کار ہوتی۔ فواد خطیب نے اطمینان دلایا کہ انٹ مل جائیگا جب ہماز جدہ پہنچ گیا تو میں نے پھر فواد خطیب اور شریف صاحب سے مل کر انٹ کے لیے کہا، مگر دونوں صاحبوں نے اپنا وعدہ سابقہ بھلا دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہماز مجھے نہ مل سکا۔

ایک دوست سے جب بوٹر کے وعدہ کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے ازراہ محبت مجھے مشورہ دیا کہ میں فوراً چپکے سے جدہ چلا جاؤں۔ کیونکہ شریف بڑا ہی سفاک و ناپاک ہے وہ اپنے بوٹر پر سوار کرا کے یہاں سے بھیجے گا اور راستہ میں مروا ڈالے گا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اس سے بڑھ کر میری کیا خوش قسمتی ہوگی کہ سرزمین مقدسہ ہماز پر درجہ شہادت حاصل ہو۔ لیکن اگر وقت نہیں آیا ہے تو شریف کی شرارت سے انتشار اللہ محفوظ رہوں گا۔ میرے دوست کا اندیشہ غلط ثابت ہوا اور شریف صاحب نے ایک حقیر شخص پر دستِ ستم دراز کرنے کا ارادہ ہی نہ کیا۔

شریف صاحب سے جو بات چیت ہوئی اور حج کے بعد کہ معطلہ و جدہ میں تقریباً چھ مہینے کے قیام میں جو حالات میرے علم میں آئے ان سب نے مجھ کو یقین دلایا کہ میرے ان دوستوں کی رائے جو شریف سے حد درجہ بیزار تھی 'حرفِ بھرت' سمجھ ہے۔ اور جو کچھ حسن ظن بعض دوسرے احباب کی رایوں کو شکر میرے دل میں پیدا ہوا تھا وہ یکسر خست ہو گیا۔

شریعت حسین کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ ترکی حکومت کے ارکان مل و عقد جو مذہب ہیں  
 اے وہ کسی مسلمان کی ہمدردی و اعانت کے مستحق نہ تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں نے  
 ترکوں کی امداد میں جو وہ پیہ صرف کیا ہے یہی نہیں کہ وہ قتل راہیگاں کیا، بلکہ انہیں کسی قسم کے  
 ثواب کے بجائے خدا کے یہاں روزِ حشر میں اسکی جوابدہی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔  
 مسلمانان ہند ترکوں کی قیاد و جوہر لا مذہب ہونے کے اعانت اور امداد کرتے ہیں مگر عجز و  
 کی کچھ مدد نہیں کرتے جو دنیا میں سب سے بہتر مسلمان ہیں اور جنگی خدمت و اعانت کا انکو ثواب  
 ملنا یقینی ہے۔

مجاز میں شریعت اسلامیہ کا پورا احترام کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ حجاج کو خدا کا مہمان عزیز سمجھتے  
 اُن کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتے اور انکی خدمت کو اپنے لیے باعثِ سعادت جانتے ہیں۔  
 مجھے خدا کے سوا کسی کا نہ ڈر ہے نہ بھروسہ۔ میں نہ انگریزوں سے ڈرتا ہوں نہ اہل ہند کی  
 مخالفت کی پروا کرتا ہوں۔ بلکہ جس بات کو حق سمجھتا ہوں اُسی پر قائم ہوں۔  
 میرے پاس ظاہری قوت اگرچہ نہیں ہے مگر جس خدا نے اصحابِ فیل کے مقابلہ میں ابا بیلہؓ  
 کو بھیج دیا تھا وہ میرا مددگار ہے اور اُسی کی مدد میری قوت ہے۔

میں اپنے ملک میں عدل و انصاف کرتا ہوں، غریبوں اور لاچاروں کی مدد کرتا ہوں،  
 اور بڑوں کو چھوٹوں پر ظلم نہیں کرنے دیتا اور ہر وقت شریعتِ اسلامیہ کے احکام کی تعمیل و ترویج  
 میں کوشش کرتا رہتا ہوں۔ خدا اور رسول کے احکام کے خلاف میں اُن ترکوں سے کیسے اتحاد  
 کر سکتا ہوں جنکی حکومت میں عورتوں کا دخل ہے اور جو مذہب کو چھوڑ چکے ہیں۔ (اس موقع پر  
 شریعت سے اپنے وزیر اعظم قاضی القضاۃ عبداللہ سراج کے پاس سے انگوڑہ کی مجلسِ ملیہ کا ایک  
 مجلسِ فوٹو منٹا کر مجھے اُن عورتوں کی تصویریں دکھائیں جو مجلسِ انگوڑہ کی رکن اور حکومتِ انگوڑہ میں راعضائے  
 متنازعہ ہیں) اور مجھ سے ہنس کر کہا کہ آپ ان لوگوں سے اتحاد کرنے کی جو دعوت دیتے ہیں  
 میں اُسکو کیوں قبول کر سکتا ہوں۔

میں نے خدا کے فضل سے اپنے ملک کو ترکوں کے ظالمانہ پنجے سے نکال لیا ہے اور میں  
 اُسکی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔ حسین کی جان خدا اُسکے  
 رسول اور اس ملک کے لیے وقف ہے۔



آپ لوگوں کو اگر اسلام سے محبت اور خدا کا خوف ہے تو آپ کو پاپیہ کہ مجاز کی خدمت کریں اور اپنے روپے سے یہاں کے لوگوں کی غریبی اور پریشانی کو رفع کریں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے بعض قومی لیڈر یہاں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں، میں اُنکے لیے چشم براہ ہوں۔ وہ آئیں اور دیکھیں کہ حسین اسلام اور مسلمانوں کی کیسی خدمت کرتا ہے۔

مجاج کے متعلق میں نے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ خدا اور اسی بات کی مجھ کو خبر ہوتی رہتی ہے۔ اور میں ہر چھوٹی سی چھوٹی بے عزتانی کا تدارک کرتا رہتا ہوں۔ آپ کو اگر کچھ تکلیف ہوئی ہو یا کسی سے کچھ شکایت ہو تو مجھ سے کیسے اور اُس شخص کو پیش کیجیے، میں اُسکو سزا دوں گا۔

میں نے سنا ہے کہ کھنڈوانی (بہی کے ایک تاجرو جیدہ اور کہ منظر کے درمیان نوٹراج کرنا چاہتے تھے اور چکو شریف صاحب کی عنایت سے بہت نقصان کے بعد اس خیال سے دست بردار ہونا پڑا) نے ہندوستان میں لوگوں سے کہا ہے کہ میں کافر ہوں اور اسلام سے خارج ہوں، وہ جیوٹا ہے بے ایمان ہے، دغا باز ہے اور خیانت سے اُسکا نفس لبریز ہے (شریف حسین کا جوش و خروش اور ہندوستانی کہاں سے لاؤں جو اُنکے اس حصہ تقریر کو بیان کر سکیں) شریف صاحب نے جو باتیں خود نہیں کہیں وہ ذوالخلیب نے مختلف صحبتوں میں ظاہر کیں۔ جس سے مجھ پر دشمن ہو گیا کہ وہ خیانت کے لیے وہ کیوں چشم براہ ہیں۔ یہ شکر کہ اہل ہند نے میں لاکھ روپیہ ترکوں کو بھیجا، شریف حسین کے سُننے میں پانی بھر آیا اور اُس نے خیال کیا کہ اہل ہند کو یہ خوف بنا کر کسی صورت سے روپیہ حاصل کرنا چاہیے چنانچہ ذوالخلیب نے ایک دن مجھ سے یہ جی کہا کہ ہمارے پاس کافی فوج اور اعلیٰ درجہ کے سردار جمع ہیں مگر روپیہ کی کمی کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کر سکتے، اگر اہل ہند کو دس ہزار پاؤنڈ ماہوار ہم پہنچاتے رہیں جس سے کافی سامان حرب لیا جاسکے تو ہم تھوڑے ہی دنوں میں شام کو فرانسیسیوں سے اور عراق و فلسطین کو انگریزوں سے فانی کرالیں اور سارے عرب کو ایک متحد ملک کے تحت لے آئیں۔ اس قسم کے چٹکوں سے شریف حسین اور اُنکے بھاریوں کا خیال تھا کہ مسلمانان ہند کو لوٹنے کا خوب موقع ملے گا۔

شریف حسین نے انگریز پوری احتیاط برتی مگر ذوالخلیب نے کبھی اس بات کے اظہار میں نہ کیا کہ ہم انگریزوں سے دلی نفرت رکھتے ہیں اور ہر ملن طریقہ پر انکو ذک و کفر تمام عرب کو

عالی کرانا چاہتے ہیں۔

نواد خطیب مصر میں تاریخ کے معلم رو چکے ہیں، اس لیے تاریخی حوالوں سے انکی گفتا لبریز رہتی تھی۔ اور انھوں نے مختلف تاریخی سناوتوں سے مجھے یہ یاد کرانا چاہا کہ ترکوں نے تمام عربی حکومتوں کو پر باد کیا۔ اور کبھی اتحاد اسلام کی پروا نہ کی۔ بلکہ ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد و ترقی کو پیش نظر رکھا اور اس بنا پر ترکوں اور عربوں کے درمیان کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ عربوں کی ایک مستحکم حکومت جب قائم ہو جائے تو ترکی حکومت کے ساتھ دوستانہ رابطہ قائم کر لیا جائے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ عرب کی مختلف چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے اتحاد باہمی کی کیا صورت ہوگی؟ نواد خطیب نے کہا کہ جس وقت عراق، فلسطین اور شام ملک الحجاز کے قبضہ میں آجائیں اس وقت بقیہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی ہمارے تحت میں رہنا قبول کر لیں گی اور نہ قبول کر سکی تو ہم انکو اپنی قوت سے رام کر لیں گے۔ شریف حسین اور ان کے وزیر خارجہ نے تو کچھ کہا تھا اس وقت پر اگرچہ ایک لمحہ کے لیے مجھے اعتماد نہیں ہوا اور میں برابر محتار ہا کہ یہ سب شاعری ہے۔ مگر زیادہ تر نگار نے پائی کہ ان کا کذب عالم آشکارا ہو گیا۔ سلطان نجد کی چھوٹی سی ریاست کے مقابلہ میں ان کے سپاہی اور ماہران فن حرب جنگی تعریف میں خطیب صاحب نے اپنی ساری خطابت صرف کر دی تھی ایک مورچہ پر بھی نہ ٹھہر سکے۔ فرانس اور برطانیہ کا مقابلہ تو کیا خاک کرتے۔

اصل شریف حسین نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ برطانیہ یا فرانس کوئی براہ راست حجاز پر حملہ آور نہ ہوں گے۔ اس لیے وہ اپنی اتھالی کمزوری کے اوجود ان حکومتوں کے مقابلہ میں اپنے تئیں ایک حد تک محفوظ سمجھتا تھا۔ اور بعض مواقع پر ولیر اور ان کے قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔ اسی سال حج کے ختم ہونے پر ایک واقعہ پیش آیا۔ شام کا ایک تاجر حجاج کو جدہ سے عراق لیبلے کے لیے دو جہاز لے کر آیا اور دوسری کینیوں کے مقابلہ میں کم کر آیا۔ کا اعلان کر کے اس نے اپنے دونوں جہازوں کو بھر لیا۔ شریف کی طرف سے جو صاحب جدہ کے قائم مقام یا گورنر ہیں وہی ٹرنار سین اور نازی کینیوں کے بائینٹ ہیں۔ ان کا اس میں خمدارہ تھا لہذا انھوں نے شریف صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع دی اور اس معاملہ میں اعانت چاہی۔ شریف صاحب فوراً سوٹر پر جدہ پہنچے اور کشتی پر سوار ہو کر ان جہازوں پر گئے۔ اور تمام مسافروں کو جہازوں پر سے اتار دیا۔ اور کہان کو بھی سخت ست کیا۔ مگر اس نے کچھ پروا نہ کی اور ترقی: ترکی جواب دیا۔

سے بعد ساحل پر واپس آکر حسین نے اُس تاجر کو گرفتار کر لیا اور حراست میں لے لیا۔ جب فرانسیسی قنصل کو اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو اُس نے برطانوی قنصل کو، دسیان میں ڈالا۔ برطانوی قنصل نے شریف صاحب کو بہت سمجھایا اور ڈر دیا کہ آپ اپنے لیے کانٹے بڑے ہیں۔ فرانس سے اُچھٹا اچھا نہیں۔ تو حسین نے بیابان کا یہ جواب دیا کہ جیسی اللہ و نعم الوکیل۔ اٹھ ہی گفت و شنید کے بعد اُس تاجر کو رہا کیا۔ مگر اُسے اپنے جہاز خالی واپس لیجانا پڑے۔ اسی طرح بے ٹکٹ والے بندوستانوں کی سب کثیر تعداد جہ میں جمع ہو گئی تو اُس نے جہاز میں کپنیوں کو مجبور کیا کہ دس فیصدی بے ٹکٹ والوں کو مفت لیجائیں۔ کپنیوں نے انکار کیا تو اُس نے فوراً دھمکی دی کہ ہم اپنے بندوگاہ میں تمہارے جہازوں کا داخلہ بند کر دیں گے۔ آخر کپنی والوں نے برطانوی قنصل سے اعانت طلب کی اور حکومت ہند کو مجبوراً بین الاقوامی قانون جہاز رانی کے علی الرغم کپنیوں کو اجازت دینا پڑی کہ جتنے مسافروں کو چڑھانے کی انکو اجازت ہے اُسے تو ٹکٹ والے چڑھائیں اور ان کے علاوہ دس فیصدی کے حساب سے بے ٹکٹ والے مسافروں کو سوار کریں۔

شریف حسین نے جو باتیں کہیں اور جس قدر دعادی نیے اگر واقعی حالات سے اُن کی تصدیق ہو سکتی تو یقیناً شریف کے متعلق بالکل دوسری ہی رائے کا اظہار ممکن ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ شریف کا قول و عمل بالکل متضاد تھا۔

سب سے پہلے شریف کی مذہبیت اور اسلامیت کو دکھایا جائے۔ اُسکا راتوں کو اٹھ کر کعبہ شریف کے گرد طواف کرنا، اول وقت میں نماز فجر ادا کرنا، غلاب شرع لباس اور سامان آہٹیا سے احتراز کرنا اور ترکوں کی لامذہبیت پر اعتراض کرنا اگر مذہبیت کی علامت ہے تو کیا ترک گوشت کے سامنے حرم محترم میں خلیفہ کی وفاداری کے حلف لیکر پھر فلسفہ سے بناوت کرنا، ترکوں کو لہذا مین کے اندر اور مسجد الحرام میں ذبح کرنا، مسجد الحرام کے حجرہ پر جی زمین مسئلہ طور پر حرم محترم میں داخل ہے مالکانہ قبضہ و تصرف کرنا، اُن کے بیسہ دشرے اور اُن کے کرایہ پر پلانے کو جائز رکھنا، ملک الحجاز ہونے کے باوجود اپنے ادنیٰ اور مکانات کو کرایہ پر چلانا، تجارتی کاروبار کرنا، نہر زہید کے چند کو ذاتی کاروبار میں لگانا، غیر سلسلوں کو کہ منظر اور حرم محترم میں داخل کرنا، (برطانوی اسپتال کے عمل کو سیر کی غرض سے کہ منظر آنے کی اجازت دیکھی تھی)۔ در عراق، فلسطین و شام کو غیر سلسلوں کے اقتدار میں دیکھنا وغیرہ بھی مذہبیت و اسلامیت کی نشانیاں کبھی جا سکتی ہیں؟



اب ملک عرب سے محبت و ہمدردی کے دما دی کو دکھنا چاہیے۔ عرب کو ترکوں کی غلامی سے آزاد کر کے ایک عرب بادشاہت قائم کرنا یقیناً جب وطن اور قومی روئندی کی جاسکتی ہے لیکن بادشاہ وقت کا غریب ہر دوس کی واحد تجارت یعنی تاج کے اونٹوں کے کرایوں سے نصف سے زائد چودہ میں سے تو گنتی بطور حق حکومت لے لینا، چکی کے محصول میں چکیاؤں ایک لاکھ سے کم کے بجائے پانچ لاکھ پاؤنڈ) امانت کرنا، نئے محصول جاری کرنا، شہر کے دو ہزاروں کو شاہی تجارت کے مقابلہ کی زد میں لا کر تباہ کرنا، سیکڑوں برس کے رائج الوقت سکوں کو کینٹلم منسوخ کر دینا اور ان کا بدلہ دنیا، ایک پیسہ سے چھوٹے تانبہ کے سکے کو پانڈی کی دوائی کے سادھی قیمت پر چلانا، کیا یہ سب باتیں بھی وطن اور اہل وطن سے ہمدردی و سوزی کا نتیجہ ہیں؟

اس سے بھی بڑھ کر اور رعایا کے تحفظ حقوق اور اُسے ساتھ عدل و انصاف لے دے داری لو لکھتے بے شبہ عدالتوں میں باقاعدہ مقامات فیصل ہوتا، چور کو قلعہ کی نہیں تو آزانہ کی سزا، شہریں اور جدہ اور مکہ کی درمیانی شاہزادہ پر قیام امن اور عام ملکی نظم و نسق سے ایک حد تک رعایا کے حقوق کا تحفظ بھی ہوتا ہے اور ان کے ساتھ عدل و انصاف بھی کیا جاتا ہے۔ یہ کیا دوکانوں میں بے سبب قفل لگوا دینا، بنیر کسی عدالتی کارروائی کے محسن شاہی ناخوشی کے باعث لوگوں کو گہرہ (تبیہ خانہ) میں ڈال دینا، تاجروں اور دوکانداروں کا مال بنیر قیمت دے دے اور معاملہ کیے اٹھا لینا اور صرت کر ڈالنا، لوگوں سے انکی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ سب تشویش خود چنہ وصول کرنا (جیسا کہ مسجد الاقصیٰ کی مرمت کے لیے ہماری موجودگی میں واقع ہوا) چنہ دینے میں عذر کرنے والوں کو ملک سے اخراج کی دھمکی (یہ بھی ہماری موجودگی کا واقعہ ہے) سکے کی تبدیلی کے احکام سے ناراضی کی پاداش میں معززین کو آزانوں سے پٹوانا اور ان سے شرکوں پر ذلیل کام لینا، غیر بھی تحفظ حقوق اور عدل و انصاف میں داخل ہے؟

یہ بھی نہ سہی زائرین، حجاج کی خدمت کی سعادت تو حاصل تھی۔ اس سے انکار کرنا انصاف اور صداقت کا خون کرنا ہے کہ زمانہ سابق کے مقابلہ میں حجبوں کے تعلق جو انتظامات شریف حسین نے کیے ان میں بہت کچھ تنظیم و باقاعدگی تھی مگر کیا تاج کی حیب پر سوا سو سے زائد فی کس بار ڈال دینا، محض قرعہ طبع کی نہیں کو مبنی برحق قرار دینے کے لیے انھیں، ایک شہرہ زور و تک ایک ایسے عزیز و میں سفید رکھنا جہاں نہ بارش اور دھوپ سے پناہ ملنے کے لیے کافی مکانات ہوں،

# مقدمہ

(۱)

مولانا محمد علی صاحب نے اپنے اخبار ہمدرد میں جسکی عنوانِ ادارت اب ملا بھی اُن ہی کے ہاتھ میں ہے خواجہ حسن نظامی دہلوی، خواہر زادہ حضرت محبوب الہی، و فرزند و بلند حضرت مولانا علی کرم اللہ وجہہ و نبیئہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و میرزا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حال ہی میں یہ نہایت ہی سنی خیر لقب عطا فرمایا ہے۔

اگست سٹیشن میں صوبہ مولانا ظفر علی خاں صاحب دوبارہ حیدرآباد میں بلائے گئے اور حضور نظام کے لطف و اکرام سے سرفراز ہوئے تو جن لوگوں کو اُن سے اختلاف تھا، یا کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ جو لوگ اُن کو اس منزلت سے گرانا چاہتے تھے، اُنہوں نے حکومت ہند کا دروازہ، کھٹکھٹایا۔ اس سازش میں حیدرآباد کے کون کون لوگ شریک تھے اس پر بحث کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ البتہ دو اشخاص کے کارنامے اس وقت پاک کے سامنے ہیں۔ شیخ منیا و الحق صاحب اپوزیسی تھے بلکہ خواجہ صاحب نے اب اپنے تبلیغی اخبار سادسی میں تہذیب و اکو کا لقب دیا ہے اونکی پمفلٹ بازی کبھی خاص شہرت رکھتی تھی خواجہ صاحب کو چاقا لیا اُنکے پرانے رفیق کا رشتہ اپنے خاص ذرائع سلامات کی بنا پر یہ اطلاع ہم پہونچائی کہ ظفر علی خاں صاحب حضور نظام کو پان اسلام فرم (ہمدردی اسلام) کا سبق پڑھا رہے ہیں، اور خواجہ صاحب نے چیف کسٹرو دہلی کو جا کر باضابطہ اس حادثہ عظیم کی خبر پہونچائی۔ چیف کسٹرن صاحب نے حکومت پنجاب اور حکومت ہند کو اطلاع دی اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند روز میں مولوی ظفر علی خاں صاحب کو مع اُنکے صاحبزادہ عزیز علی خاں کے حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ اور حضور نظام کے متعلق حکمران ہند کا جو ردیہ آج بتایا جاتا ہے، اگر اس میں کوئی واقعیت ہے تو ایک انگریزی اخبار کے

مطابق واپس اسلام میں بھی انکی فہرست الزامات میں داخل ہے جس کا سبق مہذب و مقدس  
ڈاکوؤں کی شہادتوں کے بموجب ظفر علی خاں صاحب نے انکو پڑھایا تھا۔

خواجہ حسن نظامی صاحب سے ہیں پہلی بار سن ۱۹۰۶ء میں شناسائی حاصل کرنے کا موقع  
آسوت تک خواجہ صاحب مرت ابن آدم تھے، خواہر زادہ، فرزند ولید، بیسہ و میرہ کی  
خصوصیات کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔

آٹا نظر کے اجراء کے بعد نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ اور حلقۃ المشائخ کے بانی کی حیثیت میں  
جب خواجہ صاحب نمودار ہوئے تو فروری کے ناظرین نظرے خوش گزشتہ کے تحت منسلک  
خیالات کا اظہار کیا گیا :-

”لیکن باوجود اس حسن عقیدت کے صوفیائے کرام اور ان کے روحانی مشن کے ساتھ،  
نہ کہ خواہر زادہ حضرت محبوب الہی کے ساتھ، ہم نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ کی روش  
کو اس وقت سے نہیں دیکھتے جبکہ وہ غلطی سے مستحق بتائے  
جاتے ہیں اور جبکہ وہ بحالت موجودہ اُسید کر سکتے ہیں

ایک ایسے زمانہ میں جبکہ تار اور ٹاک کی بدولت رسل و رسائل اس نذر آسان بن گئے  
مردہ پختہ سڑکوں، تیز رفتار ریلوں اور فضائی جہازوں کی وجہ سے نقل و حرکت کے ذریعہ اس وجہ  
سہل الحصول نہ تھے اور دنیا کی تین چوتھائی آبادی حالانکہ آسوت یقیناً مشرب ہو گیا ہے البتہ  
معنی محض صوفیائے کرام کی باطنی و اشراقی قوتیں دنیا سے اسلام میں نور پیزی و نہایت ستری اور  
خیالات باطلہ و عقائد ناقصہ کی اصلاح و درستی کرنے سے عاری نہ تھیں، لیکن مقام تہیب ہے  
کہ آج ان آسائینوں کے باوجود اور فرقہ اہل باطن کے خود ساختہ نائبوں کے دعوے  
کے بموجب دنیا کی آبادی میں تین چوتھائی حصہ صوفی مشرب لوگوں کا  
ہوتے ہوئے بھی محض ابد فریبی اور مغربی تقلید کے خیال سے علم تصوف کی درسگاہیں  
قائم کرنے اور صوفیوں کی اصلاح کرنے اور اگر سارے عالم کو نہیں تو تمام مشرقی ممالک کے  
مسلمانوں کو مشرب صوفیانہ کی دعوت دینے اور انکو ایک محیط ہدایت و توہم میں فرق کرنے کی  
شش میں اثری سے چوٹی تک کا زور لگایا جاتا ہے اور زمانہ حال کی تمام مائے تمدنی



اور سیاسی ایجادات اس فائیت تسلیم و تقدیر کے لیے صرف ہو رہی ہیں۔  
خواجہ صاحب کے کارخانہ تجارت کے بارے میں سطور بالا لکھنے کے بعد اسی سلسلہ میں  
مولانا محمد علی سے یوں شکوہ کیا گیا تھا:-

”قوم کے دو برگزیدہ نفوس جو اپنی فطری سادت اور ملکوتی ثنابت کے باعث اس قسم کی برائیوں  
اور بازگیریوں کی عملیت سے بے خبر رہتے ہیں انکا تو ذکر نہیں، لیکن انہیں معلوم ہوتا ہے ان حضرات پر

جو اپنی مالی و دینی و روشن ضمیری سے ان شہدوں اور مصلوحوں کے پیچ و پیچ اسرار سے  
واقفیت رکھتے اور علی تجرلوں اور شہدائے واقعات کے بذلت ان کی  
حالت و حیثیت کا صحیح اندازہ کرنے کے باوجود محض ہر دلعزیزی قائم  
رکھنے کی خواہش یا اخلاقی جرأت کے نقد ان سے واقعات کے چہرے  
پر وہ اٹھاتے اور حقیقت راز کا انسانہ سنانے کی ہمت نہیں رکھتے۔

مجموعہ کامرٹینے اپنی ۱۲- جنوری کی اشاعت میں ایک دعوے کا اعلان کیا کہ  
ہوے اس قسم کے لوگوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے ہیں اتفاق کلی نہیں۔ ہمارے  
خیال میں ایسے موقعوں پر بزرگان ملت کا سکوت کرنا یا ”وہن ملک بہ لقمہ دوختہ“  
کی قدیم ہدایت پر کاربند ہونا حالات موجودہ کے لحاظ سے کبھی مناسب نہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ  
آج کل کے ذہین و مباع اور ہٹسے کلمے میار ”الکاشی نیم رتنا“ کا مفہوم خوب سمجھتے ہیں اور  
بڑے ناموں کی پرستش کرتے والوں کو اس طریقہ پر فائدہ بجا حاصل کرنے میں جویدلوئی حاصل ہے  
اس سے ملک قوم کو سخت خیا زہ بھگتنا پڑا ہے اور پڑے گا۔“

ایک سال بعد جب خواجہ صاحب نے میرٹھ سے اخبار توحید جاری کیا تو سنی مسلمانوں کے  
انتظار میں اس کے متعلق یہ عرض کیا گیا:-

”... اگر توحید کا ظاہری لباس تصوف کی باطنی تعلیم کے لیے مفید و کامیاب ہو سکتا تو مسلمان ہند  
کے حق میں یہ اخبار ضرور نازل جمست کا باعث ہوتا لیکن جب اہل باطن ظاہری تصنیفات سے آراستہ  
ہو کر نمود و نمائش کو اکتسابِ برکت کا ذریعہ قرار دیں اور بخادعون اللہ والذین آمنوا واما نجدون  
الا انفسهم وایضاً ان کی دل ہلا دینے والی آواز پر کان نہ دھریں تو کما ہر ہے کہ مذہب اور اہل  
مذہب کے حق میں نتیجہ کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔“



ضرور ہے اور خواہ ہر دہائی بننے کی ہم کسی ہی سخت خواہش و ضرورت کیوں نہ ہو لیکن ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ اسید دیم کی کوئی حالت ہیں اس سالہ میں ٹنگت نہیں رہ سکتے۔  
 سنہ ۱۶ اور سنہ ۱۷ میں بوہرہ فرقہ کے مشہور مشیخ ملا طاہر سیف الدین صاحب  
 کی ایک تصنیف کی بدولت خواجہ صاحب اور آن جیسے دوسرے مقدس اور مذہب  
 ڈاکوہ نے خوب داد و نرائی دی اور بھیڑی کے اہمیتوں کی زرا پاشی نے ملک میر یک طوفان بے تیر  
 بپا کر دیا تو ٹنگ آ کر ہمیں فردری سنہ ۱۸ کے اتنا فخر میں سطور ذیل لکھنا پڑیں۔

ریل ڈاک، سار، طبع اور اخبارات بے شبہ تمدن بدیدہ کے بہترین قمرات میں سے ہیں لیکن اس قوم  
 کی قسمت کو کیا کیے جبکہ افراد ان نفع بخش اور راحت دہ چیزوں کو بھی شرارت اور  
 نفسانیت کا آلہ بنالیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کم و بیش ایک سال سے سلاواں کی ایک  
 جماعت انہیں تمدن پر تورات کے ذریعہ افراد قوم کے دلوں میں کدورت و نفرت کے جذبات  
 شعل کرنے میں مصروف ہے اور اگرچہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس بحث میں ہم کسی قسم کا حصہ لیں  
 لیکن وقت زریعہ اور قوموں کے بیجا اسرات کے ساتھ ساتھ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہیں جنگ  
 زمرہ کی بدولت کثیر افراد قوم کے اخلاق بھی برباد ہو رہے ہیں تو ہم سائنس کے جائیں اگر ہم  
 خاموشی کو گناہ سمجھ کر چند سطور تحریر کریں۔

ابتدا اسکی یوں ہوئی کہ ایک صاحب محمد اسماعیل سرایا وائے جنگے دل میں غالباً اسلام اور مسلمانوں  
 کا درد تمام قوم سے زیادہ ہے، ایک مولانا قریب بعض اخبارات میں اس مضمون کی شائع کرانی  
 کہ ہمیں میں جو داؤدی بوہروں کے ایک سرغنہ ملا طاہر سیف الدین صاحب میں انہوں نے  
 تنویر نور الدین کے نام سے ایک کتاب عربی زبان میں تصنیف فرمائی ہے اور اس میں خدا  
 اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تنویر بابت توہین کی اور تمام فرق اسلام کے خلاف سخت زہر  
 افلا ہے۔ قومی اخبارات و رسائل عموماً نکالے تو اس دعوے کے ساتھ جاتے ہیں کہ ان کے ذریعے  
 قوم و ملک کی خدمت منظور ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بعض مشنریات کو چھوڑ کر ایک بڑا عمدہ اخبارات  
 و رسائل کا محض ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو حصول سائنس کی تمام کوششوں میں ناکام رہنے  
 کے بعد اس غریب پروردگارہ پڑا بیٹھتے اور اپنی تن آسانوں کی خاطر ملک و ملت کا نام  
 لیکر بد اخلاقیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، مذہبی مناظروں اور سیاسی مجاہدوں کی گرم بازاری



میں تو غیر انہیں اصحاب کا بڑا حصہ تھا ہی مگر اب روز بروز نئے نئے دروازے ان  
بندگانِ غرض کے لیے کھلتے جاتے ہیں۔

سرایہ صاحب کا پستون چند اخبارات کے سوا تقریباً نکالی بند کے اکثر اخبارات و  
رسائل میں شایع ہوا اور ہمیں ذاتی طور پر اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ جن اخبارات و رسائل  
نے اس پستون کو شایع کیا، اسکی حمایت میں نوٹ اور مضامین لکھے انہوں نے نہایت محنت  
تجارت کر لی۔ تجارت بُری شے نہیں ہے، لیکن جو اخبار نویس اپنی ذمہ داری محسوس کیے  
بغیر محض چند سکوں کے معاوضہ میں اس فتنہ کی پرورش کرتے، ہے انکا مندر شاہ انہیں ہم سے  
بہتر طریقہ پر بتا سکتا ہے کہ یہ تجارت ہے یا کیا؟

سرایہ صاحب کا زور ختم ہوا تو قلم صاحب کے اردو مندوں کی طرف سے انکی زبردستی  
دم ختم کے ساتھ شروع ہوئی۔ اور انہوں نے ایک طرف تو بعض ایسے اخبارات ہی کو توڑا  
جو سراہ صاحب کی زربا شیوں سے کافی طور پر مستفید ہو چکے تھے مثلاً کُن میں سے چند نے اچھوت  
اور احمق بنائے جانے کا بیانیہ اہل امتزات کو شروع کر دیا ہے اور دوسری طرف کسی مجلس زور  
سے شیعہ الافلاس کے نام سے ایک رسالہ لکھو کر کثیر تعداد میں شایع کیا۔

مدِ عمل کی یہ کوشش ختم نہ ہوئی تھیں کہ بیٹی کے زور و نعرہ نے دہلی کی منٹ سے  
ایک نیا سک "سبیت بردین" ڈھلا کر ملک میں رائج کرادیا۔ اس رسالہ میں  
علماء و فضلا، شاعر و ادیب، مصلح اور مسلم، غرض کہ ہر طبقہ کے نمایندوں اور بیٹوں کے فتاداری کی  
صفت بندی کر کے سراہ صاحب نے جو فساد برپا کیا تھا اسکی حمایت کا سامان جمع کیا گیا۔ بیان کیا  
جاتا ہے کہ حکومت دہلی نے اس پمفلٹ کو پریس ایکٹ کے تحت سے ضبط کر کے ہر شی طرح شایع نہیں  
ہونے دیا۔ لیکن جو لوگ فریقین کو اتوتا کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے انکی نشانی کے لیے یہ کافی تھا  
لہذا جو نسخے اس رسالہ کے شایع ہو چکے تھے انکی تردید کے لیے اب ملک کا غذا اور سیاہی فراوانی  
کے ساتھ بھائی اور! جرنل بیٹی کی رولت اس ٹی کی آٹا میں اڑائی جا رہی ہے۔ چنانچہ کچھ دنوں  
پہلے خاص لکھنؤ سے ایک رسالہ اسی نوعیت کا شایع ہوا تھا۔ مطبع عالم افروز بیٹی نے اس کے بعد  
"آئینہ صداقت" لکھا یا اور اب ایک پمفلٹ "سبیت بردین علی رؤس العتدین" میرٹھ سے  
وصول ہوا ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ یہ عاقبتیں اور یہ فزائیاں کب تک جاری رہیں گی۔ لیکن بلا لحاظ اسکے کہ بینندگانِ مذکور کو ان ذرائع سے کافی مالی منفعت پہنچ رہی ہے وہ ہیں بیٹا رکھائیاں دیں گے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ملاطہر سعید الدین کے ارادت کیشوں اور ان کے فریق مخالفت اور دونوں کو آگاہ کر دیں کہ آپ دونوں کو اس جنگ زرگری سے کوئی فلع پہنچنے کی تو بظاہر امید نہیں، البتہ آپ کے پاس جو فاضل روپیہ ہے وہ ضرور اس طاقت میں آپ کی حیب سے نکل کر ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا جو آپ دونوں میں سے کسی کے دوست نہیں بلکہ آپ کے روپیہ کے دشمن اور اس قسم کی ڈاکہ زنی میں کافی مہارت رکھتے ہیں آپ دونوں اگر ٹھٹھکے پر سے ہیں تو ویسے ہی بد بختی سے عقل کے کورسے بھی ہیں۔

ہمیں نہایت افسوس معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث میں ڈاکٹر اقبال اور مسٹر عبد الما جدیہ قوم کے ایسے افراد بھی شریک کر لیے گئے ہیں اور اسکی تا مسرؤمہ داری ہمارا تک ہمیں علم ہے خواجہ حسن نظامی صاحب کے سر ہے۔

ملاطہر سعید الدین کے عاقبتوں نے جو تردیدی رسائل شایع کیے ہیں انکی حقیقت و نوعیت سے ہم واقف نہیں اور اگر ان میں خواجہ صاحب کا نام صاف صاف نہ لکھا ہوتا تب بھی ہمیں یہ باور کرنے کے کافی وجوہ موجود تھے کہ خواجہ صاحب بھی اس تجارتی کوٹھڑی کے شرکاء میں داخل ہیں۔

جب سے خواجہ صاحب کتابوں اور دواؤں کی تجارت میں باقاعدہ طور پر منسلک ہیں تو قہر تھی کہ اس ذریعہ سے جو آمدنی انکو ہو جاتی ہوگی اس پر وہ اکتفا کریں گے۔ بلکہ ہم امیدوار تھے کہ وہ کسبِ حلال کے ان وسائل کی موجودگی میں اپنے کمالاتِ تصوف و روحانیت کی نمائش کو بھی رفتہ رفتہ چھوڑ دیں گے لیکن بظاہر ایسا سلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب قناعت میں عیب را کیا ست

کے فلسفہ پر بین نہیں رکھتے۔ ورنہ اس گندے کاروبار سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیتے۔

اقتباسات بالاسے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ باوجودیکہ ہم خواجہ صاحب سے دو قرب مکانی حاصل : تمام کی بدولت ہم انکے نہاں خانہ خلوت کے ”کارِ دیگر“ کا برائی حسین شاہدہ کر کے یابک کو

بر وقت اُنکے کارناموں سے آگاہ کر سکتے، پھر بھی اُنکی خطرناک روش کو سمجھنے اور اُس سے موقع پرست  
 متنبہ کر کے چابک کو اس بال میں پھنسنے سے بچانے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اور جو رے  
 ہم نے اس قدر دوزخ پیدا کر اور محض اُنکی تشریری کیساووں اور کاغذی کھلونوں کو دیکھ کر تائم کی تھی تجربہ سے  
 بخوبی اسکی صحت و صداقت ظاہر کر دی ہے۔ اگر مولانا محمد علی صاحب اور ملی کے دوسرے وہ اصحاب جنہیں  
 اُن سے قرب حاصل مہجے کی وجہ سے اُنکے حالات کا زیادہ صحیح علم ہو سکتا تھا ابتدا ہی میں اس فتنہ کو دباؤ  
 کی کوشش کرتے تو مسلمانوں کو اُنکی مقدس ڈاکہ زنی سے کب کی نجات مل گئی ہوتی۔

ملک میں اور خاص دہلی میں ایسے متعدد "ڈاکہ" موجود ہیں جنکے ساتھ مروت و نیک سادگی  
 اگر دانا رکھا جائے تو اُنکی زہریلی زندگی کا نشو و نما ہزاروں بندہ گمان مذہبی پریشانی و تباہی کا موجب  
 نہ بننے پاتے۔

۱۳۔ دسمبر ۱۹۲۷ء



## مقدس ڈاکو

(۲)

گذشتہ نمبر میں صرت الناظر کے انتہاسات پیش کیے گئے تھے جن سے اندازہ ہوا ہوگا کہ خواہر زادہ حضرت محبوب الہیؑ کے متعلق ہم شروع ہی سے کیا رائے ظاہر کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے جب مولانا محمد علیؒ نے خواجہ صاحب کی جاسوسی کا پروہہ فاش کرنے والی تحریر کا اشاعت سے قبل ایک موقع پر ذکر کیا تو کم سے کم مجھے اسپرذر تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ جس شخص کا سا لہا سال سے یہ شیوہ رہا ہو کہ علانیہ تصوف کے قریب آمیز ہر روپ میں مسلمانوں کو دھوکا دیکر اپنی گرم بازاری کا سامان ہیا کرتا رہے اور دن رات بھولے اماروت اور نیک دل لوگوں کو لوٹ لیا کرے اُس کے لیے مجبری و جاسوسی کے نفعیہ جرائم کچھ زیادہ سنگین نہیں ہو سکتے۔ خدا معلوم گذشتہ پندرہ سال کے اندر ایسی ہی کتنی وارداتوں کا ارتکاب کیا گیا ہوگا جنکی تفصیلات اور نتائج سے اہل ناک ہنوز بے خبر ہیں۔

تہمید میں اس واقعہ بختری کے سلسلہ میں جو طولانی معنایں شائع ہوئے ہیں انکو ہم نے بالاستیاب پڑھا اور اس راز کے فاش ہو جانے کی وجہ سے خواجہ صاحب کو جس رسوائی کا سامنا ہے اُس کے دفعیہ کے لیے غریبوں کا اخبار جو نکالا گیا اُس کے اکثر پہلے بھی ہمارے مطالعہ میں آئے اور خواجہ صاحب کا مفصل جواب جو اخبار سے ملندہ بھی شائع کیا گیا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اور غالباً یہ کہنا بالکل غیر ضروری ہے کہ مولانا محمد علیؒ نے خواجہ صاحب کا جو خط شائع کیا ہے اُسکی موجودگی میں نہ تہمید کے طولانی مقالات کی تائید مزید درکار تھی نہ خواجہ صاحب کے لاطائل جوابات سے منالطہ کھانا ممکن ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ کوئی جو زمین ارتکاب سرقت کے وقت یا رواداد جرم بیان کرتے ہوئے یا مال سرقت کو نسل میں دبا لے گرفتار ہو جائے۔ لیکن جب کبھی ایسی صورت پیش آجائے تو پھر چور خواہ کتنے ہی ملٹ اٹھائے یا سرقت کے محرکات اور مال سرقت کے قبضہ میں آنے کے اتفاقات کی کتنی ہی ملتیں بیان کرے عدالت مجبور ہوگی کہ ایک بات کو بھی اوردہ کرے اور مجرم کو قانون مردودہ کے رو سے زائد سے زائد سزا جو اس کے اختیار میں ہو بے تکلف دیدے۔ خواجہ صاحب اگرچہ زمین ارتکاب جرم کے وقت نہیں گرفتار ہوئے

مگر اُنکے مجرم کی داستان خود اُنکے مصور فطرت قلم کی لکھی ہوئی رسلے عامر کی صداقت میں پس  
 ہو چکی ہے۔ اب اُنکے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں۔ اور اُن جیسے طباع و ذہین شخص کا اتنی سی بات  
 کو نہ سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ارحم الراحمین نے جو ڈھیل پھوڑ رکھی تھی اُسکی سیاد ختم ہو گئی۔  
 اور مستقیم حقیقی کی سزا ہی کا وقت آگیا۔ ان اللہ تعالیٰ والا لیل۔ اب نہ خواجہ صاحب اُنکے  
 حلفت اُن کی بگیا ہی کا یقین دلا سکتے ہیں نہ اُنکے رفقاء و شرکاؤ کی عیاریاں و الجہ فریبیاں اس  
 بدنام داغ کو اُنکی پیشانی سے چھڑا سکیں گی۔ نہ مہذب ڈاکو کا مجرم عادی ہونا اُنکی مصومیت  
 کی دلیل بن سکتا ہے اور نہ مولانا محمد علی پڑاویوں سے ساز باز، لیڈروں سے رقابت، لائبریری،  
 ملت فرڈنش، اور چندوں کے خورد برد کرنے کے انواع و اقسام کے بے حساب الزامات قائم  
 کرنے سے اُنکی قبائے نقوت و عباسے تقدس پاک و معات ہو جائیں گی۔

خواجہ صاحب کی قسمت میں خدا کی لائٹ سے بچا لکھا ہوتا تو وہ اس داغ کے فاش ہوتے  
 ہی یا تو اعتراضات فقیر کر کے رسلے عامر سے طالب عفو ہوتے یا کم سے کم اس تلخ گھونٹ کو پی جاتے  
 اور کچھ دنوں کے لیے گناہی و خاموشی میں زندگی بسر کرتے۔ لوگوں کا فائدہ تو بہت کمزور واقع ہوا ہر  
 کچھ عرسہ کے بعد بات آئی گئی ہو جاتی۔ مگر غرور و امانیت یا حرص و آرزو انہیں اسکی اجازت  
 نہ دی۔ اور وہ "چوری" مکمل جانے پر اور سینہ زوری کرنے لگے۔ جس سے نہ صرف اُنکے  
 گناہوں میں اضافہ کثیر ہوا بلکہ اُنکے تعلیم یافتہ اور دردمند لوگوں کی نفرت و حقارت میں زیادتی  
 ہو گئی۔ چنانچہ خود اُنکے اتھاروں میں جن بے عقل ساوہ لوحوں اور چالاک ہوشیاروں کی کثرت تحریریں  
 شائع ہوئی ہیں انہیں سے ہر شخص نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ تعلیم یافتہ معاملہ فہم اور بے لاگ لوگوں  
 نے کہاں تک اُنکی ہمدردی و غمخواری سے اجتناب کیا۔ حالانکہ ان تحریروں کے حصول میں  
 خواجہ صاحب نے اڑی چوٹی کا سارا نور صرف کر دیا اور بہت ممکن ہے کہ اُن کا بیشتر حصہ بھی  
 اُن کی اپنی و دوکان کے کارگیروں کی تخلیق ثابت ہو۔

جو اخبارات، اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر اُنکے لیے سینہ سپر کیے ہوئے ہیں اُنکے  
 متعلق اتفاق سے وہ خود اپنے اخبار نامہ دی میں اعلان کر چکے ہیں کہ تبلیغ مذہب سے اُنکو ماہوار  
 اور وقتی امداد ملتی ہے۔ جسکے بعد ایسے لوگوں کی تائید کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ کچھ  
 لوگوں کو غھوڑے دنوں تک دھوکے میں رکھا جاسکتا ہے مگر ساری دنیا نے ہمیشہ کے لیے اُنکو

اور کانوں کو بیکار بنانے کی قسم نہیں کھاتی ہے۔

روزانہ اخباروں میں لکھنؤ کا وہ بے حقیقت اخبار جسکے اجراء کا لگاؤ عظیم راتم الحروف کے سر بے خواجہ صاحب کی اگر تیس پوت کر رہا ہے تو کچھ مقام تعجب نہیں کہ خود منادی کے اعلان کے بموجب اُسے پچیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ تبلیغی راہبہ یا مقدس ڈاکو کی سرکار سے ملتا ہے۔ دین و دنیا کے ایڈیٹر کی خوش فہمی کا راز بھی اُس قریاس الحساب سے آسانی معلوم ہو سکتا ہے جو تبلیغی جریدہ درویش میں چھپا کرتا ہے۔ اور ایڈیٹر پیشوا کے متعلق خواجہ صاحب اور پیشوا صاحب دونوں کی تقریریں خود ہمارے پاس موجود ہیں جسے ظاہر ہوتا ہے کہ نا ماذان حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام روشن کرنے والا یہ گوہر شب چراغ علی بابا کے جتنے کا مستقل رکن ہے اور جس شخص نے اُنکی گندی اور غلیظ تقریریں پڑھی ہیں وہ آسانی اس حقیقت سے آشنا ہو جائے گا کہ مقدس ڈاکو کی بساط شریعت پر یہ ڈھائی گھر بچا نہٹ والا نہر کیا منزلت رکھتا ہے۔ اور یہی صورت تقریباً اکثر مؤیدین و معاونین خصوصی کی ہے جو بجا طور پر علی بابا کے چالیس چور قرار دیے جاسکتے ہیں۔ کچھ لوگ شاید ایسے بھی ہوں جو محض خواجہ صاحب کے دام الہ فریب کا شکار ہوں یا مولانا محمد علی صاحب سے کبھی کا بدلہ نکالنے کے لیے دانستہ اس جاں میں بھیس گئے ہوں۔

خواجہ صاحب نے اگر یہی ارادہ کیا تھا کہ اپنی اشتہار بازی اور مفلٹ سازی سے معمول اڑا کر مسلمانوں کو اندھا بنا دیں گے تو انہیں مناف انٹارکریڈینا چاہیے تھا کہ مذہب ڈاکو نے جو خط مولانا محمد علی کو دیا ہے وہ اُنکا نہیں بلکہ مذہب ڈاکو نے کسی اُن سے زائد چالاک جبل ساز سے اُنکو بہ نام کرتے اور اُٹھنے کی غرض سے لکھوا لیا ہے۔ ممکن تھا کہ خود مولانا محمد علی تھوڑی رو دندج کے بعد اسے بار کر لیتے کیونکہ شیخ منیا، الحن با پوری اپنی مفلٹ بازی کی وجہ سے بہت ہی ساقط الاعتبار ہیں اور بدامچھا بہ نام بُرا کی مشہور نسل کے مطابق خواجہ بیسیے "مقدس بزرگ" کے مقابلہ میں اُن پر اعتماد کرنا آسان نہ تھا۔ اور اگر مولانا محمد علی کو ذرا سا بھی شک پیدا ہو جاتا تو غالباً وہ اس تحریکی اشاعت میں بہت تامل کرتے۔ مگر خدا کی بات خدا ہی جانتے۔ جب پردہ واری کا دور تمام ہوتا اور پردہ وری کا وقت آ جاتا ہے تو چالاک سے چالاک بھرم کی عقل بزدانت جواب دے جاتی ہے۔



عدس ڈاکو کا جو خط مہذب ڈاکو نے مولانا محمد علی کو دیا اسکی عبارت یہ ہے :

۹۶۶

از درگاہ شریف حضرت محبوب الہی - دہلی  
۱۲- اگست ۱۹۱۹ء  
کرمی - سلام علیکم - دو خط پہنچے - ایسی دو چاروں کی اور مصروفیت ہے  
اسکے بعد لکھنے کی کوشش کروں گا - لکھائی کا حساب جیسٹرس دیکھ کر شائع کریں گا -  
کیا عجب ہے کہ گورنمنٹ نے لکھا ہو - میں نے چیف کسٹرز صاحب دہلی سے  
مفصل حالات بیان کر دیے تھے اور نظام کو پان اسلام زمر کے جو سبق دیے  
جاتے تھے اُن کی با منافیہ اطلاع دیدی تھی - اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ  
اُنھوں نے پنجاب گورنمنٹ کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا تھا - (یہ خط بالکل  
خاموشی ہے - اسکو چاک کر دیجیے اور اسکی اطلاع کسی کو نہ دیجیے - یعنی میرے  
اس کام کی خبر سولے آپ کے کسی کو نہ ہو)

حسن نظامی

خواجہ صاحب نے اس خط کی اصلیت یا اسکی تحریر سے انکار نہیں کیا ہے، اس لیے اسکے  
مطالب و منشاء کے بارے میں خواجہ صاحب اور اُنکے چلی چا پڑوں کی حاشیہ آرائیوں کی حاجت  
نہیں رہتی۔ خط یونانی، غیرانی یا قدیم مصری زبان میں نہیں ہے کہ اُس کا مضمون سمجھنا دشوار  
ہو۔ ہر اکر و دو اکر شخص آسانی اسکا مطلب سمجھ گیا ہوگا۔ البتہ اگر کوئی اختلاف رہے ہو سکتا ہو  
تو اس میں کہ یہ مخبری کس کس کے خلاف تھی اور کون کون اس ناوک با سوسی کا بہت بنے۔  
خواجہ صاحب کی تحریر مندرجہ بالا کو پڑھ کر یہ حقیقت سب سے پہلے اور نمایاں طور پر  
سامنے آتی ہے کہ خواجہ صاحب نے چیف کسٹرز کو مفصل حالات سُنا کر با منافیہ اطلاع دیدی کہ  
نظام کو پان اسلام زمر کے سبق دیے جا رہے ہیں۔ سبق پڑھانے والا کون ہے؟ اسکا تحریر  
سات پتہ نہیں ملتا، البتہ پنجاب گورنمنٹ کے حوالہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی پنجاب سے تعلق  
کھنے والا شخص ہوگا۔ مگر مخبری کا راز کھانے دیکھ کر خواجہ صاحب نے اس خیال سے کہ جرم

کی اصلی نوعیت پر شاید پردہ بڑ جائے۔ اس معلم کا نام خود ہی ظاہر کر دیا۔ ظفر علی خاں صاحب  
اپنی سابقہ لغزشوں کی بنا پر قوم کی ایک بڑی جماعت کے منصوبہ رہ چکے ہیں اور اگرچہ بعد کے دور ابتدا  
میں اپنی ثابت قدمی اور مسلسل قربانیوں سے اُنھوں نے بہت لچہ اپنی غلط کاریوں کی تلافی کر رکھا  
لیکن مسئلہ حجاز میں جو اختلافات سنہ ۱۳۲۷ اور سنہ ۱۳۲۸ میں رونما ہوئے اُنکی وجہ سے بہت سے  
لوگوں کو آج بھی اُن سے شدید بیزاری و مخالفت ہے۔ اس لیے خواجہ صاحب نے غالباً سمجھا  
کہ اُنکا نام ظاہر کر کے وہ اپنی شیطنیت کو لوگوں کی نگاہوں میں بہت کم وزن اور اس بنا پر ناقابل  
ملاحظہ بنا دیں گے۔ مگر خواجہ صاحب کو یاد نہیں رہا کہ مغربی کرتے وقت پیش نظر مقاصد کی بدولت  
اُن کا دل نور ایمان سے اور دماغ عقل و ہوش سے قطعاً خالی تھا ایسے وہ ایک ایسے جرم کار کا  
کر بیٹھے جو انسانوں سے ممکن تھا کہ پوشیدہ رہے مگر انسانوں کے خالق سے جو علیم و بے پیر ہے معنی نہیں  
رہ سکتا تھا۔ اور اس لیے اُسکا داغ ابد الابد تک اُنکی پیشانی سے نہ چھوٹے گا۔

خواجہ صاحب نے چیف کشر کے سامنے ظفر علی خاں صاحب پر ایک ایسا الزام لگایا جو  
درحقیقت اگر سچا ثابت ہو جائے تو ظفر علی خاں کی تمام لغزشوں کا کفارہ و کردیگا۔ ایسے کہ کسی  
تاجدار یا راجا کی ریاست کو اخوت و ہمدردی اسلام کا سبق پڑھانا سچا ہے خود ایک ایسی سعادت ہے  
ہے کہ اُسکے محلہ میں خدا کے فضل و کرم سے بہترین نعمتوں کی توقع رکھنا چاہیے۔

خواجہ صاحب نے اپنے بیان میں اور اُنکے جتنے کے لوگوں نے اپنی تحریروں میں اس بات  
کے ثابت کرنے پر ساری قوت صرف کی ہے کہ چیف کشر صاحب سے جو کچھ کہنا گیا وہ صرف  
ظفر علی خاں کے خلاف تھا۔ حضور نظام کی شکایت نہ تھی بلکہ حضور نظام کی بھائی کے لیے عزت  
بھی گوارا کی گئی ورنہ کہاں مقدس ڈاکو کی محترم شخصیت اور کہاں اس قسم کی لمبری و شکایت۔  
خدا خواستہ وہ یا اُنکے باپ دادا کوئی پولیس کے تنخواہ یاب ملازم تو نہ تھے۔ اب یہ محض افتاد  
ہے کہ سنہ ۱۳۲۷ میں ظفر علی خاں سے مقدس ڈاکو محسن اس بنا پر ناراض تھا کہ وہ دعویٰ داران  
تفاوت کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے تھے۔

مگر ان بے نصیبوں سے کوئی پوچھے کہ جو شخص پان اسلامزم کے سبق پڑھانے کو جرم قرار دے  
اُسکو اسلام سے بھی کوئی تعلق باقی رہتا ہے۔ کیا دنیا میں اُس سے زیادہ کوئی بدبخت غارتگر  
ہو سکتا ہے جو خود اپنے مذہب کی بنیادی تعلیم کی اشاعت کو ایک فرنگی کے سامنے جا کر قابل

گرفت قرار دے۔ کیا صریح ہے دینی ولا مذہبیت کے اس مظاہرہ کے بعد بھی حسن نظامی کا یہ منہ جو کہ اُس مذہب کے واحد کے نام کی نہیں کھا کھا کر مسلمانوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلانے کی غرض سے اُن کے گلے پر خود اُنکی سرشت کی خباثت اور نفس کی غداری کے اُتاروں اُلی چھری پھیری جا چکی ہو لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ مسوقت یہ مقدس ڈاکو اپنے آقا سے ولی نہت کے پاس ظفر علی کی شکایت کرتے کیا تھا اُسوقت اسکا یہ منشا شاید نہ ہو کہ رئیس حیدر آباد کو وہ کسی آفت میں مبتلا کرے۔ لیکن اس سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ ہوا وہیں کی بندگی میں اُسکے ہوش و حواس بجا نہ رہے تھے اور جو کچھ اُس نے ظفر علی خاں سے انتقام لینے کی غرض سے دہلی کے فرنگی حاکم کے سامنے گفتگو کی اُسکے عواقب و نتائج پر اُس نے ایک لمحہ کے واسطے غور نہیں کیا۔ اور وہ ایسا کرتا ہی کیوں۔ اُس کا تو زندگی بھر پیشہ ہی سفر کی و عیاری کے سوا کچھ نہیں رہا۔ اُس نے دیکھا کہ ہلمان مذہب و تصوف کے نام سے زیادہ آسانی و فراوانی کے ساتھ بولے جاسکتے ہیں اسیلے اُس نے شروع ہی سے اپنا ہی دھرم بٹا رکھا تھا۔ آج جو کچھ وہ اپنی مدافعت میں کہنے پر مجبور ہے اُس کا سبب تو صرف یہ ہے کہ اُسید کے خلاف دہشت گردانہ کے باوجود یہ تحریر جس پر اسلام ختم ہوا اور نظام حیدر آبادیوں کے خون ناحق کی ہر لگی ہوئی ہے چھپ نہیں سکی اور اخبار سچہ رو کے آفت پر شفقت نہ کر اُسکی خونخواری و غداری کی ایک عالم میں تشہیر کر رہی ہے۔ حیدر آباد سے اپنی برائت کی فکر اگر ہے تو صرف اس خیال سے کہ وہاں سے اُسکو کثیر آمدنی تھی اور اب اُسکا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ہمارا جو کشن پرشاد کی عنایات بے غایات کے باوجود نظام حیدر آباد کی مجبوری کا خون اُسکے چہرہ کو داغدار بنائے رہا تو ظاہر ہے کہ دکن کے بھولے بھالے لوگوں پر اسکا دوا نہ چل سکے گا۔

لیکن درحقیقت اس کا سب سے بڑا قصور یہ نہیں ہے کہ نظام کو یا ظفر علی خاں کو اُس نے نقصان پہنچایا، بلکہ اُس کا اصلی جرم یہ ہے کہ اُس نے خود اسلام سے غداری کی اور ایک غیر مسلم کے سامنے اُس چیز کو جرم و معصیت ظاہر کیا جو ایک مسلمان کے لیے بہترین عبادت و نیکی ہونا چاہیے۔

ظفر علی خاں صاحب کی شکایت سے اگرچہ مقدس ڈاکو نے انکار نہیں کیا ہے لیکن میرزا آباد



کی خیر طلبی کی آڑ میں وہ اس الزام سے بھی بری ہوتا چاہتا ہے۔ اور اسلی تاہم میں فخر یہ کہتا ہے۔  
 ”میں نے مولانا ظفر علی خاں صاحب کی نسبت یہ نہیں کہا کہ وہ سبب بنا رہے ہیں، بلکہ  
 پھانسی دیدو۔ بلکہ یہ کہا کہ انکی محبت معذور نظام کے لیے مفید نہیں ہے۔ یہ کہنا بے بنیاد  
 مولانا ظفر علی خاں کے مالی مفاد کے لیے تو مضر ہو اگر انکو اور کوئی نقصان نہیں پہنچا۔“

موجود مقدس ڈاکو کے نزدیک کسی شخص کو سبب تک وہ پھانسی کے تختے تک نہ پہنچا دے تب تک  
 مخبر می کی لمون حدت پوری طرح سرانجام نہیں پاتی۔ اس سے حضرت محبوب الہی کے ہر مشن کو  
 خواہر نادہ کی خباثت طینت کا اندازہ کرنا چاہیے کہ اگست لکھن کو شہیدانی نقصان پہنچانے اور  
 ریاست حیدر آباد سے نکلوا دینے کے باوجود اسے اپنی بدعتانہ شیطنیت پر شرم نہیں آتی بلکہ وہ  
 ریاست حیدر آباد کا خیر کمال تک اس کو وہ عیب کو بھی اپنے لیے ہنر بنا دیتا چاہتا ہے۔ اور سمجھنا  
 چاہیے کہ اگرچہ ابھی تک یہ امر پردہ خفا میں ہے لیکن اسکو موقع ملتا ہوتا تو اس نے مولانا محمد علی  
 اور دوسرے لوگوں کے خلاف جنگو وہ سچاے خود اسلام کا دشمن سمجھتا ہے اس قسم کی خفیہ غلامی  
 بھی ضرور دی ہوگی جس نے مولانا محمد علی اور دوسرے قومی کارکنوں کو مالی نقصان اٹھانے کے  
 سچاے اپنی عزیز جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے

کہ قبضہ نفس نہ کرو دبا لہا مملوم

ادھر غرض کیا جا چکا ہے کہ چیت کشنر سے شکایت کرتے وقت ممکن ہے کہ مقدس ڈاکو حد  
 نظام کو نقصان پہنچانے کا خواہاں نہ ہو اور یہ زیادہ سن سن ہے جو اس غدار اسلام  
 اور محبہ شیطنیت کے ساتھ روا رکھا جاسکتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کچھ چیت کشنر  
 سے کہا گیا اس سے معذور نظام کو نقصان نہیں پہنچا۔

حیدر آباد کے معاملات پر کچھ ایسے تہ بہ تہ پردے پڑے ہوئے ہیں کہ کم سے کم راقم الحروف  
 کو اس بارے میں کچھ لکھتے ہوئے ضرور پس و پیش ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی نیا واقعہ نہ بھی پیش  
 آتا اور وہاں کے حالات میں آج بھی ویسا ہی سکون ہوتا جیسا کہ چند سال قبل تھا تب بھی  
 یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نظام کو پان اسلامزم کا سبق پڑھائے جانے کی اطلاع کسی انگریز کو دی گئی  
 تو اس سے انگریزوں کے دلوں میں نظام کی طرف سے کوئی بدگمانی اور سو وطن پیدا نہ ہوگا۔  
 ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یورپ کے مابین عموماً اور انگریز خصوصاً پان اسلامزم سے حد درجہ

بیزار اور خوفزدہ ہیں۔ چنانچہ مقدس ڈالوسنے خود اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ  
 ”پان اسلامزم کی تحریک یورپ کی گوری قوموں کو خوفناک ہوا اور گوری قوم  
 کو نکل جانے والا اژدہ نظر آئے گی۔“

جو چیز انگریزوں کے خیال میں کہ وہ بھی گوری قوم ہونے کا فخر رکھتے ہیں، اژدہ نظر آتی ہو اُسکے  
 سین آکر اُسکے کسی یار و قادر کو دے جاتے ہوں اور اُسکی اطلاع ایک ایسا بھڑپو سچائے  
 جو دنیا کو یاد کرانا چاہتا ہے کہ وہ بانی اسلام علیہ السلام کا نواسہ ہے اور اُسکے مقربین بارگاہ سے  
 قرابتِ قریبہ کے تعلقات اختصا صی رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ انگریزوں کے دلوں میں اپنے یار و قادر  
 کی طرف سے حسنِ ظن نہ بڑھے گا بلکہ وہ اگر اپنے یار و قادر کے دشمن جانی زمین مانیں بت کریں  
 اس میں ذرا شک نہیں کہ اُسکے دلوں میں بدگمانی اور خوف کا جاگزیں ہو جانا بالکل یقینی ہے۔  
 اور یہی وہ سب سے بڑی اسلامی خدمت ہے جو مقدس ڈاکو کے اہمقوں انجام پا سکتی تھی۔  
 حسنِ نظامی کا یہ خط بہت مختصر ہے۔ چیف کسٹمر صاحب سے مفصل گفتگو ہونے کا ذکر اس میں  
 موجود ہے اور ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ چند سطروں کے خط میں جب اس قدر زہر بھرا ہوا ہے  
 کہ خود راقم تحریر کی دلی تمنا یہ ہے کہ خط پڑھ کر فوراً چاک کر دیا جائے اور کسی کو اطلاع نہ ہونے  
 پائے، تو مفصل گفتگو میں خدا معلوم غلط فہمی خاں اور حضور نظام کے تعلقات کو کس کس پر ایہ سے  
 بیان کیا گیا ہو گا۔ اور چیف کسٹمر نے پان اسلامزم کے اژدہ سے خوف کھا کر اللہ ہی بہتر  
 جانتا ہے کہ گورنر جنرل اور پنجاب کے ماٹ صاحب کو دونوں کے خلاف کتنا بھرا ہو گا۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

الناظر کے لئے دور میں، جو جنوری ۱۹۲۶ء سے شروع ہوتا ہے، ذاتی افکار و ترادف  
 اور مشاغل کے ہجوم و کثرت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ خواجہ صاحب کے ان کارناموں پر  
 کوئی تبصرہ کیا سکتا جنگی بدولت مولانا محمد علی نے انکو بتلینی راجہ کا لقب عطا فرمایا ہے۔ اسکے  
 معنی: سچے جائیں کہ خواجہ صاحب کی بازیگریوں اور شعبہ بازیوں پر تاری نظر نہیں رہی!  
 خدا خواستہ خواجہ صاحب نے اس عرصہ میں پارسی کی قسم کھائی تھی۔ اب جو یہ سلسلہ پھیر لیا  
 خداوندانے چاہا خواجہ صاحب کے اس نئے اور بلی ہر نہایت کامیاب سوانح سے بھی  
 ”آخرین المناظر و شناس ہو جائیں گے۔ دما تو فیق الالباب“

(الناظر، نومبر ۱۹۲۶ء)

نظارۃ المآثر

۲۲۔ جنوری ۱۹۲۶ء

## خبر و سخن

ہندوستان کے تمام علم دوست مسلمانوں پر شکریہ ادا کرنا اور ان کے بہادر و شہسوارانہ  
مولوی ذکیر اللہ راجہ کی فرمائش پر فرمایا۔ ان کے دلدادہ اور ان کے دلدادہ ہندوستان کے  
ان کے دلدادہ ہندوستان کے دلدادہ ہندوستان کے دلدادہ ہندوستان کے دلدادہ ہندوستان کے  
ذرا بے غمی تاریخ (۱۸) یاغی (۸) طبیبیت (۹) اور (۱۶) خلاق (۶) سیاست  
دل سے (۱۲) ان کتابوں کے دلدادہ ہندوستان کے دلدادہ ہندوستان کے دلدادہ ہندوستان کے  
دو سال میں دو سالوں میں شائع ہوتی ہیں وہ بھی ایک آدمی کے لیے کچھ کم نہ ہوتی۔ اور وہ کے تمام ہندوستان کے  
نصف ہندوستان کے دلدادہ ہندوستان کے دلدادہ ہندوستان کے دلدادہ ہندوستان کے دلدادہ ہندوستان کے  
بہی خواہان اور وہ ہمارے ساتھ مرحوم کی وفات پر اظہارِ رنج اور اذیت کے لیے دعا سے مغفرت کرنے میں  
ہم آہنگ ہونے کے۔ مہینہ مرحوم کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔

خان بہادر مرزا سلطان احمد کے نام نامی سو تمام وہ حضرات جو اپنی انفہام میں جو اور وہ سالوں کو  
کا۔ نہ اسے بھی پڑا کرتے ہیں کیونکہ ہندوستان کے طول و عرض میں شاید بہت کم ایسے سالوں ہوں گے  
جو ان کے نجات قلم سے فیضیاب اور ان کے علمی چشمہ فیض سے سیراب ہوتے ہوں۔ ان کے سالوں میں  
ان کی خاموشی تو یہ ہے۔ چند روز ہو کر ان پر ایک عجیب حادثہ گذرا جسکی مختصر کیفیت اردبین کی گرامی  
نامہ سے اقتباس کر کے درج ذیل کیجاتی ہے:-

"میں نے نوبرستہ کو میاں میں ہالندہ سے لاہور کو روانہ کیا جب ٹرین میں پہلے دن کے مابین دالہ  
ایشین پر پہنچی تو وہاں سے گھر کو پہنچنے کا یہ ہوا کہ بد وقت پڑی اور یہ۔۔۔ سر کے پچھلے حصہ میں بندہ زق کی  
گوئی ہو گئی۔ فوراً اسے دروازہ سے پرچا تو ہمارا کوئی ۳ یا ۴ انچ کے قریب سر کا حصہ ہارم ہوا اور  
سخت درد اس کے ساتھ ہی دیکھا کہ وہ ٹرین میں شیشہ گلاس سے جڑ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد فوراً مجھے  
۱۴ روز تک بند رہ گیا اور بعد اسی۔ آخر میں لاہور آکر اسے اور اس کی شام تک بیمار رہا اور ۴ بجے تک

(لٹاف۔ یکم دسمبر ۱۹۱۱ء)

ورم راجہ



## صمیمہ سر سید مرحوم کی رائے

مولانا شبلی شمسہ ۱۸۹۷ء میں سفر نامہ کی ترتیب میں مشغول تھے کہ منشی سراج الدین احمد صاحب  
ادیشرفیو میں صدی نے سیرۃ الفاروق لکھ کر شائع کر دی۔ چنانچہ سید صاحب نے اپنی مکتبہ میں منشی  
سراج الدین احمد صاحب کی پیش قدمی کے متعلق حسب ذیل مثنوی شائع کیا۔  
”وہیں کچھ شبہ نہیں کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف  
سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے، الامامون، سیرۃ ہنگام، مکتبہ انہ اسلندریہ اور لڑیہ  
بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں، اور اگر وہ لغو ذبا شد اپنے زمانہ تجزیہ کی نسبت مسئلہ نو کو  
مخاطب کر کے یہ کہیں کہ، ”فالو ابسور تہ من مسئلہ“ تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔“

## صمیمہ جرمن مستشرق کی رائے

علامہ اور مصنفین ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہے، اول ادا تحقیق و تدقیق  
دوم جانچ پر تالی، سوم جدت، چارم استحکام رائے، اور فوت ہند مال علماء و اور مصنفین ہند کو متوجہ تو  
بیشک زیادہ زور دار ہے لیکن انہیں مبالغہ کی عادت ہے انکی تاریخی حکایات اور جنگی انسانے ساتھ  
اور متفاد خیالوں سے پر ہیں برہنات انکی اہل مغرب کے داغ منطقی استدلال اور سوزوں اور درست  
انفاذ استعمال کرنیکے عادی ہیں۔ اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی  
تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف میں ملے

صمیمہ  
علامہ شبلی کی تحریر اردو نثر کی معراج ہے (اقبال)

صمیمہ  
زبان اردو کی خدمات  
انجمن ترقی اردو

مولانا جب تک علی گڑھ میں رہے، ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے اپنے ضلیع کے میز پر  
کے علاوہ کوئی عام قومی خدمت نہ کر سکے، ندوہ کی خدمات کیلئے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی  
لیکن خانگی مجبوریوں کی وجہ سے چند روز کیلئے حیدر آباد کی ملازمت پر مجبور ہو گئے، تاہم اب انکی  
عام قومی خدمات کا سلسلہ شروع ہو گیا جسکی پہلی کڑی انجمن ترقی اردو تھی، چنانچہ جب محمدن  
کانفرنس میں پہلی بنیاد ڈالی گئی، تو مگر ڈی سب کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا اور مولانا نے ایک  
دست تک کے فرائض اکیسے اہر رٹ اسپر کی کتاب۔ یہ جو کیشن کا ترجمہ مولانا ہی کے زمانہ میں ہوا۔  
۱۵ حیات شبلی کے افکار

اسکے علاوہ اور بھی متعدد کتابوں کے ترجمے ہوئے لیکن مولانا کو جیسا کہ اب کا خود بیان ہوا نظر آیا کہ وہ انجمن کا کام اپنے بلند معیار کے مطابق انجام نہیں دے سکے اسلئے انھوں نے اس جملہ کو دیانت کے غلات سمجھا اور مستغنی ہو گئے۔

### ورنا کیولرا سکیم کمیٹی الہ آباد اردو کو ناگری ہونی سے بچایا

سنہ ۱۹۱۳ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ورنا کیولرا سکیم کمیٹی قائم کی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ سکولوں اور کالجوں میں ویسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اردو ہندی دونوں زبانوں میں ایک ہی عبارت و الفاظ کے ساتھ پڑھا جاسکے نیز اردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی قدری قرار دیا جائے مسٹر برن جیٹ سکریٹری نے اس کے متعلق ایک اسکیم مرتب کی تھی، جسکی دفعہ ۴ و ۵ میں اس تجویز کو تائید میں حسب ذیل دلیل قائم کی تھی:

اردو زبان اور ہندی زبان دراصل ایک ہی زبانیں ہیں، کیونکہ انکی گرامر متحد ہے اور جن زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے، وہ زبانیں دراصل ایک ہی ہوتی ہیں اس بنا پر ورنا کیولرا کورس ایسی مشترک زبان میں بننا چاہیے، کہ صرف رسم خط (کیرکٹم) کے فرق سے وہ اردو اور ہندی دونوں میں پڑھا جائے،

لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اسکی نظم و نسق گرامر مختلف ہے اسکی ہندی نظم کی گرامر کی واقفیت اور عبارت کیلئے رامائن تلہی داس کورس میں داخل ہونی چاہیے چند دن کیلئے وہ لازمی کر دیجاسے اور مسلمانوں کیلئے بھی بھلا پڑھنا مناسب ہوگا۔  
مولانا سے مرحوم بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے اس موقع پر اردو زبان کے تحفظ و بقا کیلئے انھوں نے جو یادداشت مرتب کی تھی معارف میں شائع ہو چکی ہے،

### مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام

کرمی تسلیم میں ہمارے ورنا کیولرا سکیم کمیٹی کی شرکت کی فرض سے الہ آباد گیا تھا، مسٹر برن نے چند نہایت مضرت خیز چیزیں اردو کے حق میں پیش کی تھیں، ایک یہ بھی تھی، کہ رامائن بھاشا انٹرنس کے امتحان میں لازمی کر دیجائے اور اردو وجود اس میں ہر وہ ایسی کر دیجائے، کہ ہندی بن جائے، عجیب منطق و لائق کٹھن تھے، پنڈت سندھال و غیرہ کمیٹی کے ممبر تھے، تیسرے جلسہ میں کال فتح ہوئی، تمام تجویزیں اڑ گئیں اگرچہ انھوں نے کہ مسلمان ممبروں نے کوئی مدد نہ کی اور دیتے کیا دینے کے قابل بھی نہ تھے،

”شیل“

(الناظر، ۰۰۰)

## لیکھ خط

(میں کے مشق فی الحال کوئی رسلہ ظاہر نہیں کی جاتی)

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ انناظر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ وسیع خبر حال کا رسالہ انناظر  
میں نے پڑھا۔ مقدمہ فلسفۂ اجتماع، پڑھنے کے دوران میں (صفحہ ۴ پر) وہ واقعہ نظر پڑا  
جو شمس العلماء مولانا ذریعہ احمد صاحب مرحوم کے رسالہ اہمات الامہ کے متعلق ہے۔ مجھ کو  
حیرت ہوئی کہ ایک فلسفہ کی کتاب میں واقعہ اس قدر بے تحقیق درج کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے  
کہ جب واقعات صحیح نہ ہوں گے تو نتائج بھی غلط نکلیں گے۔ چونکہ میں اس واقعہ کا اپنی  
شائبہ ہوں اور دل سے آخر تک حصہ لینے والا میں تھا۔ نیز ایک ایسے نامور کی ذات پر ہر  
آنا ہے جو آج دنیا میں نہیں ہے۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں  
سے دیکھا ہے وہ قلمبند کر دوں تاکہ تیند و غلطی سے اہل قلم محفوظ رہیں۔ اس سے پہلے  
بھی بعض مشہور نامہ نگار اس واقعہ کو ادبیانہ رنگ آمیزی سے لکھ چکے ہیں۔ مگر افسوس ہے  
کہ مورخانہ تحقیق انہیں بھی نہ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ جب اہمات الامہ شائع ہوئی تو اسکے بعض مقامات پر نہ صرف علما  
بلکہ اور اہل نظر کو بھی سخت اعتراض تھا۔ اسی بنا پر بعض علما نے تکفیر مولف کے نوٹس شائع  
کیے۔ اسپر شورش ہوئی جو کچھ ہوئی۔ اسکے بعد بعض اہل فہم کے سمجھانے سے مولف مرحوم کو  
اپنی غلطی پر تائب ہوا اور اُنہوں نے اعتراض کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی جس کو اب میں واپس  
لیتا ہوں۔ اسی بنیاد پر اُنہوں نے کام نئے رسالہ ذکر کے (جو ان کے پاس موجود تھے) اُن  
صاحب کے سپرد کر دیے جن کے سامنے اعتراض کیا تھا۔ مرسالے شائع ہو چکے تھے (اُن کی  
تقدیر نوٹس تھی) اُنکی لہرست دیدی اور اپنی طرف سے اجازت دی کہ وہ خریداران



(اگر لیس ہو تو) واپس لے بیے جائیں۔ یہ بھی خواہش کی کہ اُنکے اعتراض کا سلفوں کے کسی عام مجمع میں اعلان کیا جائے (مثلاً مسجد کو جامع مسجد میں) اور تمام رسالے تلف کر دیے۔ ابھی رسالے تلف نہ ہونے پائے تھے کہ ندوۃ العلماء کا اجلاس سالانہ شہر دہلی میں ہوا قرار پایا۔ شمس العلماء مرحوم کی اس وقت باصرانہ خواہش ہوئی کہ ندوۃ العلماء میں جو علماء تشریف لائیں اُنکے سامنے یہ معاملہ پیش ہو کر طے ہو اور علماء سو سوٹ کی جانب سے یہ اعلان ہو کہ رجوع کے بعد مولف رسالہ کے ذمہ کوئی الزام نہیں رہا۔ یہ واقعات میں نے مستند ذریعہ سے سنے ہیں۔

برتنائے خواہش بالا اجلاس ندوۃ العلماء کے فائزہ پر مشہور علماء کا ایک جلسہ کیا گیا (جاں سے واقعات میرے چشم دید ہیں) اس میں مستند شہادت پیش ہوئی کہ مولف رسالہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے منفا میں رسالہ کو واپس لیا اور رسالے تلف کرنے کے واسطے حوالہ کر دیے۔ یہ پیام سن کر علماء حاضرین نے بالاتفاق (جہاں تکاب بھکویا دے) مولف رسالہ کی برأت نکلی اور طے کیا کہ اب اُنپر کوئی الزام نہیں۔ اس تحریر کے بعد شب کو تمام رسالے جا کر تلف کر دیے گئے۔ میلانے کے بعد آمد سی آئی اور منیہ برسا۔ ہوائے خاکستر کو اڑا دیا اور پانی تے زمین دھو کر صفات کر دی

جس مجمع علماء میں برأت نامہ لکھا گیا اُس میں علامہ غلی مرحوم موجود نہ تھے نہ اُنکے دستخط برأت نامہ پر ہے۔۔۔ اُنھوں نے کتابوں کے تلف کرنے میں حصہ لیا۔

میں تیار ہوں کہ اگر کسی صاحب کوشک ہو تو معتبر شہادت سے واقعات اثبات کر دوں۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ اگر مولف مرحوم رضامند نہ ہوتے تو رسالے کیوں حوالہ کر دیتے۔

بیان بالا سے واضح ہو گیا ہو گا کہ علامہ غلی کے متعلق جو کمزوریاں معنوں المناظر میں ظاہر ہو گئی ہیں اُن کا دامن اُن سے پاک تھا۔

بازمند حبیب الرحمن شروانی

# ”ایک خط کے متعلق کچھ عرض

جناب میں

آپ کے رسالہ کے جنوری نمبر میں مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب سرمدان نے مولانا شبلی کے متعلق ایک واقعہ مندرجہ ”فلسفہ اجتماع“ کی تالیف فرمائی ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں مختصر آداب میں کہنا ہیں:-

(۱) نفس بشری کی نیرنگی و لونِ نظری سے متعلق مجھے جس حد تک ہتھیار کرنا تھا، وہاں تک وہ واقعہ بالکل صحیح ہے۔ اور یہ میں خود مولانا شبلی کی روایت کے اعقاد پر کھرا ہوں۔ مولانا مرحوم نے سلسلہ میں یہ واقعہ خود مجھ سے بیان فرمایا تھا، اور مجھے اُنکے بیان کے بعد اسکی صحت کے لیے کسی مزید شہادت کی ضرورت نہیں۔ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب بہ حیثیت شاہِ عینی اور اس واقعہ میں اول سے آخر تک حصہ لینے والے کے، اس کے جو کچھ جزئیات و تفصیلات تحریر فرماتے ہیں، وہاں تک کہ بنیادِ تحقیق وہ کتابوں کے جلاسے جانے کے بعد، آدھی کے آنے، اور مینو کے برسنے، ہوا کے خاکستر کو اڑا دینے، اور پانی کے زمین کو دھو کر صاف کر دینے، تک کو نظر انداز نہیں فرماتے) وہ سب حزن بہ حزن بھیج ہوں گے۔ لیکن ان سے مجھے کچھ واسطہ نہیں۔ میرے مقصد کے لیے صرف اتنی حقیقت بس کرتی ہے، کہ ”کتب خانہ اسکندریہ“ کے مصنف نے ان کتابوں کی بربادی میں تائید و اعانت کی۔ اور اسکے راوی کوئی زید و عمر نہیں، بلکہ خود مصنف و موصوف تھے۔

(۲) مولوی صاحب کمر غور فرمائیں، تو انہیں خود نظر آجائے گا کہ جن الفاظ میں ادبِ حیثیت سے یہ واقعہ ”فلسفہ اجتماع“ میں منقول ہے، اُن سے مولانا مرحوم کی امانت کا کوئی خفیف پہلو بھی نہیں نکلتا، بلکہ وہ تو انکی عظمت کا عین اعتراف ہے۔ مقصود یہ دکانا تھا کہ دنیا کی بڑی بڑی انسانی ہستیاں بھی انسانیت کی نظری کمزوریوں سے پاک نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر

سقاط۔ مولانا تہل و غیرہ کی زندگی سے ظاہر ہے۔ اگر طرز بیان بھی اہانت آمیز ہے، تو میرے تو میرے نہیں جانتا کہ اعترافِ عظمت کے لیے کیا اسلوب اختیار کرنا چاہیے۔ مولانا مرحوم سے مصنف "فلسفۂ اجتماع" کو عقیدت و شینگلی تھی، اُسے وہ ج سے پانچ برس پیشتر انھیں صفحات میں قافط کی زبان سے یوں ادا کر چکا ہے :-

ما شق روسے تو صاحب نظرے نیت کو نیت

منبت خاک و دت بر لبیرے نیت کو نیت

اور مولانا کی وفات بے ہنگام نے اس جوشِ عقیدت کو بجائے صنف کرنے کے اور قوی کر دیا ہے۔ البتہ وہ انکی ملی یا اخلاقی معصومیت کا کبھی قائل نہیں رہا۔ اور یہ ایک ایسی دلع ہے جس کی تردید کے لیے ہمارے کرم مولوی صاحب موصوف بھی قلم اٹھانا نا بابا غیر ضروری خیال فرمائیں۔  
۹۔ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ  
عبد الماجد

(الناظر، فروری ۱۹۱۶ء)



# تکلم

قلم کو نیزے کی بجائے، اور چاقو کو تلوار کے عوض، لینے کی حماقت یا دوراندیشی کا ارتکاب  
 چھڑے تین چار پشت پہلے میرے مرحوم آبا و اجداد سے سرزد ہوا ہو گا! میں نے آنکھیں کھولیں  
 تو نیزہ و تلوار اپنے قبضہ قدرت سے بہت دور پایا! مجبوراً تلک و دوات ہی میری ساخت کے لیے  
 احوال بنتی رہی!

میرا حافظہ بتاتا ہے کہ میں نے بذاتِ خود اپنے جوشِ جذبات کا اظہار تسلیم کے ذریعے سے چند  
 احبابِ ہمت انسز کی تاکید و تاویز پر طلیغ کا لچکے کے حدودِ درجہ میں رو کر سب سے پہلے "عسزن"  
 کے صفحات پر کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ شبِ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر اور شیخ محمد اکرام صاحب (جو  
 اس وقت تک بیرسٹر نہیں تھے) مجزن کو ہر لحاظ سے دلفریب، نظر فریب، اور کامیاب بنانے میں بہت  
 کچھ راستے طے کر چکے تھے! مضمون نگاری نے اس وقت تک میرے دل و دماغ میں ایک مستقل مرض  
 کی صورت اختیار نہیں کی تھی اور میں کبھی کہہ مارا اس شکایت میں آج وہ ہو اکی نامساعدت سے مبتلا  
 ہو جا یا کرتا تھا! اسکے بعد تمدن کی پیدائش اور میرے عنایت ذرا عبدالرشید صاحب انجیری کا  
 اصرار اس شکایت کے المذاہف ہو جانیکا باعثِ ہوسے! اسی زمانہ میں بدقسمتی سے "السنائل"  
 نے بھی اپنا اثر عجیب و غریب شروع کیا! ایک عرصہ تک غالباً عرصہ دراز تک، "السنائل" کے قلم تسلط  
 کیلے والے ایڈیٹر مولوی آغا علی صاحب ظفر الملک نے مجھے فرصت سے نہ بیٹھنے دیا! میرا خیال ہے  
 کہ وہ شہادت ان حضرت کے بدولت مرضِ کمنہ بن گئی! اب مجھے بذاتِ خود، فرصت کے اوقات  
 سکھائے آرام کے لگے اس ابر ویزان بکواس میں میں نصابِ کزایط سے نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر کے بعد میں

تپ کے تیسرے درجہ تک پہنچ گیا، اب اگر لکھنے کو کچھ زمانہ ملتا تو دماغ گواہ گواہیاں اور چاہیں ان  
آنے لگتیں! متعدد رسائل اس طوفانِ طاعت کے زمانہ میں میری بکواس کے شکار بن گئے اور یہ  
مرض ایک ہلکے صورت لیتا رہا!

مجھے فی الحقیقت اپنی فطری سوانحی لکھنی مقصود نہیں ہو بلکہ صرف یہ اظہار کرنا ہے کہ قسمت کبھی کیسی طرح

اسی عرصہ میں مجھے ایسی بندش میں پانچھ دیا جو مضمون نگاری کا بار خرافات کسی طرح نہیں اٹھا سکتی!  
مجبوراً دست کشی کی کوشش میں مبتلا ہوتا ہوں اور یہ ہزار وقت لکھو اس کی وہ رمل پیدا ہوتی ہے  
تحریک کو گھوٹتا ہوں کسی قدر کامیابی حاصل ہوتی ہے کہ عزیزم مضر وحید احمد وایت سے  
واپس آکر نقیب کو جو دین لاتے ہیں! اب جس قدر فائدہ خاموشی کی بدولت ایک عرصہ سے  
رفتہ رفتہ ہوتا چلا تھا، وہ سب مضر وحید کی خید کے نذر ہو جاتا ہے اور نقیب کے صفحہ ستو بار بار  
مجھے کانے کرنے پڑتے ہیں! اس ناگوار بد پرہیزی سے ظاہر ہے کہ مرض کہنہ اذیر نو عود کرتا ہے اور آثار  
ہمایت بُرے نظر آنے لگتے ہیں! اہل انظار! کہکشان "اور مخزن" ہر طرف سے شکایات کا دار شروع  
ہو جاتا ہے! میں سکتے کے عالم میں ہو جاتا ہوں "خدا یا! کیا عذاب آیا؟"

بظاہر اس مرتبہ جانبری کی مطلق امید نہیں رہتی کہ "نان کو آپریشن" کی صدامت کے ایک ایک  
گوشہ سے گونج اٹھتی ہو! میں اس کو سمجھتا ہوں تو کچھ طعناں بنتی ہیں اور ظفر الملک صاحب کی شکایات  
کا جواب دینے بیٹھ جاتا ہوں! چونکہ الاناظر مجھے اور زیادہ ہمت بخشتا ہے، جب میں کہ "نان کو آپریشن"  
کے معنی ترک تعلق کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں! اس میں آپ کو بھی شک نہیں ہو سکتا کہ با دا آدم  
اگر "نان کو آپریشن" پر عامل ہوئے تو یقیناً آج اُن کی ذریات خلد برہن کے حدود اربعہ کے  
اندر خالص سونٹنی میوڈن اور دودھ کی نہروں سے فائدہ حاصل کرتی ہوتی!

نان کو آپریشن کے معنی کیا ہیں؟ . . . . . مجھے معلوم نہیں! ممکن ہے، ترک تعلقات ہیں

تیرک حیوانات ہوں ترک اہیات ہوں، یا مرگ مفاجات ہوں! اعلیٰ دنیا میں اس کا مقصد ہے  
کہ اگر آپ پاٹ دار آواز رکھتے ہیں تو بھی برسات میں طہار نہ گالیں! اگر تیز نظر ہوں جب بھی اچھی  
دور سے کو جان بوجھ کر نہ دیکھیں! اگر حجام ہوں تو دسے زیبا کی صفائی سے دست بردار ہو جائوں





تھی! ایرانِ قدیم اس پر بھی شاکی بیتِ قومین پر چھتا ہوں کیا کروں؟ جو لکھنا چاہتا ہوں نہیں لکھ سکتا۔ اور جو کچھ لکھ سکتا ہوں وہ لکھنا نہیں چاہتا!

تجسس مختصر! جون کا الٹا نظر الملک صاحب کی تعلق میری نظر سے گزر رہا تھا! دیوانہ راہِ دوست فوراً صبر و سکوت کی امید ہو جاتی ہے! سچتا ہوں میں بھی "ترکِ قلم" کیوں نہ اختیار کروں۔ اس میں "بیک کرشمہ" کا رکا نیچہ مضمر ہے! سب سے پہلے آئی کٹاکرشمہ دونوں میں داخل دیکھو آگے دن لقاضوں سے نجات! دماغ تائیڈ کرتا ہے، دل تیار نظر آتا ہے، اور میں فوراً غرت کے ساتھ قلم سے دست کش ہو جاتا ہوں!

اب میں بھی اعلان کر سکتا ہوں کہ میں اس مرضِ کمند سے افادہ مستقل کر چکا! میرا ارادہ ہوا کہ میں اپنی تصنیفات والیفات کے جملہ حقوق، نظر الملک صاحب کی تقلید میں اپنی اہلیہ صاحبہ کے نام منتقل کروں مگر کسی طرح اُس کی اہل نہ نظر آئیں اور مجبوراً مجھے تمام حقوق اپنے نابالغ لڑکے کے نام زبانی طور پر سپرد کرنے پڑے۔ اچانک وہ ابھی کمسن اور نابالغ ہے، ایسے اُسکے متعلق جملہ خط و کتابت بنائے "بڈا پیر نقیب" ہونی چاہیے جو بطور سینئر کل معاملات کا بار اٹھائیں گے۔ آئندہ کوئی صاحب سہوا یا احیاناً مضمون لکھنے کو متعلق رہتسم الحودت کو تحریر نہ فرمائیں خصوصاً مولوی نور الرحمن صاحب جنہوں نے بقول نظر الملک صاحب یاد دہانی کے خطبہ کی بوجھار شروع کر دی ہے اور جب ہرگز نہیں نہ لیں گے! "اس آخری فقرہ کی وجہ سے مجھے "ترکِ قلم" کا اعلان کرنا پڑا۔ امید ہے کہ تمام رسائل اسے بقدر حاجت نوٹ کر لیں گے!

آباد اعداد کے ترکِ شمشیر سے قلم پیدا ہوا۔ کیا اب میرے ترکِ قلم سے کبھی بچہ دہی . . . . .  
لا حول ولا قوۃ! این خیال ست و محال ست و جنون!!

سلطان حیدر (پوش)

(الناظر، ستمبر ۱۹۲۱ء)

## کیٹرف خنگ

خدمت ایڈیٹر صاحب الناظر۔ السلام علیکم۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں راجسٹر کی بنیے میڈر آباد  
 یہی 'بھوپال' باندہ وغیرہ کے سفر میں رہا۔ اٹھارے سفر میں وہ مختلف مقامات پر مختلف مسافروں  
 نے 'مین سے عین اسی وقت تعارف ہوا تھا، مجھ سے فرمایا کہ آج کل آپ سے اور تیار  
 صاحب سے تو خوب چل رہی ہے۔ میں اس کی طرف "جنگ" سے منس "واقعہ تھا، اس لیے  
 سات انگلوں میں میں نے عرض کر دیا کہ "تھار سیرے پاس نہیں آتا، اس لیے مجھے کچھ خبر نہیں  
 کہ اس میں کیا لکھا جا رہا ہے۔" سفر سے واپس آیا ہی تھا کہ کل آپ کا انظر بابت ہو رہی  
 نظر آیا جس میں جناب زبید احمد صاحب کا معنون اسی موضوع پر پڑا کہ اور بھی حیرت ہوئی۔  
 یہ زبید احمد صاحب کون ہیں؟ مجھ سے ان سے تعارف الگ رہا، شاید مراسلت بھی  
 کبھی نہیں ہوئی۔ مرث اتنا یاد آتا ہے کہ تعارف میں ان کا ایک معنون شاید غار کے اوقات بڑا  
 کی تائید میں پڑھا تھا اور اس وقت انکی دینداری سے دل خوش ہوا تھا ان پیار سے نے دنیا  
 سے بیٹھ کر میری جو اس قدر حمایت و کالت فرمائی، اسکا چاہیے تو تھا جیسے شکریہ ادا کرنا، لیکن میں  
 ایسا نا شکرا، کہ بجائے شکریہ کے اٹلی اُن سے شکایت رکھتا ہوں، کہ ایک غیر ضروری و لا حاصل  
 معنوں کی تحریر میں انہوں نے اپنا وقت عزیز کیوں ضایع فرمایا۔ مَن تلمن کے جوش میں میرے متعلق شدید  
 الفاظ اور نفرت سے وہ ایسے بھی تحریر فرماتے ہیں، جنہیں پڑھ کر بجز اس کے کہ میں نہایت سے کٹ جاؤں  
 اور کوئی نتیجہ نہیں۔ اُنکی خدمت میں مخلصانہ گزارش ہے کہ ازراہ کرم وہ چلاک میں آئندہ ایسی تحریر کیا  
 میرے متعلق پیش فرمائے سے تلقاً احتیاط و ترانہ فرمائیں اور اگر ایسی ہی اُنکی عنایت و محبت میرے  
 ماتہ ہے تو جو کچھ کہنا ہے، بجا سے بندوں سے کہنے کے بندوں کے پروردگار سے اپنی دعاؤں کا

اور التجاؤں میں عرض کر دیا کریں اور بجائے حضرت نیاز سے مخاطب کے "ذات بے نیاز" کی  
 ! ارگاہ میں اپنی عرض و سرور میں کو باری رکھیں یہ ختمے اُنکے ہیں اثناء اثناء کام آگئی اور میرے بھی۔  
 اسی سنوں سے مجھے علم ہوا، کہ کوئی صاحب عبدالملک لکھنؤ سے ہیں اور شاید انہوں نے بھی  
 کبھی نگاہ میری ہمدردی فرمائی ہے۔ میں ان صاحب سے ایسی اسناد لیتا ہوں، لیکن اُن کی  
 خدمت میں ابھی میری بعینہ ہی استدعا ہے، جو جناب زبید احمد صاحب سے میں ابھی کر چکا ہوں۔

الٹا نظر کے اسی سنوں میں نیاز صاحب کا یہ فقرہ میرے شائقِ نقل ہوا ہے :  
 "میرے سامنے اُنکی کوئی خدمتِ ملک و قوم، دین و علم ایسی ہو نہ نہیں جیسی بنا ہوا  
 مجھ سے مطالبہ میرے مجز کے متبکا دینے کا کریں۔"

! الغرض کوئی ایسی خدمت ہو جو ہوتی جب بھی مجھے اس قسم کے مطالبہ کا ہرگز کوئی حق کسی شخص سے نہیں  
 پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اس سے قطع نظر کر کے نیاز صاحب نے بات ہی بالکل سچی ارشاد فرمادی ہے۔ زبید احمد صاحب  
 اپنی غلط فہمیوں کی بنا پر جو رستے چاہیں قائم کریں، لیکن میں اُس بندے سے قیوم کو گواہ کر کے جو اُنکے  
 اور میرے سب کے دلوں کے اسرار و خفا سے واقف ہے، کہتا ہوں، کہ میرے علم و یقین میں بات یہی بالکل  
 وہی ہے، نیاز صاحب نے فرمائی ہے۔ میری کوئی خدمت بھی ہرگز قابلِ ذکر نہیں، اور یہ جو زبید احمد صاحب  
 سب سے سادہ مزاج بزرگوں کے دلوں میں محبت پیدا ہوئی ہے یہ محض اشد کائنات و کرم ہے جس میں  
 میرے کسی استحقاق کو قطعاً کسی طرح کا دخل نہیں

مضمون میں تنکا رکھی جو اور عبارتیں نقل ہوئی ہیں، اُن سے مترشح ہوتا ہے، کہ نیاز صاحب  
 کے نزدیک میں اپنے ستموں، عجب و غرور، برتری و تفوق کے جذبات غلبہ کر رہا ہوں ! استغفر اللہ  
 ثم استغفر اللہ ! اس سے بڑھ کر بے بنیاد خیال اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنے گہرے امراضِ انسانی  
 اکثر خود مرئیں کی نظر سے مخفی رہتے ہیں۔ اگر فی الواقع میں عجب و غرور کے مرض میں مبتلا ہوں، تو  
 خدا سے کریم سے یہ الحاح و تضرع عرض ہے، کہ اس مرض سے نجات دے۔ باقی اگر نیاز صاحب  
 کے پیش نظر سچ بلکہ غیرہ کی وہ عبارت ہو، جہاں یہ لکھا گیا ہے، کہ مرض کی وہ اسکے لیے بمبیب  
 کے پاس جاتا ہے، نہ کسی دکیل اور ہر شے کے پاس۔ اور اس سے، لکھنؤ میں یہ نتیجہ نکلا، ہے  
 کہ میری سچ اپنے کو طبیعوں (دین و مذہب کے اہلین) کے ذمے میں شامل کرتا ہے، تو نہ تاثرِ ناشائستہ  
 یہ نتیجہ نکلا، نہ کسی وطن سے صحیح نہیں۔ ہر شے بہت ممکن ہے کہ اپنے علم و کمال کے ذمے میں، اُنکے سے



کچھ اٹنی پٹن دو انیس بتا دے، لیکن ایک شخص نے اڑی شخص اپنے جن کا اعتراف کرتا نہ تھا  
 اور بہت ملن ہے کہ وہ کسی مستعد طبیب کی بیاعتن سے کوئی نسخہ نقل کر کے مریض کو دے دے اور  
 بد تصنع، اور بغیر شائبہ طنز و تعریض عرض کرتا کہ علم و ادب دین و سیاست کسی شئی سے  
 یہی حیثیت اس ناٹھی سے زائد نہیں۔ جو اجاب کرام مجھے نیاز نہ سب یا کسی مناسب  
 کے مقابلہ میں پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز میرے اوپر احسان نہیں کرتے بلکہ میرا ظلم کرتے ہیں  
 اتنی طور پر مجھے کسی صاحب سے بھی ہمسری کا دعوت نہ ملتا تھا۔ اپنی بے کمالی اور اپنی نا  
 سے میں جو رقتا واقعت ہوں، کاش اس کا مشترک شریک زبید احمد صاحب یا ان کے ہنپال  
 واقعت ہو سکتے۔

البتہ دین کی توہین و تحقیر کا سوال، دسرا ہے۔ جب کہ کسی ایسی کوئی صورت میرے علم میں  
 آئیگی اور مجھے ملے اور وہ سے دین کی حفاظت کی ضرورت محسوس ہوگی تو اس وقت اللہ  
 مقابلہ کریں گا، اور پوری بے جگری سے مقابلہ کر دے گا، خواہ دنیا کی ہر دلی زمین ہو،  
 خواہ نیاز نہ صاحب اور ظلم صاحب کی طرح اپنی ہی جماعت کا کوئی شخص۔ اس کا افسوس کہ  
 میری بے کمالی، رونا ہلی کے احساس و اعتراف سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ السلام

عبد الماجد

دریادار۔ ۱۴ فروری ۱۹۲۹ء

(الناظر، فروری ۱۹۲۹ء)

# آہ! شیخ ممتاز حسین عسکری

(جناب سید حقیق احمد جعفری صاحب خیر آبادی)

آج لکھنؤ اُبھو گیا ہے، اس کی خصوصیات مٹ گئی ہیں پھر بھی وہ ہندوستان کے دوسرے مقامات کی بہ نسبت اب تک کسی نہ کسی حیثیت سے کوئی نہ کوئی مقامی اقدار رکھنے میں ممتاز ہے۔  
 ”نئی دہلی“ کی طرح یوں تو لکھنؤ بھی اب ایک نیا لکھنؤ ہو گیا ہے لیکن پھر بھی اس کا ایک حصہ پُرنے لکھنؤ کی جہاں اب تک دکھلا رہا ہے۔

ہونے کو لکھنؤ میں حضرت گنج بھی ہے اور امین آباد بھی لیکن لکھنؤ جسے کہتے ہیں وہ اہل میں اس کا چوک ہے اجوائی پتلی پتلی گلیوں، در در یہ بڑی بڑی عمارتوں اور گنجان آبادی کے سبب آج بھی لکھنؤ کی نائندگی کر رہا ہے۔

لکھنؤ میں سنگ باریٹ میڈیکل کالج اور نواب آصف الدولہ کے امام باڑہ کا پاس پاس ہونا بھی ایک عجیب لطیفہ ہے۔ کالج اگر انگریزی تسلط کی درستان ہے تو امام باڑہ اپنے سابق ادولہ العزم فرمانروا کی شاندار روایات کا ترجمان !!

ہندوستان میں، مشرقی تمدن کے آخری نمونے ”لکھنؤ“ کی مذہبی سیاسی اخلاقی اور معاشرتی خصوصیات اب بھی دوسرے مقامات کی بہ نسبت آسانی سے تیز کی جاسکتی ہیں۔  
 ہندوستان بھر میں اسلامی علوم کے مراکز ہل کے اور سرے اور عصر ہر گئے لیکن ”فرنگی محل“ اب تک بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے۔

اُدو کی وہ شاعری جو بادشاہوں کے سانس میں پردیش پارہی قس سلطنت کے ساتھ ختم ہو گئی۔  
 لکھنؤ میں اب بھی ”نہیں کا خاندان“ بدستور شاعری کا کوس من الملکی بہار رہا ہے۔

طب ایرانی نے طب اسلامی کا چولہ بدل کے ترقی کے مجب مجب کرشنے دکھلائے اور ہم ٹیٹ  
ہندوستانی بن کے اپنے تنزل کی داستان میں دنیا کو سنا کر "جھوٹی لڑکھائی" میں اس کا طوطی اب بھی ہمیشہ  
کی طرح داد و تحشہ امانی دے رہا ہے۔

لکھنؤ کی وضع قطع اور اس کی تراش و خراش آج بھی وہی خصوصیت اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے  
جس کی بنا پر لکھنؤ کو سب کا طوطی سے ہندوستان کا پیرس کہا گیا ہے۔

اور تو اور لکھنؤ کا خرچہ بھی لکھنؤ کی نہاری کی طرح لکھنؤ ہی کے لئے قدرت کی طرف سے اب تک  
خصوصیت ہے۔

لکھنؤی بھٹی کی یہ ہمدست آفریں تاثیر پھر بھلا زبان پر کہاں تک نہ اثر انداز ہوتی چنانچہ بھٹی اور  
جی بھر کے بھٹی۔

دہلی کی گلیوں میں، پنجابی کی آمیزش سے، اردو کی جو خاک اڑ رہی ہے وہ اس بات کا گویا ایک  
اور ثبوت ہے کہ لکھنؤ اس گلی گزری حالت میں بھی چند در چند خصوصیات کا رکھتا ہے لکھنؤ میں آج بھی  
ہنگامی زبان آمیزش سے پاک اور مستند ہے۔

لکھنؤ کی زبان! اللہ اللہ! یہاں کے خواجے داسے تک اپنے فصیح و فہم لہجے کے لیے مشہور  
ہیں۔ دہلی اسکول، اگر اپنی صاف سادہ اور جذباتی زبان کی خصوصیت پر نازاں ہے تو لکھنؤ کو یہ فخر  
ہے کہ اس نے دہلی کی اس خصوصیت میں شرفی اور رنگینی کے امتزاج سے دہلی اسکول میں چار پانچ نکات  
اردو کے ایک نئے اسکول "لکھنؤ اسکول" کی بنیاد ڈالی۔ وہ پانچ نکات بنیاد رکھتا ہے کہ تاریخ ادب اردو  
کھینے والا، اردو زبان کی ترقی و ارتقاء کے مدارج و منازل سے گزرتا ہوا، تاریخ اردو کے مرتب میں، اردو  
کی آئینہ کی کجینی ہوئی، تصویر کے گمان و وہ لکھنؤ اسکول کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ لکھنؤ  
اسکول نے زمانے کے گمانا چڑھاؤ کے باوجود اپنی شرفی و رنگینی کا دامن کبھی ہر قدرست چھوٹنے نہ دیا۔

چوک، اکھف الدوا کے امام باڑے، فرنگی محل، جھوانی ٹولے، خانہ انامیس اور خرنڈے کی طرح  
اردو کے لکھنؤ اسکول کی زلف و فراست اور شوخی و رنگینی کا ایک خصوصیت اور مجموعی نمائندہ، لکھنؤ کا "لکھنؤ" بھی  
ہی ہے۔ جو شروع سے اب تک با دشعاع کے نرم و گرم، تیز و سخت جھونکے سنا ہوا اپنی جگہ پر چہر کی چٹان  
کی طرح قائم ہے۔

نہدیب الاغلق، تیرھویں صدی، اگرہ اخبار، ریاض الاخبار، فقہ، نقاد اور ملائے عام سب  
پیدا ہوئے، بڑے، پہلے، چھوٹے اور مٹ گئے لیکن اور وہ بھی ارضا است نظر جڑ سے بچا ہے، آج تک



اپنی جاہ پر اپنی شان اسلانی کن بان سے قائم ہے۔

متذکرہ رسالوں اور اخباروں کے علاوہ شیخ کی حیثیت سے بھی اودھ پنچ کی تعلیم میں لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ سے بکثرت ملتا ہے۔

”سر پنچ“ زندہ رہا مگر لکھنؤ اسکول کے اعلیٰ معیار کی قربانی کا حق اودھ پنچ ہی کے ذمے رہا۔ اب بھی لکھنؤ کی سر زمین شوخ و گلین سے متعدد اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں لیکن کوئل ہلکے کے اعتبار سے

اسید باب مرصوم کے ہدم کے سوا اگر دیکھا جائے تو اودھ پنچ کے مقابلے میں وہ گویا ایک سادہ ورق ہیں۔

نقاد کو اگر یہ فخر ہے کہ اس سے ایم مہدی حسن اور خالد بنگالی جیسے ادیب پیدا کیے۔

ہاویں، اگر اسپرنازاں ہے کہ اس نے عطار الدین، میاں عبد العزیز، ناک پڑا اور ضیاء الدین طوس کے فلم کی بے پناہ طاقت سے دنیا کو آگاہ کیا۔

اور اردو و حیدر آباد اگر مرزا فرحت الشریک کی خوابیدہ قابلیت کی نمائندگی کا ثابت ہوا تو اودھ پنچ کی یہ خصوصیت بھی یاد رکھیں کہ اس کی آغوش میں وہ لڑکے پڑھ رہے ہیں جو بعد کو آل انڈیا پوزیشن کے مالک ہوئے۔

مرزا چوبیگ مسم ظریف، لپٹ کمال کے باوجود اب تک گنم ہیں لیکن اکبر الہ آبادی اور جواہر لال نہرو کے کون جندوستانی نادانقت ہے۔

بلکہ میں تو شرار و سرشار کے کارناموں کو بھی بالواسطہ اودھ پنچ ہی کا رہن منت سمجھتا ہوں۔ یہ تو تھا قدیم اودھ پنچ جس کا سہرا منشی سجاد حسین مرحوم کے سر ہے۔ اب رہا جدید اودھ پنچ سوامی کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ سچ اردو میں مشرق اور اسلامی تہذیب کا سمویا ہو، رنگ تمام ہندوستان میں اگر کہیں ٹکڑا ہو نظر آتا ہے تو وہ صرف اودھ پنچ کے ادراک میں!

کاش! شیخ متا ز حسین عثمانی اٹھرت پسند ہوتے۔ یہ اگر نہیں تھا تو کاش دو کم ست کم عزت پسند نہ ہوتے۔ تو آج دنیا دیکھتی کہ یہ وجود شخص جسے دنیا شیخ متا ز حسین عثمانی کہتی ہے ایک شخص نہیں بلکہ تاریخ ہے، ”علامہ“ نہیں، بحر العلوم ہے۔

اودھ پنچ زبان کا تو بادشاہ تھا ہی اور ہے ہی، سیاست میں بھی اوں دن سے اسکی ریلے کو جتداندہ قیمت حاصل رہی ہے۔ سیاست کے نازدار میں غلامت کی کاپیاں کبیر تار ہوا جس خیر جیورقی سے اودھ پنچ کا اوٹیرا پاک دھات نکل جاتا تھا وہ کج تربیت کے اسی کا حصہ تھا۔

اودھ پنچ کے کارٹون آج بھی تاریخ سیاست کی ایک سربراہان ہیں۔ کون ہے جو ٹھہر کر

اور یہ ۱۰ استان پڑھے۔

اڈیٹر صاحب اور دہ نچے "انٹالر" کے اس سنے دور میں مرزا رسوا پر ایک مضمون لکھا تھا انہوں نے مرزا کے متعلق بن زتیں خیالات کا اسنے بھر دیکر وہ مضمون میں انہما کر کیا تھا وہ آج حوت بہ موت خود انہیں پر صادق آرہے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ مرزا رسوا اور علامہ علیا مہائی کا فراق شیخ متنازعین کی موجودگی میں برداشت کیا جاسکتا تھا لیکن شیخ متنازعین عثمان کی میدانی ناقابل برداشت ہے کہ نہ ان کا جواب یہ موجود تھے لیکن ان کا دقتی کوئی ثانی نہیں ہے

داغ فراق سمیت شب کی حبلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سودہ بھی خوش ہے شیخ متنازعین کا مرنا ایک شخص کا مرنا نہیں ہے یہ اودھ پنج کا مرنا ہے جو بڑی بڑی تاریخی مذاہبات کا مال تھا، نہیں بلکہ جو اسے خود ایک مکمل تاریخ تھا بلکہ یہ لکھنؤ کے اردو اسکول کا مرنا ہے کیونکہ اب لکھنوی خاص لکھنوی انداز کا ایسا بے بدل "ماسٹر" اور کوئی نہیں۔

شیخ صاحب مرحوم گرچہ لکھنؤ اسکول کے متبع تھے مگر ان کا ماسٹر میچر کا سیکل لٹریچر تھا۔ ابوالکلام، محمد حسین آزاد، نصیر حسین خیال اور مولانا سبط حسن کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ ان کے رنگ کا چرہ نہیں اڑایا جاسکتا مگر متنازعین کے متعلق تو قسم کھائی جاسکتی ہے کہ آج ہندوستان میں ان کے نتیجے میں انہیں کی طرح بہ سمیت، سادگی اور نظرافت کی مکمل پاشنی کے ساتھ صحیح طور سے دستریں بھی لکھنا کسی کے بس میں نہیں۔

علیم آشفۃ صاحب کی اس نظم نے جو شیخ صاحب کے متعلق اس ناظر میں شائع ہوئی ہے میرے جذبات کو بہت اپیل کیا۔ یہ نظم نہیں بلکہ اڈیٹر صاحب اور دہ نچے کی ایک چھوٹی سی خوبصورت تصویر ہے۔ میں انہیں مذاہبات کے ماتحت جو آشفۃ صاحب کے دل میں بھی شیخ متنازعین صاحب کی نسبت موجود ہیں آشفۃ صاحب اپیل کرتا ہوں کہ وہ شیخ متنازعین کو مرنے نہ دیں جس کی ایک صورت وہ یہ ہے کہ اودھ پنج کو زندہ رکھا جائے بیساکہ اس کے آثار لکھنؤ کے مشہور ادیب جناب ظریف کے حنان ادارت پنچماٹے سے پیدا ہو گئے ہیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ آشفۃ صاحب شیخ صاحب مرحوم کے صاحبزادے کی سمیت ہیں، یہ ڈیڑھ سو دس صاحب رضوی، مرزا محمد سکری بی، اے، مکیم عبدالقوی صاحب لکھنوی، دہل صاحب بگاری، اڈیٹر صاحب انٹالر کا ایک بورڈ بنا کے، الگ الگ عنوانوں کے ماتحت اودھ پنج کے انتخابات شائع فرمائیں۔ یہ تو غیر ایک بڑا کام ہے لیکن حال متنازعین بورڈ اگر صرف مضامین متنازعین کی ترتیب تہذیب

اور انتخاب و اشاعت کی خدمت اپنے ذمے لے لے کر بھی تدریساں مٹا حسین صاحب ہی پر نہیں بلکہ  
اور دو پرانے حضرات کا یہ گویا ایک بہت بڑا احسان ہو گا۔

انتخاب میں فی الحال اور چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے مگر ان "خاصہ کی چیزوں" کو ضرور ملحوظ  
رکھا جائے۔

اول شیعہ صاحب مرحوم کے وہ خطوط جو انہوں نے دوسرے اخباروں اور رسالوں کی مضمون طلبی  
کی فرمائش کے جواب میں ان رسالوں اور اخباروں کو لکھے ہیں خواہ وہ اودھ پنچ میں شائع ہوئے ہوں یا  
نہ ہوئے ہوں۔

دوسرے اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کی زربک کا وہ مثال سلسلہ جو ہر عیشیت کے بے مثال ہے نیز  
لغات کے سلسلے میں جو کچھ انہوں نے یا ان کے دوسرے نامہ نگاروں نے لکھا ہے مع ان مباحثوں کے  
جو اس بحث میں ختمنا چھوڑ گئے اور جن کا فیصلہ، قول فیصل کے طور پر اڈیٹر صاحب اودھ پنچ نے کیا ہے،  
اور یو منطق آرا دیکھ کر غیر کے فرضی نام سے جو اصلاحی، سیاسی اور ادبی مضامین لکھے گئے ہیں وہ  
یہ سب اگر ایک سلسلے میں خوبصورتی اور حسن انتخاب و ترتیب کے ساتھ شائع کر دیے جائیں تو  
یہ بھی ایک بہت بڑا کام ہو گا۔

یہ، شیخ مٹا حسین مرحوم کی، اودھ پنچ کی، کھنوا کی، اردو کی اور ہندی اور اسلامی ملی ہوئی مشرقی  
تہذیب کی ایک زندہ یادگار ہو گی۔

آخر میں، اتنا میں اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ یادگار اس عنوان سے اگر قائم  
ہوئی تو خیر و برکت

بس عجم نا ابدی خاک میں لجا جائے گی یہ جو اک تھوڑی سی لذت سی لا محال میں ہے



# نعمت خان مالی

دقائق نعمت خان مالی نامی کی ایک مشہور کتاب ہے، جس کے اجزاء اکثر مواد کے تحت  
میں داخل کیے جاتے ہیں مگر وقت مضامین کی وجہ سے شاید ایسے بہت ہی کم احباب ہوں گے  
جو اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں اس شکل کو رفع کرتے اور نعمت خان مالی کے کمال  
انشاپر دازی کو نمایاں ہونے کا موقع دینے کے لیے ہمارے کرم جناب مرزا محمد عسکری صاحب  
”دقائق“ کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اور طرز تحریر و ہی اختیار کیا ہے جو گریزی کے مشہور ادیب  
پارلس میپ نے شکسپیر کے اُردو ترجموں کی صورت میں پیش کرتے وقت ملحوظ رکھا۔ مرزا صاحب  
کے کمالات ادبی کو دیکھتے ہوئے ناانجام توقع بیجا نہ ہوگی کہ انہیں بھی پارلس میپ کی طرح  
اپنے اس ادبی کارنامہ کی بددلت قبولیت مامور حاصل ہوگی۔

دقائق کے اُردو ایڈیشن کے شروع میں اضافہ کرنے کے لیے مرزا صاحب نے نعمت خان  
مالی کے حالات اور اُن کے تہذیب و کلام پر جو تبصرہ کیا ہے اُسے چھپنے سے پہلے ذرا ہلکا کر  
اور آخر میں اشعار کے لیے مرحمت فرمایا ہے، جس کے مطالعہ سے اہل ادب کو کسی قدر اندازہ ہو سکیگا  
کہ اصل کتب کس غریزی اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔

دقائق میں شہنشاہ عالمگیر اور ایک زیب کے متعلق جو دو مصنف نے اختیار کیا اُسے  
مسلمان پسند نہیں سمجھ سکتے، اگر مصنف کے ادبی کمالات کا اعتراف نہ کرنا اور اُس کی  
انشاپر دازی کے محاسن کو نظر انداز کرنا انصاف کے قلم اور مسلمانوں کی عام دوستی و ادب  
نوازسی کی دیرینہ روایات کے خلاف ہوگا

ایڈیٹر

اصل میں میرزا محمد نام تھا، مگر اپنے خطاب کے ساتھ ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ آل نام کو بھول گئے، اور صرف خطاب یعنی نعمت خان عالی یاد رہ گیا۔ عام تو عام بعض بعض وقتہ طبقہ خواہ اس نے بھی، صو کا کہنا یا۔ حتیٰ کہ بعض تذکرہ نویسوں نے اسی خطاب کو نام سمجھ لیا۔

عالی شیراز کے رہنے والے تھے اور ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام فتح الدین تھا، جو اپنے زمانے کے مشہور و معروف طبیب تھے۔ ہندوستان کی بھی سیاحت کی تھی، اور پھر شیراز، پس چلے گئے تھے۔ انھیں حکیم فتح الدین کے بیٹے یعنی عالی کے چچا زاد بھائی حکیم محسن خاں نے بھی ہندوستان آکر شاہ عالم کی مصاحبت اختیار کی اور بڑا عروج پایا۔ اسی طرح محسن خاں کے بیٹے حکیم صادق خاں نے عالمگیر ثانی کے آخر میں حکومت میں اقتدار و اعتبار حاصل کر کے حکیم الملوک خطاب پایا، اور اپنے مہاصرین کی نظروں میں اتنا مرتبہ حاصل کیا کہ محمود زمانہ ہوئے۔

**عالی کی تعلیم و تربیت** | مرزا محمد ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور یہیں نشوونما پا کر کسی ہی کے زمانے میں اپنے والد حکیم فتح الدین کی مراجعت کے وقت ان کے ساتھ ساتھ اپنے آبائی وطن مالوت شیراز چلے گئے اور وہیں ضروری علوم و فنون کی تحصیل اور تکمیل کی۔ فارسی ان کی اصلی زبان تھی، اس لیے اس کا ذکر تحصیل حاصل سمجھنا چاہیے۔ مگر انہوں نے زبان عربی میں مختلف علوم و فنون، صرف و نحو، منطق، فلسفہ، ہیئت، فہم، حدیث، پڑھی اور ایک عالمانہ قابلیت پیدا کر لی۔ اس کے بعد طب کی طرف توجہ کی، اور جلد اپنے اس آبائی پیشے میں بھی کمال حاصل کر لیا: علوم ضروری سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شاعری شروع کی اور حکیم تخلص اختیار کیا۔ ابتدائی کلام میں ہی تخلص رکھا، مگر جب لاہور میں یزدی مقبہ ہر دانشمند خاں کے زیر تلامذہ میں داخل ہوئے تو عند علوم کسی کے سوا جہان سے یا خود یہ خیال آیا کہ حکیم اور حکیم بالکل ایک ہی طرح سے لکھا جاتا ہے لہذا اس تخلص کو چھوڑ دیا، اور اپنے استاد کے مشورہ سے عالی تخلص اختیار کیا، جسکی ابت اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے

”در بدایت حال بنا بہت شغل طبابت کہ سمت خوردش بود حکیم تخلص می نمودم، آخر

تسلیت پکنم اختیار تخلص حکیم را باغش و بفرمودہ استاد دانشمند خاں عالی تخلص کردم“

چونکہ اُس زمانے میں تیموری فرماں برداری کا آوازہ گرم تمام عالم میں پہنچ چکا تھا اس لیے  
مالی نے دوبارہ ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں آکر کسی نہ کسی وسیلے سے دربار مالگیری میں  
پہنچ کر تقرب حاصل کیا۔ اور رفتہ رفتہ زمرہ نازمین شاہی میں داخل ہو گئے۔ مثلاً یہ  
جب جنگ حیدرآباد میں اورنگ زیب کو فتح ہوئی تو مالی نے مندرجہ ذیل تاریخ فتح کھٹکھٹ  
شاہی میں گزرائی، جو نہایت پسند آئی، اور منسلک میں عادت شاہی سے سر دراز کیے گئے۔  
تاریخ یہ ہے :-

از شریعت ! شاہ نازی مگر دیدار جہانیاں شاہ  
آدم : قلم حساب تاریخ شد فتح جنگ حیدرآباد  
تاریخ نہایت خاص عالی بابت فتح حیدرآباد

ہوا حسن داشت جا بجا و محل بدوش کرد از مکن تقدیر  
جوں بردن رفت از گاش نشست شاہ اورنگ زیب عالمگیر  
اُسی زمانے میں زمرہ مسابہین خاص میں شامل ہوئے، و بہت حد میں بکا دل بے پروا و روز  
اورچی نانہ کی خدمت پر مامور ہوئے، اور نہایت خاص دربار شاہی سے خطاب حاصل کیا۔  
تاریخت واجب راجب اسکی آیت ہے

ذہبے خاد است خد مال | خانی مذہب امامیہ تھے، اور تحصیل تکمیل علوم مذہبی کی بنا پر کہا  
جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے ایک مستدر مام تھے۔ مگر  
فخر نامہ نہایت آزار مزاج، شگفتہ لہجہ، ہشاش بشاش، ظریف الطبع واقع ہوئے تھے۔ سلیس  
مولویت کا ان پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا تھا۔ جسکی اُنکے کام کے ایک ایک لفظ سے شہادت  
میلی تھی۔ پھر بھی صورت سادہ، لہجہ رسی واقع ہوئی تھی کہ انکو مستعجب نہ بنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ  
فرماں روا کے غم یعنی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ ایک سو پانچ و بیس رکھنے والے سنی المذہب  
تھے اور اپنے مذہب کی اُسراری میں انکو پورا غلو تھا اور صرف مالتی ایک فطرتی سٹوڈنٹ لڑکائی  
اور اس منصب کو بڑا بڑا کرتے تھے۔ اور کچھ کر سکتے تھے، بادشاہ کی اکثر باتوں کا مضامین  
اور آواز آتا تھا کہ خود بھی تم سب مذہبی سے میرے معلوم ہوتے تھے۔ کچھ تو یہ کچھ بات کی تیج  
نے اُنہیں بھی اچھا خاصہ مستعجب بنا دیا تھا۔ اسی مذہبی غلو اور منصب کی وجہ سے بادشاہ



سے کچھ صفات نہ تھے۔

اس بابہی تار و اداری اور ناراضی کی اطلاع عالمگیر ایسے بادشاہ کو نہ ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مگر چونکہ اورنگ زیب عالمگیر اس تشاک مزاجی اور انتہائی تعصب کے باوجود بھی قابلیت کے تندر دان اور جوہر شناسی میں فرد تھے اس لیے انہوں نے اگرچہ عالیٰ کی دستور شکایت بھی سنیں مگر کبھی اسے جوہر ذاتی کو نظر انداز کر کے انصاف کا وزن اپنی گردن پر نہیں لیا اور اسی لیے کسی قسم کا تعزیر نہیں کیا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ بکتہ پیٹوں سے عالمگیر سے عاکی کی شوخ مزاجی اور تعصب نہ ہی کے ساتھ صحابہ کرام پر لعن طعن، سب دشمن بنیاد کا ذکر کیا۔ یہ شکایات سن کر بادشاہ نے عالی کو بلایا اور باتوں باتوں میں اعتقادات کے متعلق دریافت کیا، تو نعمت خان عالی نے جواب میں یہ رابعی پڑھی:

اصحاب نبی کہ چار یا رند      چوں پار کتاب در شمار ند  
ہر پار بالائے وریبے      زان پار کے نداشت عیبے

بادشاہ کو یہ سن کر دلی اطمینان ہوا ہوا نہ ہوا ہو، مگر ظاہر اس رابعی سے کچھ نہ کچھ مصلحت ہو گئی۔ بکتہ پیٹوں اور خود وہ بیٹوں کی نگاہ تو ایک ایک نقطے اور ایک ایک حرکت پر رہتی ہے، چنانچہ جب عالی چلے گئے تو کہا گیا کہ ذرا حضور غور تو فرمائیں! یہ تو کھلا تبرا ہے اور اچھے مصرعے کو حضور اچھی طرح دیکھیں، جو تمہارے مصرعہ تو کھلا ہوا ذوق منی مصرعہ ہے۔ سمجھتے ہی بادشاہ کو بھی شبہ ہو گیا۔ پھر بلایا، اور پھر مذہب و شرب کی بابت تشریح و تصریح پچا ہی۔ عالی نے یہ شعر پڑھا:

یار! گفتم یہ تو اسے شہر یار      چار یا رند چار پار و پار یار

یہ سن کر بادشاہ کو ہر صورت اطمینان ہو گیا۔ بھڑکانے والوں نے کہا بھی کہ حضور اس شعر میں اپنے صواب کی بارکی مدح سمجھی ہے مگر دراصل عالی نے دو ازوہ امام کی نفی کی ہے۔ بادشاہ نے یہ یہ سن لیا اور سمجھ بھی لیا، مگر پھر کچھ نہ کہا۔ اٹانے کو تو اٹالے، گردل سے نہ وہ صاف رہے اور نہ یہ صاف رہے۔ بلکہ عالی تو عمر بھر ستم ظریفیوں کے ساتھ بادشاہ پر چڑھیں کہ ارا ازسی معاملہ ہوا غیر مذہبی سے ہر طرح سے بادشاہ پر تبرا کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مرزا ابراہیم بلیک سترابن شاہی میں سے ایک نہایت ممتاز اور مقرر صاحب تھا۔ گردن میں کسی مارنے کی وجہ سے قوڑا سا زخم تھا۔ اسی طرح بادشاہ کے زانو میں ایک اجنبی بگڑے ٹر جانے کی وجہ سے ہمیشہ درد ہوا کرتا

تھا۔ اور اسی سے ملائک میں ایک اغوا باجی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی لیے ہمیشہ دوا و دوش  
 ہوتی رہتی تھی اور ہمیشہ۔ نئے نسخے تیار ہوتے تھے۔ تشدید و تدرین کا سلسلہ غیر متناہی ہو گیا تھا۔  
 نئی دوائیں روز بروز بنتی تھیں۔ اسی واسطے کوٹانی نے یوں نظم کیا ہے :

گردن خنجر چوں بزدل را بد	استمناں از لوازم دار و دست
برندش پیش یار علی	آنکہ کیاں بود دشمن و دوست
گر کند این علاج گردن او	پیش از ہر پاسے مانگوست
یعنی ز درم زکتہ تقسیم	کہ ناماں چوں ایشا و اہر دست
نقد اے کہ ماہیہ کردیم	وزرا این باجمہ گردن دوست

اسی طرح ایک مرتبہ بادشاہ کی تقریب میں یہ قلعہ کمار نذر گزارا :

اے عمر صورت و عثمان سیرت	کہ ابو بکر ملکدار تو باد
روز محشر کہ بخود درانی	پس بوسنیاں یار تو باد

بادشاہ کوئی جاہل تو تھے نہیں، چوتھے مصرعے کا مطلب سمجھ گئے۔ مگر پھر بھی یہ لکھنا شروع ہو گئے۔  
 اگرچہ یہی کہ نہ قریب بقریہ بدانت خود بچہ کردہ است، لیکن سادہ است۔ نہ سید دریا نہیں

عالی چونکہ بالطنع ظرافت اپنی اور شوخ مزاج واقع ہوئے تھے اس لیے دوسرے مقامات  
 میں بھی انکی یہی روش کے نزدیک تھی، اور ریتاوی انکار بھی انکی اس حالت قاس پر غالب نہ حاصل  
 کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ضرورت اور افلاس کے ہاتھوں سے پریشان ہو کر اپنا جینیہ مرصع  
 زیب النساء بلگیم متبئیہ بادشاہ وقت کے پاس فریخت کے لیے بھیجا۔ مگر کچھ ایسے اتفاقات  
 ہوئے کہ ایک عرصہ گزر گیا اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو بلگیم کی خدمت میں یہ رباٹی لکھ بھیجی۔

دے بنا گیت سادہ اخترا من	وز خدمت تو مہاں شدہ جو ہر من
گر جینیہ خریدنی ست پس کو زہر من	در نیست خریدنی زن بر سر من

رب النساء نے رباٹی پڑھ کر جینیہ واپس کر دیا اور پانچ ہزار روپیہ انعام دیا۔

اور عالمگیری کے شعرا کی تعداد اگرچہ عہد انگریز و جہانگیری کے برابر

عالی کی شاعری

نہیں ہے پھر بھی شاعروں کے زمانے کے برابر ضرور ہے۔ چنانچہ

محابت خاں آشتا، انظم سرودی، مرزا محمد رفیع قزلباشی، رفیع مرزا حسن، مرزا عبدالقادر بیل

نائبینا سے یزدی، مرزا محمد علی اکبر آبادی، ملا محمد سعید اشرف، غافل، ملا طغرلے مشہدی، مرزا  
معز الدین فطرت، علی سہرزدی، راسخ، خالص، باذل، طاہر، اردوت ناں واضح وغیرہ وغیرہ  
عہد عالمگیری کے نامور شعرا میں سے گزرتے ہیں۔ ان سب کے مقابلے پر جب عالی کے کلام کو دیکھا  
جاتا ہے یا ان سے موازنہ کیا جاتا ہے تو وہ کسی صورت سے ان لوگوں سے کم نہیں ٹھہرتا بلکہ  
اُس میں ایک خاص رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

کلام عالی کی خصوصیات | عالی کے کلام میں چنانچہ ایسی خصوصیتیں ہیں جو ان کے ہمعصر  
شعرا کے کلام میں نہیں ہیں۔ جنہیں ہم ذرا تفصیل کے  
ساتھ گنانا چاہتے ہیں۔

۔ پہلی خصوصیت | عالی کے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ فارسی کے ان زبان ہونے اور  
ایران کے رسوم و رواج کو جاننے اور ان کے بیان کرنے پر قادر ہونے کے باوجود بھی وہ ہندوستان  
میں رہ کر ہندوستان کے مذاق اور یہاں کے رسوم و رواج کو نظر انداز نہیں کرتے اور  
ان کے اکثر اشار میں یہاں کے عادات و حالات اس خوبی سے نظم ہوتے ہیں کہ بیباختہ داد دینے  
کو جی چاہتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی نگاہیں اس گہرے راز کو دریافت کر چکی  
تھیں کہ جس ملک میں شاعری کی جائے اُسکو اسی سرزمین کے دلکش حالات سے وابستہ  
رکھا جائے تاکہ وہ زیادہ دلکش اور دلچسپ ہو۔ اور اُس کے اثرات دلوں پر اچھی طرح سے  
منترب ہو سکیں۔ برعکس دوسرے شعرا کے کہ وہ ہندوستان میں رہ کر ایران و توران کی باتیں نظم  
کیا کرتے تھے۔

دوسری خصوصیت | زبان فارسی کی شاعری نگینیں ہیں، نامور استعاروں، بہت تشبیہوں میں الجھ کر  
ایسی ہی وہ ہو گئی تھی کہ اس میں اصلیت نہ رہی تھی۔ چنانچہ تاریخین کے  
دوا دین اس کے شاہد ہیں۔ فطرت شوکت، بیدل وغیرہ سب اسی رنگ کے دلدارہ ہیں۔  
مگر عالی نے ان سب باتوں پر ایک نادر نظر ڈالی اور ان عیب سے اپنے ذہن کمال کو ٹوٹ  
نہ ہونے دیا۔ چنانچہ اُن کے دیوان میں استعاروں اور تشبیہوں کی وہ بھرمار نہیں ہے جو اُن کے  
پیشروں یا اُن کے معاصرین کے یہاں ہے۔ وہ قلم اور اغراق کی آندھیوں سے وہ طوفان بنے بغیر  
برپا نہیں کرتے جو اُن کے معاصرین نے کیا۔ اُنکو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا ہے کہ ذائقہ کا شعر پر  
اتنا اثر ہرگز نہ پڑتا جیسے کہ فروغ باقی رہ جائیں اور اہل غالب ہو جائے۔ وہ جنس چاہتے کہ



کہ مناسب ضروری اس تذکار میں چل جائیں کہ یہ تیز سے تیز لگا میں بھی، گو ڈھونڈنا نہ سکیں۔  
یہ نہیں ہے کہ انہوں نے آشیہوں اور استغاثوں یا صنایع بدیع کو واجب ترک قرار دیا ہے  
اور کبھی استمال ہی نہیں کیا۔ مگر اس طرح سے استمال کیا ہے کہ انہاں پر پہنچنے کے بجائے  
حسن کلام پر مبنی کیا ہے۔

نیسری خصوصیت | اساتذہ نے شعر کی خوبی اور تاثیر کو وہ باتوں پر منحصر رکھا ہے کہ با تو شعر میں  
انسا ہی پہلو ہوا یا انسا مانی۔ اگر یہ دونوں باتیں شعر میں نہیں ہیں تو وہ شعر  
حد و شعری سے دور ہے، بلکہ بدین ہے۔ اسکو شعر کہنا ایک قسم کی زیادتی ہے۔ چنانچہ  
شعراء شاخون فارسی میں: ابا نقالی سے الکر عرنی دقینی دغیر ملکے ان سے اب کے  
شعراء بھی برابر انسا مانی رنگ کو نظر رکھتے چلے آئے ہیں۔ بلاشبہ کہ جو رنگ اس قدر عام  
ہو جاتا ہے وہ ایک پیش پا آتا وہ مسنون سے زیادہ وقع نہیں رہتا۔ اس میں ایک قسم کا انداز  
اور علمیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے مقبول بنانے اور اس میں تازگی پیدا کرنے کے  
لیے تشبیہات لافیتی کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ شعراء مابعد میں ایسا ہی ہوا ہے۔ بھیرا یہ ایسے  
مسنوئی خیالات پر صرف شعر کو درانگیز بنانے کی غرض سے مصنوعی الفاظ اور تلاش و ترکیبات  
و غیرہ سے آلودہ رنگ و روغن چڑھایا گیا ہے۔ مگر اس تشبیہ نے شعر میں اثر کی بجائے اور بے اثر  
پیدا کر دی ہے۔ غالی نے اس بات کا بلکہ اس نقش کا بھی اندازہ کیا۔ اور اسی لیے اس  
پامال اور منحصر من جادہ کو چھوڑ کر ایک طرز خاص ایجاد کیا۔ جس میں انسا ط و انسا ط کو  
لما دیا۔ سلامت روی اور اعتدال کو ہر جا ملحوظ رکھا، اور اسی رنگ خاص پر اپنی شاعری  
کے قصور ریش کی بنیاد رکھ دی۔ مگر چونکہ وہ فطرثا ظریف الطبع تھے اس لیے پھر بھی انسا طی رنگ  
انکے کلام پر غالب رہا۔ بلکہ ان کی شاعری کا جزو اعظم بن گیا۔ اسی لیے دور مذکورہ میں غالی  
کے کلام میں یہ بات ایک خصوصیت کی مد میں داخل ہو گئی۔

بدنی خصوصیت | مسنون آفرینی اور تخیل اگرچہ ہر شاعر کے لیے ضروری ہے بلکہ الفاظ و دیگر شعر کا جزو  
اعظم ہی ہے، مگر مانی نے خصوصیت کے ساتھ اس کا بہت خیال رکھا ہے، بلکہ  
الترام کیا ہے۔ اور اکثر رنگ و بات تخیل میں وہ اپنے معاصرین سے بڑھ گئے ہیں۔ اور زیادہ تر قابل  
تعریف و امر ہے کہ کہیں اپنی قوت تخیل کو تیز کی مدد و کمک سے ایک قدم باہر نہیں مایہ دیا۔

پانچویں خصوصیت | یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ وہ مختلف علوم و فنون کے اہل راہ استاد کمال  
تھے مگر غزلیات اور رباعیات میں خصوصاً انھوں نے صفائی زبان کا ہر رنگ  
خیال رکھا ہے اور اس بارہ شیرازی میں کسی قسم کا ذرا بھی میل نہ ہونے دیا۔ اسی لیے تمام کلام  
موج سبیل معلوم ہوتا ہے۔ صفائی، شیرینی، روانی، کمین تسلسل سب اس میں موجود ہیں۔  
ان کے دیوان میں اصناف کلام، مثلاً غزلیات، رباعیات، قصائد، تارخیں، ہجو  
موجود ہیں۔ ایک شہسوی مہموم، سخن عالی بھی اس میں شامل ہے۔

اصناف کلام پر رسلے | جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا اس کے کلام میں انبساطی رنگ زیادہ ہے  
جیسا کہ دوسرے مشاہیر کے مقابلہ پر حالی کے بیان درود  
اثر کی کمی ہے۔ مگر ظرافت کی چاشنی اور انبساطی رنگ سے اس کی کوہرا کر دیا ہے۔ اسوائے  
نوع معانی اور معاملہ بندی کے اسلوب نے اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ اسی سے غزلیات  
میں ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

رباعیات | اگرچہ ان کے یہاں رباعیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے مگر ان میں کوئی  
ایسی خدمت نہیں کہ عمر خیام کی رباعیوں کی طرح مدح و تعالیٰ کے نام پر طغرائے اتیان ثابت ہوں۔  
قصائد | حبش تعلقات، ہجو اور خدمت کی تیز اور تکیہ ہونی تلواریں ہیں، جنھیں بیدردی کے ساتھ  
اپنے مناصب کے نگلے پر پیرا گیا ہے۔ بعض واقعات پر مبنی ہیں بعض معمولی ہیں۔  
تاریخیں | ان کی کہی ہوئی تاریخیں ایک خاص درجہ اتیان رکھتی ہیں۔ مادہ تاریخ اس قدر صاف  
ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر دوسروں کے یہاں در شکل سے ملتی ہے۔ اسی لحاظ سے وہ نہایت قابل  
تعریف ہیں۔

ہجو | تمام اصناف سخن میں غالی کے دیں ہجو کوئی کا ذکر شورش ہے۔ اور ایک ساتھ ہی ساتھ  
ہجو دس ہا پانچ، اس قدر بلند ہے کہ وہ عیب کے بیابان ہر معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی ہجو دس کا حضرت  
اس کے حاضرین بلکہ متقدمین کے یہاں بھی جواب نہیں۔ مولانا غلام علی آزاد تذکرہ فرائد عامر  
میں لکھتے ہیں: ”ہجو شمشیر خوریز است بلکہ صوفیاء و سادات ائمہ و ائمہ شریعت میں سیکڑوں  
شاعر ہجو کو گزشتہ ہیں، مگر نسبت غسان غالی نے جو طرز خاص اختیار کیا وہی اس کے وہید قضا  
وہی اس کے خاتم ہوئے۔ وہ سرہں کو اس رنگ کی ہوا بھی نہیں ملی۔ اگر ان کی ہجو دس کو تانت

کی نگاہ سے دیکھیے تو یہی ان کا مرتبہ عالی ہے اور اگر ہزل کی ذمیت سے اُن پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا سحرہ بھانڈ بھی ان کا مقابل نہیں ہو سکتا۔ عالی ہجو میں صرت ہجو وہ گوئی اور ہزائی ہی سے کام نہیں لیتے بلکہ اُس میں انتہائی معانی آفرینی کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ کسی ہجو سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہجو کرنے والا غصے میں ناک ہجوں چڑھانے ترش رو بنا بیٹھا ہے، بلکہ برعکس اس کے معانی و معانی سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنے وہ جو کچھ کہہ رہا ہے نہایت خندہ پیشانی سے کہہ رہا ہے یا ہنس مہنس کر دوسرے کے خرمین مہر و قرار پر بھلیاں گرا رہا ہے۔ طرافت کا ایک بے پایاں اور ذخار دہا سو میں ادا چلا آتا ہے، جس پر اُس کی روانی میں اُسکی پیشیں پڑ جاتی ہیں وہ شرابہ رو کر دہا آتا ہے۔ علی الرغم دوسرے لوگوں کے کہ سب کچھ کہتے ہیں صرت بعد کو منہ سے نکالتے ہیں پہلے سننے والے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جس کے منہ سے یہ لفظ نکل رہے ہیں اُس سے موردی دشمنی اور پانی نفاصت ہے۔ ناک کی تمام قصائد ہجو۔ جو اُنکے دیوان کے علاوہ دقائع میں درج ہیں اپنے خاص رنگ میں گیتا اور بے نظیر ہیں، اسکے علاوہ ایک قطعہ جو کاسکا رناں پسر جعفر خاں دہلوی کی کتھا اٹی کے مرنے پر کہا ہے اور وہ دیوان میں موجود ہے ایسا ہے جس نے بڑے بڑے ہجو یہ قصیدوں کو مات کر دیا ہے بلکہ شعرا کی ہجو کے دنتر اُسکے سامنے دنیا برونظر آتے ہیں۔ ہجو گوئی طرافت، ہزل و اگر نظر انداز کر کے جب اس قطعہ کی باقت پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زانہ جاہلیت کا کوئی عرب شاعر جو ش میں کچھ کہہ رہا ہے ایک ایک لفظ میں معنی کا ایک نزانہ مخفی ہے۔ بہت سے معلوم: فنون کے مصطلحات اس طرح اُس میں سمودے ہیں جیسے زہر کے پیلے میں آبیات ملا دیا جائے۔

اکثر کیا گیا ہے کہ ہر ہجو کرنے والا اتنا جوش میں آ جاتا ہے کہ اشاریہ کے ساتھ اُسکے تمام خزانہ کو لے ڈالتا ہے۔ موجودہ واقعات میں تمام گزشتہ غیر مندرجہ واقعات اور انیا کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اگر خان عالی کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ وہ اپنی ہجو کو اکثر اراؤتہ سبب میں صرت اپنے مخاطب تک محدود رکھتے ہیں، اور جو نہایت اُنھیں ہے اُسکے سوا ایک لفظ بھی نہیں کہنا چاہتے۔ اگر انکی یہ تہذیب بھی پیشی چھری نگار خانہ براہ از عالم جاہلیت ہوتی ہے اگر وہ اُسی محدود فن میں اور کچھ کہہ جاتے ہیں نیکی لیے دوسروں کے واسطے نکالی اور کو سنوں، مہن و شغ



کے وسیع میدان بھی کافی نہیں ہوتے۔ انکی یہ ناش ستانت ایسی ہوتی ہے کہ شونیوں کے دفتر کے دفتر اس پر قربان ہیں۔

**شونی** جو "سخن عالی" کے نام سے موسوم ہے، اگرچہ آتسنی و غیرہ اس زمانے کے دیگر شاہیر کی شنیوں کی انگریزی نہیں، پھر بھی خیالات عالی جو اہر آباد کی طرف اس میں چک رہے ہیں۔ فصاحت، بلاغت، روانی کے دریا بہا دیے گئے ہیں۔ بخشنے شنیان، ذوق کے بل اور رو میں میراب و شاداب ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسکا پایہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔

**تصانیف** ظاہر ہے کہ عالی ایسے دارنہ مزاج کو تصنیف، زالیف کے ساتھ کیا شغف ہو سکتا تھا، انکی طرفت اور صراحتہ کرنے کی کب ابازت دیتی تھی۔ تاہم وہ ایک مصنف کی حیثیت سے ایک شہرت رکھتے ہیں۔ تصانیف ذیل انکی مشہور ہیں:

دیوان : جسکا مفصل ذکر اوپر گذر چکا۔  
**نقشِ نعمت خان عالی** اس میں محاربہ، گولکنڈہ کے شہزادہ کے حالات مذاق کے پیرایہ میں ایسے دانش معنی طرز عبارت کے ساتھ لکھے ہیں کہ اس وقت کے مشہور ستائے اور رائے ناز تصانیف میں بھی اس کا جواب نہیں ہے۔ انکی عبارت میں رنگینی، شگفتگی، فصاحت، بلاغت، تمام چیزیں اس طرح جمع کر دی ہیں جیسے مختلف رنگ کے پتھروں سے کوئی خوشنما نگار بنا یا جاتا ہے۔ اپنے طبعی اور خلقی رنگ کے تقاضے کی بنا پر درمیان درمیان میں اس وقت کے مشہور مشہور افسروں اور خود شاہ عالم پنہ پر بہت سی چوٹیں کی ہیں۔ محاذ بہ محاذ میں جو جو ناما کابیاں ہوئیں ان کا عجیب و غریب طریقے سے مضحکہ اڑایا ہے۔ اور دراصل ہی اس کتاب کا باعث تصنیف ہے۔ غالباً تصنیف بادشاہ سے خفیہ لکھی گئی ہے۔ اور اور گزرب کے انتقال کے بعد اسکے وجود سے لوگوں کو خبردار کیا ہے۔ ورنہ شاید انکییر کو اسکا کھاجا۔  
 گوارا نہ ہوتا۔

جہاں تک خیال کیا جاتا ہے اور جس قدر نظر و ڈرائی جاتی ہے اسی قدر صاف ستا سلوم ہوتا جاتا ہے کہ نعمت خان عالی کی تصانیف میں شاہکار یا اسٹریپس اسکا وقایع ہے یوں تو انکی ہر ایک تصنیف کو ایک خاص رتبہ اور درجہ حاصل ہے۔ مگر وقایع میں اس قدر محنت اور نظر فائزے کام لیا گیا ہے وہ کسی میں نہیں۔ انکی چلی خند و سبت یہ ہے کہ الفاظ

عبارت میں اس قدر ربط ہے کہ ہر ایک فقرہ صنعت مناسب اور مراعات انشیر کی ایک روش  
مثال ہے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ظہیر اسے تفرشی کی ماہر از تصنیف ششم شاداب  
نہور می کی سنتر، ارادت خاں واضح کی مینا بازار، شیخ عنایت اللہ کی بار دانش بھی اس صنعت  
سے مالا مال ہیں۔ اول سے آخر تک مذکورہ کتب میں بھی رعایات لفظی کی گرم بازار ہے  
مگر حقیقت میں جو چیز قایم کو ان سب سے جدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سب میں معلوم ہوتا  
ہے کہ عبارت محض صنعت کے لیے لکھی گئی ہے اور قایم کو دیکھتے ہیں۔ حالہ برعکس نظر آتا ہے  
کہ صنعت عبارت کے لئے لائی گئی ہے۔ یعنی کتنی ہی زبردست رعایت ہو پھر یہ لفظ  
اپنی جگہ پر اس خوبی اور رس عہدگی کے ساتھ سرٹ کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے ہرگز حشو و الزام میں  
نکلا سکتا۔ اس قسم کی مثالیں پیش کرتا ایک قسم کی تحصیل حاصل ہے کیونکہ تمام کتاب میں آدھ  
الے آخر وہ اسی رنگ میں لگی ہوئی ہے پھر یہی چند فقرہ ناقہ و نظر مثال کے لیے چن ہی لیتی ہے  
ہر واقعہ کے ابتدائی دو چار فقرے لکھے جاتے ہیں چنانچہ سب سے پہلے واقعے! شروع  
کتاب کے یہ فقرے :-

”دیکھ درس کثافت صبح۔ در صفہ صدق و صفا۔ میں تاملی بیجا تفسیر دشمن و منہما

بخط شامی آفتاب بر صفہ روزگار نکاشت۔ و ماہ شب زندہ دار باد با پای پرورد دنیا

بجاد و پھر گسترده ارسلے آفتاب شب بختم سورۃ نور کو در سر سجدہ غروب گذاشت ؟

درس، کثافت، صفہ، صدق، صفا، تاملی، بیجا، تفسیر، دشمن و منہما، خط شامی، صفہ، صبح  
الفاظ مناسبیت کے لیے لائے گئے۔ لیکن ہر لفظ عبارت کے زور کا بڑھاوا ہے اور سنی کا ہٹا  
کر رہا ہے۔ صبح کی رعایت کو دیکھ کر کثافت، صدق صفا، بیجا، دشمن و منہما وغیرہ پر غور کیجیے  
پھر انہیں الفاظ کو اس خیال سے دیکھیے کہ صنعت کو اس میں ایک قاصد کے آئے۔ اور دانت  
نتیجہ و ظفر کے بیان کرنے کا خیال ہے، تو فوراً یہ خیال بدل کر اسے قائل کر دیتی ہے کہ یہ سب  
دانت الاستلال کی صنعت ہے۔ دیگر شعرا کے یہاں بہت سی جگہ نہور طبع کے لازمہ کے لیے  
الفاظ لانے گئے ہیں۔ مگر وہ اکثر لازمہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے یہاں ہر لفظ ہر نظر  
کے لیے نئے نئے سنی پہاڑ کرتا ہے۔ دوسرے وقائع کا ابتدائی فقرہ بھی اسی معنیوں سے لیا  
جاتا ہے۔ مگر صنعت کے خیال کی پکار ہی نے اسکو اہل بول دیا ہے

ہنگامے کہ مخبر صادق صبح منہ ملے و الصبح اذ اتفخس عالمیاں و اذ قدرت کاملہ حضرت آفریدگار  
تعالیٰ شانہ خرداوار و ہما زوہ سر پہ اسیر گرداں بود اسے اللہ فوالسماوات والارض و  
اظہار احوال جہانیاں : تقریر واضح لب کشاد  
رعایات اور تناسبات وہی ہیں لیکن بالکل نئی ہیں۔  
تیسرے وقائع کا فقرہ اول ملاحظہ کیجئے  
زمانے کہ مذہب قدرت سر لوح طلوع خورشید را بردیا چہ سیاحت بیج متغوش سافت و  
ماشئہ اوراق فلک را بخطوط شعاعی مبدل کشیدہ نقاط کو اکب را بہ خطاط بلان اذ نظر  
انداخت :

مضمون وہی ہے۔ مگر الفاظ تازہ کرتے وہ بنا کاری کی ہے کہ پہلے وقائع سے کوئی نسبت نہیں ہے۔  
اسی طرح ایک اور شروع کا فقرہ  
در جنبکہ سلطان فلک تحت لمبند نبت انجم سپاہ خورشید سریر سمت الراس را بموجب  
”وہو اللہ ہی میل الشمس ضیاء“ بفروغ عالمیابی موز ساخت و سائے بہاں پروری و ظل مدلل  
گستری حکیم ”الم تر انی رکب کعبۃ من نخل و لوشاء بھلمہ ساکناً“  
مضمون وہی۔ رعایات اسی قبیل کی مگر بالکل طعمہ ہیں۔

تمام وقائع کو دیکھ لیجئے اگر ایک جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جو رعایات سے خالی ہو اور رعایات  
میں ہر لفظ اپنی جگہ برق لاس کا کام نہ کر رہا ہو۔

دوسری خصوصیت اسکی عبارت میں یہ ہے کہ ہر لفظ مصنف کے رنگ طبیعت کا ایک  
آئینہ ہے جس سے خندہ ہائے ظرافت کی لمبند آوازیں آرہی ہیں۔ ظاہر عبارت کو دیکھتے تو  
چلتی نظر میں نہایت دقیق نظر آئے گی، دوسری نظر فائز میں مناسبات و رعایات کا ایک بحر  
و خاں نظر آئے گا۔ تیسری نظر میں معلوم ہوگا کہ صرف رعایات کا دریا موجزن نہیں بلکہ مسمیٰ کا  
ایک طاسم ہے، جس سے مذاق سلیم کے موافق ہزاروں گوہر شاہوار نکل رہے ہیں۔ چوتھی نظر  
میں معلوم ہوگا کہ ظرافت کا ایک ایوان عالیشان تیار ہے۔ ظرافت کی قسموں میں سے بھی  
ہر قسم کی ظرافتیں اس میں مل سکیں گی۔ ہلکی لہکی لبوں کو جنبش بھی ہوگی، تبسم و مذاہب بھی  
ہوگا، خندہ، آہنہ، غرمنکہ نامہ اقسام ظرافت اس میں موجود ہیں۔ اس لیے کہ مصنف



نے تسخیر، پھبتیاں، پھکڑ، ہجو، ہجو، سیمی چیزیں اس میں صرف کر دی ہیں۔ کہیں تشبیہوں کے ذریعہ سے عبارت کو کشت زعفران بنا دیا ہے اور کہیں صنایع بدایح سے دیوار قہقہہ کر دیا ہے۔ کہیں ایک کند کو لکھتے ہیں "دراز تر از عمر خضر و الیاس" کہیں زردبان کو "معلم تر از طے معلم اساس" کہیں فیروز جنگ پر "ہا در بے ہا در" کا فقرہ، کہیں صلابت خاں میر آتش پر دیو آتش بازی کی بھبتی۔ کہیں عالمگیر کے جیسوں کے معلم کو اہل بتایا ہے۔ کہیں اور سر کے آدمیوں کے مجسم کو مرض قرار دیا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ کہ قرآن شریف کی آیات یا عربی فقرہوں کو فارسی کی عبارت کے ساتھ نہایت خوبی اور عمدگی سے ملایا ہے۔ اسکی مثالیں اصل کتاب ہی سے دیکھنا چاہیے۔ از ازال تا آخر ہی رنگ و قایح میں موجود ہے۔

مگر سدرجہ بالا آخری دو خصوصیات یعنی ظرافت کے الفاظ لانا اور عبارت کو شگفتہ بنانا، یا آیات قرآنی کو فارسی عبارت میں ملا دینا صرف دہانچ کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب مضحکات کا بھی یہی رنگ ہے۔ لہذا یہ دو خصوصیات قلیح کو اگر ادھر ٹکنا سے جسکی عبارت محض معنی اور درناک ہے، جدا کرتی ہیں تو ادھر مضحکات سے ملا دیتی ہیں۔ مگر محسوس چیز جس کا جواب شاید کسی جگہ نہ ملے وہ وہ قصائد اور نظمیں شہر آشوب و غیرہ میں جو انھوں نے اس کتاب میں لکھی ہیں، ان کا نہ جنگ نامے میں جواب ہے نہ مضحکات میں بکا۔ ان کے دیوان تک میں ان کا جواب نہیں مل سکتا۔ انا کہ ایک تصدیق جو انھوں نے کاسکارغا پسر معفر خاں وزیر کی شادی کی تقریب میں کہا ہے اس میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں آگئی ہیں۔ مگر وہ مدد اعتدال سے خارج ہو کر بخش اور پھکڑ بن گئی ہیں۔ برعکس اسکے یہاں جس نظم کو دیکھے ایک خاص انداز رکھتی ہے۔ بعض نہیں بلکہ ہر نظم کو کہا جاسکتا ہے کہ یہ رنگ نعمت خان مالی پر ختم ہو گیا ظرافت اور اس میں ستانت یہ ایک ایسی دشوار بات ہے جسکو بڑے بڑے مالی دماغ بھی نہیں بنا دے سکتے۔ مگر مصنف موصوف نے نہ صرف ستانت ہی کی پابندی کی ہے بلکہ بعض نظموں کو اصلیت پر مبنی کر دیا ہے اور سیاست کی زد سے اس قدر بچا یا ہے کہ ہر وقت وہ آسانی کے ساتھ جواب دے سکتے ہیں کہ یہ ایک منکومہ لغت ہے۔ اسی لیے وہ بعض بعض نظموں کو دلی دشت بیاضی کی طرح شروخ کرتے اور اس میں نصاب الصبایاں کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر دراصل وہ سب کھلی ہوئی چوٹیں بلکہ تیز کواریں ہیں جن کے زخم کہیں محسوس نہیں کئے۔ قرآن ہی سے

نمود کی ہجو لکھی۔ مگر وہی کھلی کھلی کالیاں، طعن و تشنیع کی طرف جاتے اور کہنا ہڈا کہ  
پرستار زاد، نیاید بکار اگرچہ بود زاد و شہر بار  
اگر اور شاہ، اذ بڑے مرا سیم و ذرتا پڑا نو بڑے  
مگر علی اور غم اُن کے نعمت خاں عالی اپنی ظریفانہ ستائش کو بھی اکتے نہیں جانے دیتے چنانچہ  
ایک جگہ کہتے ہیں اور لشکر شاہی کی بے سرو سامانی کا خاکہ اُڑاتے ہیں، اور ہر تیشیل میں بھتیجی کا  
انداز پیدا کر دیتے ہیں

فاطاتن فاطاتن فاطاتن فاطاتن  
شعر در بحر رمل! شد: (آب حیات  
پیت عقار و پیہ، کبریت احرار  
کیما، نوکر شدن یک ہفتہ پیش بوس  
نقد نادر علیہ و سرست۔ مہوری انتظار۔  
انچہ! شد نوکران بادشاہ را در کن  
فرش داں سلج زمین۔ لبوس پہ بلبدن  
اسی میں بعض صنایع سے کام لیتے ہیں  
تسخ معدوم دایں ہر دو بطریقت و نشر  
بشیل و الفیل۔ آجے کہ دایں لشکرست  
نفع سور و سیم۔ آواز نصیب و چوکی است  
لم یفیع چہ۔ نفع قلند۔ لم یکن یعنی پوش  
یہ قصیدہ پورا اسی رنگ میں ہے۔ اور اسکی ظرائف کی کامیابی کا دس سے زیادہ ثبوت کیا ہو سکتا  
ہے کہ ہندوستان کے مشہور ہزال جعفر زلی نے اپنے پورے لغت کی بنا اسی انداز پر لکھی ہے  
کہیں اسی تسخر اور ہزل میں اپنے تہجد اور ہمہ دانی سے بھی کام لیتے ہیں اور دیکھنے والے کو  
حیرت میں ڈالتے ہیں کہ ایسا زبردست عالم اسی باتیں بھی کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس قصیدہ میں  
دیں ایک نواب امرہ کس را نیست ما لانے بد گنج انا، و اندال ہنر و گنج و رانے  
کہتے ہیں:-

ذکر غنسی مال از بس ریش خود کند  
نود و بار، دستی قیہ اش را تسک لیا لانے  
کے گفت لے سبب ساز کریم از غرت پوستانے  
بن پنا سے خوش و خراب شب گنج پنا لانے  
کے نیگفت لے رحماں بحق موسیٰ عراں  
بیار از آسماں تر انگیس ابرش پنا لانے

کے گفت اینداوند کریم از حست موسی بر لے افرست امر از ہجوں آمد و خولے  
 ادری النظر میں یہ سب تلیمات ہیں، مگر دراصل مصنف کے تجربہ نامی پر دلالت کرتی ہیں۔ اس قسم میں  
 یہ کمال کیا ہے کہ جس قدر کسی فن یا علم کی مصطلحات ہیں ان سب کو ظرفیت کی روح وراں بنا  
 دیا ہے۔ مثلاً

بسر مدے رسیدہ خلق را افراط ناداری کہ منی ہم نزار وایں ناں جوت سخنا استے  
 لطیف از عظیم طب وریا رسیدار بھی منی نباشد خوب تر از شربت و چار و در باسنے  
 سخنم را نشد غیر از فلان کت از فلک مائل از صنعت جوت مبتدا فرمیں سے را گرد آتا۔ ۱۲  
 محاسب سال را بنوشت ماہ روزہ و روزنتر برسے آنکہ معلومش نشد شوال و شبائے  
 غرض تمام پیشے، تمام پیشوں کی اصلاحات و ظرافت کا پورا کام انجام دے رہی ہیں۔ ایک جگہ  
 ولی و شت بایمانی کی نصاب الصبیاں پر مہر سے لگا دیے ہیں  
 بحر سفارح است وراں گو ہر سخن سفول قاعبات منا میل فاعلن  
 سراج سلم آمد و زینہ دہن کند نذیں ہر دو بیچ کا رنیا بد با نغرام  
 حرب و قتال جنگ ہریت شکست وراں آمد ہمہ بیجا و ذیاں شد زہر کد ام  
 سیف و جوار و سارم و عصب حسام و تیغ کار سے کر د لکے پروں تاہ از نیام  
 غرض کہ جس نظم کو دیکھیے وہ اپنے رنگ میں فرد ہے مٹی ہذا نثر میں وہ تمام خوبیاں ہونے میں  
 جو نثر کے لیے ضروری ہیں۔ نثر میں تمام اقسام نثر اور تمام صنائع بدائع موجود ہیں۔ اور وہ  
 اس طرح سے چمک رہی ہیں جس طرح انٹری میں چمکد از گینہ۔ ایک جگہ ایک خطبہ میں لکھتے ہیں  
 آیات اللہ انزل علیکم بآء منشا فاشکروا۔ لعل النجاة من ذالسلطان و احبار  
 عن الحق الشفق من طریق العدل والاحسان، و ہوامام من الائمة نقاتہ لوالکمال اسد غریب  
 بامرد و ان اعوتم علیہ لم یجکم سورة الذنب قلنا۔

اسی طرح اس خطبہ کو فارسی اور عربی میں پورا کر دیا گیا ہے۔ اس خطبے کو دیکھ کر جہاں اُنکے تجربہ  
 نامی کا پتہ چلتا ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی حال میں اپنے اصلی رنگ سے انحراف نہیں  
 کرتے۔ اس کی تو میں یہی سمجھاؤں ہر حال، اور جو نکاح و نثر پوشیدہ ہے۔ چنانچہ پہلا ہی فقرہ املوا  
 ان اللہ انزل علیکم بآء منشا کے جہاں یہ منی ہیں کہ خدا نے تم پر ایک باری سننا انزل کی ہے۔ اور



اس سے اُن اعاذمیش کے مستحق پر روشنی پڑتی ہے کہ خدا اپنے نیک بندوں کو اس طرح آزماتا ہے کہ انکو بلا اور مصیبتوں میں پھنسا دیتا ہے اور یہی یہ معنی بھی سمجھ میں آتے ہیں اور اس حدیث کا مفہوم نظر میں پھر جاتا ہے کہ خدا نے تمہارے جب کسی قوم کے امتیاز و سرکشی کو حد سے زیادہ گزرتے دیکھتا ہے تو اُس پر پابائیں مسلط کر دیتا ہے اور ظالم حاکم کو اُس پر متعین کر دیتا ہے۔ یہی معنی "لجعل الخلفاء من ذالسلطان" تکمیل ختم ہو جاتا ہے۔ "سلطان العادل عن الحق" کو دیکھیے اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ بادشاہ عدل کرنے والا حق سے اور یہ معنی بھی ہیں کہ یہ بادشاہ ایسا ہے جو حق سے عدل کرتا ہے اور پھر گیا ہے۔ "المشقق من طریق العدل والاحسان" کے پہلے معنی یہ ہیں کہ عدل و احسان کے طریق سے وہ اپنی رعایا پر مہربان ہے اور وہ سرے معنی یہ ہیں کہ وہ عدل احسان کے راستے میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ ان آخری معنوں پر نظر ڈالتے ہوئے اس عبارت کو دیکھیے کہ وہ ہوا امام من الائمة کما قال امشد عزوجل الخ تو صاف صاف معنی نکل آئیں گے کہ یہ بادشاہ طاغی و باغی گردن زدنی ہے۔ غرض کہ یہ تمام خطبہ اسی رشتہ سے بھرا ہوا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس کتاب کے لفظ لفظ سے عبارت کی گرائیگی اور مصنف کی قدرت کلام کا پتہ ملتا ہے۔ وہ آسانی کے ساتھ ہر علم کی مصطلحات کو صرف کر کے اُس سے اپنی ظرافت کا کام لے لیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل عبارت کو دیکھیے۔ سکارلوگوں کی شان میں لگتے ہیں

"بوا اسے یخزون الکلم عن مواضع سرشتہ تومیہ و تاویل و اسجد کہ سرکسیہ معنیہ در آید  
سیکشد دبر خود علال ترانہ خیر اور راستہ پمعن و ساوس شیطانی و ہوا جس نقصانی  
عمل جبری صفر منجے صرف خواہی کرد کہ الف و لون زائد غیر صرف نشود و قیاس تفرانی  
بلا لست قصنی ترتیب خواہی داد کہ جزوے دیگر ہم جزئی امتانی گردد و از انجا کہ مبلغ علم  
و استعداد و ظاہر است صفری و کبری اذیں مقولہ خواہد بود کہ ہمیشہ طولی اطلاق صفر را  
از دکانیکہ برورد و مدی خرم ہم را از استاد حلوائی کہ مرد خیریں زبان دست خطاب  
اخذ می شنیدم۔"

اس عبارت کا سلسلہ و درجہ ہے اور اس میں صرفی، سنوی، منطقی اور بامعنی کی اصطلاحات صرف کی ہیں۔ بلکہ تمام کتاب میں اس سلسلہ کو قائم کر کے و قلع کو باوجود کسرا و ہزائی کے

ایک شاہکار ادب بنا دیا ہے۔

اسکے علاوہ جب جنگنامے پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ایک نئی دنیا سامنے آ جاتی ہے۔ اسکی عبارت متقی ہونے کے علاوہ اس میں جو شگفتگی پیدا کی ہے وہ بیسوں متقی سچ کتا پور میں بھی نہیں پائی جاتی۔ حمد کی عبارت ہی اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک سچے کار کی نظم کا لطف ملتا ہے اور حزن و یاس کے ساتھ فرحت و انبساط۔ واقعات و غیرہ کا دل پر اثر پڑتا چلا جاتا ہے۔ دیکھیے۔ کسی نگہ نہ داغ کو فکر کی منزلت نہ تاریل کی حاجت۔ ایک سب سے بھی سرگ ہے۔ انکس بند کیے چلے جائے۔

”ذیب دیا پہ سخن نیایش بے نیاز سے است کہ در بارگاه کبرایش زباں چون و چرا  
لال است۔ و در مناب عظمت والا پیش متوالہ کم و کیت اذ امر خال۔ افلاش بہ مقرون  
پہ طکت اما کے بر سر آں آنگاہ نیست۔ و امش در کل مشون چمنست لیکن متغیے را بر کما ہی  
آں را دہے۔ و مغل از یک شاخ سر بر آہ۔ یکے را بر دستار دولت رساند و دیگرے را بجاو  
حادثہ پیش گرداند و گوہر از یک بحر بیرون آورد یکے را رونق آج سلطنت سازد و دیگرے را بکل  
الہوا ہر دم، اذ اند۔ و مغل از یک کان سر بیرون کشد یکے را زینت اعلیٰ ابداری نماید و دیگرے را  
در زیر طاق قافرا ساید۔ و شمع از یک ذر منور کند۔ یکے را فروغ بخش شبستان اقبال فراید و دیگرے  
را بہ صرصر منستی خاموش نماید اگر تم اقبال است، فرزند ملک منہ است، اگر خدا، آہا شائستہ علم حکم اور  
کچھ دو ایک یہ سلسلہ قائم رکھ کر اسی عبارت سے واقعات کو شروع کر دیا ہے اور بہت دور جا کر  
اس فقرے کی ابتدا کی خبر نکالی ہے، وہاں دونوں شاہزادوں محمد منظم شاہ اور محمد اعظم شاہ کے  
اد پر کچھ متاسفانہ فقرے لکھے ہیں جو تیر و نشتر سے کم نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ

سمند قلم را در نقاشی احوال آں وزیر بہر سلطنت کہ یکے بہ نیرو سے توفیقات بلند فروغ  
بخشیں اما ان شہر یاری گردید، و دیگرے نابے مدی عالم رشتہ حیات برید و بہ برنج  
خاک آسید و دست قدرت کیے را علم سلطنت پر افزائستہ و ید تضا و گیرے مال لے حیات  
سرنگوں ساختہ کیے را اکوب مقصود و مبدا اعتلا طلوع گردید، و دیگرے را غر شیدال  
و د بہ زوال آورد۔ کیے را خیل دشمن و در محظہ و حرارت اندازی محروس، و دیگرے قتل  
اعوان و انصار از نوح و ظفر ایوس۔ کیے را اولاد کو رام بنای منایت محمدی و امان و دیگرے  
را دو قرۃ العین بچشم زخم ناک و زبان۔ کیے را کوس فتح و نصرت و در بار سوسے عالم

بند آوازہ، دیگرے راؤد سوگاری درختستان مہم آوازہ۔

جہاں تک اس قسم کی عبارت ہے اُسکو ادب کا بہتر نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح معنویت جنگ کے متعلق اس سن سے بیان کیا ہے کہ نظامی کا ساکنہ زامہ، اور فردوسی کا شاہنامہ ہی اُسکا جواب ہو سکتا ہے۔ ورنہ اگر نظم و نثر کے فرق پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم کیا جتنا پڑھے لکھے ہیں۔

”کائنات پیکل توں قزح در دست ولا دران نمودار۔ وسیل خوں از ہر سودماں عرصہ پراشوب  
پدیدار۔ نے نے میدان رزم در نظر نگار گیاں خوشتر از گلزار بود۔ و تعلق سرکہ بہ دیو  
تا شایاں بہتر از گلشن بہار می نمود۔ سخن حرب گاہ از خون کشتگان رشک از خواں دار۔  
و نیزہ بہرست یو اتان چوں سرد شمشاد نمودار۔ ہزاراں فوارہ خوں از بدن بہار زوں در  
جوش، و چا اُتشان بیان مندیباں ہزارہاں در خروش۔ جو ہرے فتنیں از ہر طرف اتند  
اتہار در جریان۔ و مرغان مذہم و عرصہ ہوا از ہر سو در طیران۔ عرق پر روے اہل تردد  
چوں قطرہ شبنم بر غار من گل رنجیہ، و عدلے چقا چاق تیر در میدان لہن چکا دک بر گنجیہ؟  
یہ نظر بھی نہایت حسن سے دکھایا ہے۔ جابین کے خطوط میں ایک سے علم و بردباری، دوسرے  
سے غصہ اور فراں برداری بھی قابل دید ہیں۔ محمد معظم شاہ اعظم شاہ کو جنگ پر آمادہ دیکھ کر  
لکھتے ہیں۔

”اے تو گل! غ سلطنت و جہانداہی، اے قہر کہ ہر بحر خلافت و شہزادی۔ گوہر وجود  
ما و شاہ از یک بحر سر آرد و تازہ گل سلطنت حرفین از یک شاخ نشو و نما کردہ۔ اگرچہ برادر  
دا بہتر از فرزندان می شمارم۔ و ہر چند ہر سری لیکن بہ کالہ جلالت می پندارم۔ ستودہ آئین  
خودندی جان ست کہ قسمت پذیر بزرگوار و اشی بودہ انتقام مہام کن کہ الکیت وسیع و چند ہیں  
بادشاہان نامدار و راجا ملکات خودہ اند پر دازند و بحریک از باب غرض سرچشہ بیکانگی بجا ناک  
بیکانگی کہ رن سازند۔ سوائے صوبہ دکن و دوسرے صوبہ دیگر مثل گجرات و اجیر مملوک باشند معنائت  
غیبت۔ و آلا و مروت کشاکش فائدہ مترتب نمی شود۔“

محمد اعظم نے خط پڑھ کر جواب دیا

”اے دانائے مراتب روزگار، پمصلحت بکا طراقدس راہ دادہ و این چ قسمت است کہ قلم



انصاف گزارش نوید۔ سلطنت را کہ پر تو سیت از فلال انفال ربانی بورشہ چہ نسبت و  
 ملاقات را کہ بنائے است از جناب رزت اشترکت چہ مناصبت۔ این نور فین مطلق اوست  
 بر فرق ہر کے کہ شیت اوست می تا بد و اس دولت و اہستہ مکمل اوست ہر کرد و عالم  
 قم نوشتہ اند می باید اگر تقدیر سرشتہ این اسر فطیر قسمت باز سبقت بیچ پسرہ معذور پدر  
 بر تخت نشستہ۔ چنانچہ حرم ہر درویشاں مخموم است بادشاہ تبارخ ہم ملعون دلم۔  
 با وجود این اگر طریق سویت سلوک می بود معنائت نہ داشت۔ چارہ صومہ خود بگرفتہ و  
 چارہ صومہ دکن بین ہر دن بہ میزان انصاف در نمی آید و اس عقدہ اناخیل باخن مسکر  
 در نمی کشایدہ عروس ملک کے در کنار گیر دنگا کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زندہ۔

غرض کہ نام عبارت میں بہ شکل تشبیہیں ہیں نہ استعارے نہ منیات نہ بدیع۔ مگر پھر بھی ایک  
 کارنامہ ہے۔

حسن و عشق یہ کتاب اُس زمانے کی خیالی نثر نویسی کا اعلیٰ اور بہترین نمونہ ہے جس میں  
 فرضی طریقے پر حسن اور عشق کی شادی کرائی ہے۔ اُسی ضمن میں ان تمام  
 رسوم و رواج کی تشریح کی ہے جو شادی بیاہ کے موقع پر شرعاً اور امرا کے یہاں پرتے جاتے  
 تھے۔ عبارت نہایت شاداب اور دلگین ہے۔ ناوارد و استعاروں اور تشبیہوں نے پوری کتاب  
 کو بانگ و بہار بنا دیا ہے۔

منہکات اس میں اپنی خاص طرز عبارت میں لطافت و ظریفیت جمع کیے ہیں اور اپنی  
 شوخی سے لطیفوں پر گو یا سونے پر سہاگے کا عالم دکھایا ہے۔ ایک بوٹا  
 بے فزاں ہے جسکے لفظ لفظ سے خندہ گل کی آوازیں آرہی ہیں۔ غزالت کی ایک مجلس آہستہ  
 آہستہ اور نعمت خان عاتقی میر مجلس بنے بیٹھے ہیں۔

اسی رنگ کے چند رقعات بھی ہیں جو منشیات عالی کے ام سے موسوم ہیں۔ یہ بھی عجیب و  
 غریب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مسکین طرہ بہر گداز کیا ہے، ہنستے ہنستے خود بھی گوستے ہیں اور اسکا  
 بھی دیوانہ بنا دیا ہے۔

جنگنامہ اور رنگ زیب کے اُتھان کے بعد جو اعظم شاہ اور محمد معظم شاہ میں محاربہ اور مجاہد  
 ہو اسے اُسکی ایک مختصر دلچسپ تاریخ ہے۔ غزلی عبارت نے اُسکو ایک خوشگما تصویر یا ایک

مصطفیٰ اور مجاہدی آئینہ بنادیا ہے۔ عبارت مقتضی مسیح اور اس قدر سلیم اور دلچسپ ہے کہ تعریف محال ہے۔ اس تصنیف میں سب سے بڑا کمال یہ دکھایا ہے کہ اپنے رنگ سے علحدہ رہے ہیں اور کہیں نظراقت کی ہوا بھی نہیں گھٹنے دی، جو انکی تادراں کلامی کی بین دلیل ہے۔ کتاب کے فقرے فقرے میں درد و اثر اور جوش کوٹ کوٹ کر بھروا ہے۔ دیباچے ہی سے ایسی پردہ اڑائی ہے کہ تمام واقعات آئندہ آئینہ ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تعجب یہ ہے کہ نعمت خاں جیسا کہ لکھا جا چکا ایک استبداد سی اور مستعجب مزاج رلنے والا آدمی تھا۔ شہزادہ محمد معظم اسکا ہم مذہب یعنی شیعہ اور محمد اعظم شاہ مقتول سنی المذہب تھا۔ مگر پوری کتاب کو دیکھ جائیے ایک لفظ بھی ایسا نہ ملے گا جو مرحوم کی شان کے سافی ہو یا جس میں مشککہ انگیزی توہین، یا مذمت کا شائبہ بھی ہو بلکہ دونوں بادشاہزادوں کو بالکل ایک ہی مرتبے میں پیش کیا ہے۔ اور کسی ایک کے لیے بھی کوئی فقرہ کم و بیش نہیں ہے۔

فون نعمت | یہی مالی کی تصنیف ہے۔ یہیں مختلف شاہی کھانوں کے پکارتے کی ترکیبیں ہیں۔ عالمگیر کے آخر زمانے میں نعمت خان مالی کا اعزاز اور پاپے اعتبار اتنا بڑھ گیا تھا کہ پیشکا سلطنت سے مقرب خاں خطاب ملا۔ اور جواہر خانے کی دار و فلکی کی خدمت انکے تفویض ہوئی۔ عالمگیر کے انتقال کے بعد محمد معظم کی ملازمت میں رہے۔ جس وقت شاہ عالم دکن سے محمد اعظم شاہ کے مقابلے کے لیے چلے تو نعمت خان مالی بھی شہزادے کے ہمراہ کاب تھے۔ جس وقت گوالیار میں آئے تو انکو قلعہ میں دار و فہ جواہر خانہ کی حیثیت سے جواہر خانے کی محافظت کے لیے یہیں چھوڑ دیا گیا۔ جب حرب و مزب کا ہنگامہ نر ہو گیا اور محمد اعظم شاہ مغلوب ہو کر مقتول ہوئے تو دوبارہ محمد معظم شاہ سے ملے۔ اس مرتبہ ملازمان خاص میں منساک ہو کر دانتھنہ خاں خطاب آیا اور دقایق نویسی کی خدمت پر مقرر ہوئے۔ پیشکا و سلطان سے شاہانہ کھنے کا حکم دیا گیا۔ خد اسوام اس حکم کی کس نہ تعمیل کی گئی تھی کس قدر نہیں کہ اللہ (مطابق شیعہ) میں حیدر آباد جا کر انتقال ہوا۔ اور دارا میر موسیٰ قلعہ حیدر آباد میں مدفون ہوئے۔

نعمت خان مالی کی تمام تصانیف ملحدہ و جہت گئی ہیں۔ مگر منشآت نایاب ہے اور غنیمتیں اب نایاب ہے۔ ان کا کلیات قلمی خوشخط کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں

محفوظ ہے۔ نوٹہ کلام یہ ہے۔

کار با طرہ جفا پیشہ افتاد مرا      کہ یاد مکند و سنے رود از یاد مرا  
 کشد چو سوئے مہن بے قدرت لال مرا      گزند چو مار سیہ سایہ تنہاں مرا  
 نخواہد کرد ترک بہت پرستہاں زارم      کہ چوں شگ سلیمانیت مادر زاد تارم  
 می کند با ز این دل شوریدہ آزار خودش      من چرا منشی کنم او داد کار خودش  
 رشتہ حیاتم را بہجو رشتہ تبیح      صد گروہ بکار افتاد تا بیارہ چو ستم  
 نقش پائے او بر گامے کند باں در تم      خاک راہ و دست گشتن آسجوان من دست  
 کشتی اگر قرار گیری رسی بہ کام      مارے ازین قرار بہ بینم چہ می شود  
 میرا نے کہ ہو بے تو کم از اتم نیست      سیکند سایہ ہر شغل سیہ پوش مرا  
 بہ زم وصل او کا ش اینقدر ہم می قدم محرم      کہ چوں آئینہ حوئے از پس دیواری گفتم  
 کو کب سوختہ می کرد گر اندک مدوے      بہجو آتش بہ دل شگب تو جایی کردم  
 چو بار محرم بہ زم شراب کرد مرا      جگا و گرم رقیبان کباب کرد مرا  
 ز ہمیشہ رات بیاد اپنے ہو در گرہم      چو گل شگفتگی دل خراب کرد مرا  
 ارباب نظر رخصت گفتار نہ اند      مانع نہ ہیں وجہ بود سرمہ صہارا  
 درو ام اسید و ابر پتوے از آفتاب      لے سحاب بے مروت میشوی مائل چرا  
 می کند لرزاند آفرود عوے الی پر      میوہ از خورشید گیر دنگ از گل بودہ را  
 ہر کہ کیبار سجادانہ رساند خود را      این محال ست کہ تا خانہ رساند خود را  
 در نشاط آرد وصال دوستان شائق را      طلق صحبت نہی باشد کم از جام شراب  
 صحبت ست ملاقات مردم عالم      بہ میں کہ دست نہ و نہا بسر سلام شدہ است  
 تا ہی در کار خود مجوں چو اگر دایں تدا      مردن عاشق بہ آہے ایچا ہے بیش نیست  
 سود بیع و خضر ز ادراک حدیست      در نہ کرام قطع بہ عمر و را نہ بود  
 بے تعلق شو کہ تادے چہ می ریزد نبات      قابے امروزی سازد کہ فردا پشاند  
 بمر و ست کینفس نگذاشت دل را پیش من      این نہ رہم لایق بے اعتباری نیستم  
 بے تو ہر گاہ تا شاے گلستاں کردم      بہجو گل دامن خود چو ز گلستاں کردم  
 ما غرے بے صحبت آں تا ترین تو ان زند      در فرقتش جامے جز پر زمین تو ان زند  
 (الناظر، نومبر ۱۹۲۷ء)



# خود نوشت میرزا محمد حاس قزوینی

(بناب مرزا محمد عسکری صاحب بی لے)

چار مقالہ عروضی کو قدیم فارسی ادب میں جو منزلت حاصل ہے وہی درجہ عجب نہیں جو آئندہ  
دانش میں بیت مقالہ قزوینی کو حاصل ہو۔ ہمارے کرم بناب مرزا محمد عسکری صاحب سے  
چاہا تھا کہ یہ کتاب بھی لباسِ اردو سے آراستہ ہو جائے اور اسی خیال کی بنا پر عنایتِ ذوق  
و شوق سے اُس کا ترجمہ شروع کر دیا تھا، اور ایک ٹکٹ کے قریب کام ہو چکا تھا کہ کاپی سٹپ  
کے بگڑنے کی وجہ سے قلم رُک گیا۔

مصنف نے مقالہ ادلی میں مختراً خود اپنے حالات تحریر کیے ہیں، جو مرزا صاحب کی  
عنایت سے درجِ اتمامِ نظر کیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ علمِ ادب کے شائقین اس کے مطالعہ  
سے محفوظ ہوں گے۔ انشاء اللہ ترجمہ شدہ اوراق کے بعض دیگر اجزاء بھی وقتاً فوقتاً در نظر  
ہونگے جن سے ان مقالات کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن اصحاب کو بھی ہوگا جو اصل کتاب کے  
مطالعہ سے بہرہ مند نہیں ہو سکے۔

ایڈیٹر

ایچ۔ جے۔ دلالت۔ ابتدائی تعلیم | بندہ کا نام محمد اور میرے والد کا نام عبد الوہاب بن عبد العلی قزوینی ہے۔  
میرے والد "نائب" دانشوراں کے چار مولفوں میں سے ایک تھے۔  
درسخویوں اور اہل لغت اور ادباء و نقباء کے عزائم جو اُس کتاب میں درج ہیں غالباً انہیں کے  
سپردہ تھے۔ اُن کا نام اُس کتاب کے مقدمہ میں موجود ہے اور نیز اُن کے کچھ مختصر حالات مرحوم عماد السلطنت

محمد حسن خاں کی کتاب "الناثر والناثر" میں بھی مذکور ہے۔ میرے والد کا انتقال سنہ ۱۲۸۶ھ میں طہران میں ہوا۔ اور میری ولادت بھی طہران ہی میں غنائہ دروازہ قزوین میں پندرہویں ماہ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۰ھ کو ہوئی۔

اساتذہ کا ذکر | علوم متہ اور اسیامی کی تحصیل اسی طہران میں میں نے کی۔ سرٹ دستو اپنے والد سے اور مرحوم آقائی حاجی سید مستشفیٰ (جو قناعت آبادی کے لقب سے مشہور تھے) سے

درسہ میرا ایک میں پڑھی اور فقہ انھیں بزرگوار اور مرحوم حاجی شیخ محمد صالح قنطاری مدرس مدرسہ مذکور سے اور چند دن مرحوم حاجی شیخ فضل اللہ نوری سے اور علم کلام اور حکمت قدیم آقائی حاجی شیخ علی نوری سے مدرسہ خان مردی میں اور اصول فقہ مرحوم ملا محمد آئی سے مدرسہ خازن الملک میں اور اسکے بعد اصول فقہ خارجہ مرحوم آقا میرزا حسن اشتیائی کی خدمت میں ان مرحوم کے آخری تین چار سال کی مدت میں حاصل کیے۔ ان بزرگ کا تجرا در احاطہ معلومات تمام جزئیات علم حاصل میں واقعی حیرت انگیز تھا۔ مثل ان کے کم کوئی شخص اس واقفیت اور معلومات کا پیدا ہو سکتا۔ ایک آدمی اسی ایک علم کے فروع و مسائل پر حاوی اور اتنا ذہین و دلیخ قیاس میں نہیں آ سکتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بچپن ہی سے ان تمام علوم متداولہ میں ادبیات عربی ادبیات عربی سے طبی ذوق | سے اس قدر شوق و ذوق بھ کو کیوں تھا۔ بچپن اور شباب کا زیادہ

زمانہ اسی فن کے مختلف شعبوں خصوصاً علم نحو میں بسر ہوا اور عمر گرانمایہ اسم و فعل و حرک کے مسائل میں ختم ہوئی۔ اب بھی جب میں اُن گزشتہ ایام پر غور کرتا ہوں اور تلفت کی ہوئی عمر پر تاسف کرتا ہوں تو میری بہترین تقریحات اب بھی شرح زمینی اور ہفتی اللیب ہیں جو میرے واسطے اصل سبب سے بھی زیادہ خوشگوار اور مزیدار ہیں اور گویا عادت طبیعت ثانیہ ہو گئی ہے۔

۱۱۔ تقریباً سنہ ۱۲۸۰ھ میں ایکسی تدرکم جنس و ناث پائی۔

۱۲۔ تاسراہین شاہ کے آخری عہد یا مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں طہران میں وراثت پائی

۱۳۔ رجب سنہ ۱۲۸۰ھ میں طہران میں پیمانی پائی۔

۱۴۔ تشکیل سادہت موجود بین سنہ ۱۲۸۰ھ تک زندہ تھے۔ اسکے اب قبیلہ نہیں معلوم کہ کس تاج و ناث پائی۔

۱۵۔ مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں یعنی تقریباً سنہ ۱۲۸۰ھ میں طہران میں وراثت پائی۔ اسکے جنازہ پر تقریباً تمام اہل شہر کھستے۔ تمام دکانیں اور بازار بند کر دیے گئے تھے۔ اور وہ ایسا دن تھا کہ جو کس بول نہیں سکتا۔

من لوگوں کا ذکر جن سے بغیر۔ ان بزرگوں میں کہ جنکی مبارک ذات سے بغیر درس و تدریس کتب بھی  
 درست تدریس نہیں حاصل کیا۔

کے ہیں نے اپنی استعداد کے بموجب کسب فنشیں کیا۔ مرحوم حاجی شیخ  
 آدمی نجم آبادی ہیں۔ قریب دو تین سال تک ہر روز غروب آفتاب کے بعد جب وہ ایک گھنٹے تہذیب  
 جاتے تھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ان بزرگوں کی مجلس میں جیکہ یہ اپنے مکان کی بیرونی  
 منزل حسن آباد میں ریگ و زمین پر بے فرش تشریف فرما ہوتے تھے میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اس  
 مقدس ہستی اور اُن کے اصحاب اور شاگردوں کی صحبت سے مستفید ہوتا تھا.....

اُنکی زندگی کی سادگی، اُنکے خیالات کی صحیح سنبول میں آزادی جو غنیمت کہ مال کی بیداری اور موجودات

کے پردوں کو چاک کرنے میں اور اُس عہد کے لوگوں کی آنکھوں اور کانوں کے کھولنے میں اُنہوں نے  
 انجام دی۔ اُن کی مجلس کی عجیب و غریب منع اور صفت مذاہب رطل سلطان و پیرو بابلی و غیرہ  
 کی اُس میں شرکت اور مختلف مسائل مذہبی پر اُنکے مباحث کمال آزدی کے ساتھ جس میں کبھی کبھی  
 طنز و استہزا بھی اُن بزرگوں اور اُن کے اصحاب و کلامہ کی شان میں شامل ہوتا تھا۔ اور جو احترام  
 و بزرگی کہ اُنکے اصحاب اُنکے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی حرکت بلکہ مسکراہٹ بھی اُن کے  
 سامنے نہیں آ سکتی تھی۔ غرض کہ یہ سب امور اُس زمانہ کے عجائب و اوقات سے ہیں جو کبھی  
 نہیں بھول سکتے اور جن کو مفصل بیان کرتے کے لیے ایک کتاب چاہیے۔ بہر حال اسکو ایک  
 جگہ مستعرضہ سمجھ کے میں آگے بڑھتا ہوں۔

دوسرے استاد عظیم کہ جن کے افادات کثیر سے میں مستفید ہوا بقیۃ الفضل غامقۃ الادب آقائی  
 سید احمد ادیب پیشاور سی مدظلہ العالی ہیں۔ ان بزرگوں کی عادت تھی کہ گرمی کے موسم میں سب سے  
 کسی ٹھنڈی جگہ پر امام زادہ صالح تخریش کے صحن میں تشریف فرما ہوتے اور وہ ایک گھنٹے اُسی  
 جگہ ایک گھنٹے میں نشست کرتے تھے۔ میں یاد ہے کہ اُنکی تنگ مزاجی سے بڑا تھا مگر نیلے لباس  
 ڈھونڈ کر اُنکی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور ڈور کے کوئی سوال اُن سے ضرور پوچھتا جسکا جواب  
 شافی دہریتے اور میں اُس کو فوراً اپنے دماغ کے خزانہ یا کسی نوٹ بک میں محفوظ کر دیتا۔ ان کے ہر  
 ادبیات فارسی و عربی میں اور ان کا عجیب و غریب حافظہ کہ ہزار ہا اشعار غلی و غصی و غزل و اشعار  
 ان کو از بر تھے۔ فی الواقع آجکل کی اصطلاح میں محیر العقول تھا۔ مثلاً ہر وقت اور ہر مجلس میں جب

۱۔ سلف الدین شاہ کے شروع علم میں مئی ۱۳۱۳ء کے بعد طہران میں انتقال کیا۔



کوئی شعر عربی پڑھا جاتا اور اہل مجلس کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ شعر کس کا ہے یا کس زمانہ میں کہا گیا ہے تو وہ اُس کو سن کر تمام اشعار اُس قصیدہ کے جیسا کہ شعر ہوتا اسے نام شاعر اور حالات شاعر پر سنی شعر وغیرہ وغیرہ کے بے تامل نہایت تفصیل کے ساتھ بیان فرادیتے۔ میں جب اُنکو دیکھتا تھا تو مجھ کو وہ حکایت یاد آ جاتی جو عربی کی ادبی کتابوں میں حنا دراد یہ کے متعلق مشہور ہے کہ جس کو نقطہ شعر نے جاہلیت کے جہالت بھی کے اعتبار سے ہر ہر حرف کے سو سو بڑے بڑے قصیدے نکل رہے تھے ان کے حفظ تھے اور شعرا سے اسلام کا کلام مزید پراں۔ چنانچہ خلیفہ ولید نے جب یہ حال سنا تو اُسکو یقین نہ آیا اور اپنے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ وہ جائے اور اُن کا امتحان لے۔ اُس نے دو ہزار نو سو قصیدے تفصیل مذکور سے اُن کے نقل کیے۔ غرض کہ اُن کی قوسیت حائضہ کثرت عادات حفظ اشعار و لغات اور نیز اُن کا فلسفیانہ مزاج، زہد و تقویٰ اور گوشہ نشینی اور اُن کے جمیع حالات احوال کو دیکھ کر میں ہمیشہ اُن کا مقابلہ ابوالعلاء معری سے کیا کرتا تھا اور اُس میں بھی یہ فرق تھا کہ ابوالعلاء معری ادبیات عربی میں تادریک و ہر تھا اور یہ بزرگ و زبانون معنی عربی و فارسی میں نابغہ عصر۔ اُس کے اشعار کا دیاں اب سے دو تین سال قبل پیر میں میں نے شاہزادہ نصر الدولہ فیروز میرزا کے پاس دیکھا تھا۔ ہزار افسوس ہے کہ اب تک وہ چھپا نہیں ہے۔

اُن بزرگوں میں کہ جنگا حق تربیت میرے اوپر ہے مردم شمس العلماء شیخ محمد ہمدانی تزدینی عبداللہ آبادی ہیں۔ جو اپنے زمانہ کے مشہور ادیب اور میرے والد کے دوست اور "نامہ دانشوراں" کے پیارے ہونٹوں میں سے ایک تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ان بزرگ نے ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا۔ اور والد کی تنخواہ میں سے ایک تہہ اس حصہ ہم لوگوں کے واسطے مقرر کر دیا جسکی مدد سے میری نیک امان نے کہ اللہ اُن کی روح کو نور کرے ہم کو پالا اور پروردان چڑھایا۔

دوسرے وہ بزرگ کہ جنگے احسانات عظیم دربارہ تعلیم و تربیت میری گردن پر ہیں مردم ہر دا محمد حسین خاں مصنفہانی متخلص بہ فردغی لمقب بہ ذکا و الملک ہیں جو موجودہ ذکا و الملک آقا فی میرزا محمد علی خاں مظفر اللہائی کے پدر بزرگواستے۔ تقریباً دس بارہ سال تک اپنے عہد شباب میں برابر ان کے ان بزرگوں کی صحبت میں جو اُس زمانہ کے شعرا و ادبا اور اہل ذوق و کلب محقق تھے حاضری ہوتا اور ان کی

سلطہ و کبر و ابن خلدان رحمت خدا و ذکر خدا۔

سلطہ و کبر میری لے زمانہ میں لہران میں وفات پائی۔ نسک سہ وفات اس وقت یا نہیں جو مسلمان تھے یہ نہ جانتا

صحبت سے برابر مستفید ہوتا۔ یہ انہیں کی شفقانہ توجہات اور پدرانہ تربیت کا نتیجہ ہے کہ میں نے کسب اخلاق حمیدہ کیا۔ اس دس بارہ سال کے عرصہ میں برابر اُنکے دونوں سنا جڑاؤں یعنی آقائی میرزا محمد علی خاں ذکا والا ملک اور آقائی میرزا ابو الحسن خاں فردغی کے فیض صحبت سے بھی مستر اُفتنیاب ہوتا رہا۔ شروع میں میں ہر جودہ ذکا والا ملک کی خدمت میں فریج پڑھتا تھا اور وہ مجھ سے درس عربی حاصل کرتے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں یہ وجہ ہوا فتنہ مزاج و اختلاف و خیالات کے تسلیم و تعلم سے آگے بڑھ کے ایک مضبوط باطنی دوستی کا۔ اسلئے قائم ہو گیا جو آج کل کے ایسے زمانہ کی دوستی کے موافق نہیں اور اس کا دار حصول نفع اور دفع نقصان پر نہیں بلکہ اس کی جڑیگا لگی شرب اور استیلا و مذاق پر قائم و برقرار اور تدریجاً مضبوط ہوتی گئی اور میں امیدوار ہوں کہ یہ دوستی کہ جو انہوں ان الصفا کی دوستی سے کم نہیں ہے جب تک میری اور ان کی حیات باقی ہے انشاء اللہ محکم و مضبوط رہے گی۔

دوسرے اکابر بلحاظ میں اُسے کہ جو میرے ساتھ خاص لطف رکھتے تھے مرحوم شیخ فضل احمد نے تھے کہ میں نے اپنے دو بھائیوں میرزا ابو الحسن و احمدین اور آقائی حاجی، میرزا ہادی کی سبھی تعلیم میرے ہاتھ کی تھی اور میں نے ان دونوں آقا زادوں کو مسلسل دس سال تک پڑھایا اور اپنی ناقص ملاحظات کے مطابق ان کو اُس فن سے آگاہ کر دیا کہ جس میں پرس میں اپنی مرتبہ تعلیم تھا تو ان مرحوم کے خط جو ان کے فاضل علم کے تھے میرے پاس بھیجے جاتے رہتے تھے۔ جن کو اب تک بطور انکی یادگار رکھنے میں نے رکھ چھوڑا ہے۔ ان کے حرکات و اعمال کا برا نتیجہ کہ جو ان مرحوم کی آخری عمر میں ان سے سرزد ہوا ہے جسکی وجہ سے ان کی زندگی کا دنیا فائدہ پر گیا اس سے ان مرحوم کے مقامات عالیہ سے استخار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اپنے اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھیجا۔ اصل واقعہ کا علم خدا کو ہے اور اب وہ یہ دنیا گتہا گیا اور دنیا سے اُنکا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ قدیم مقولہ ہے کہ "اُذْکُرُوْا تَوَاقُّمَ الْخَيْرِ" پتے فرے ہو کس کوئی سے یاد کرو) راقم الحروف کو اس مقام پر اُنکے ذکر سے اُنکے اعمال کی طرح و تدبیر مراد نہیں۔ صرف یہ غرض ہے کہ اس جاگہ انکی شناختیں کا شرعیہ اور قدیم حقوق صحبت کا ذکر کیا جائے اور بس۔ زمانہ گزشتہ کے واقعات یاد کر کے بقول بھتی کے میں نے قلم کو تھوڑا سا اُٹاپا دیا۔

شروع ۱۳۲۲ء میں میرزا احمد خاں نے جو بالفعل منتش ادارہ مالیات

ندان کا سفر

غیر مستقیم (Auditor of Indirect Revenue) بنے

۔ اس وقت لندن میں تھے چونکہ قدیم کتب کے ساتھ ہر شوقیہ میرے مشق سے وفت تھے،  
 ٹھیکو لکھا کہ "نامناسب نہیں ہے کہ تیب تک میں بیٹا ہوں قم بھی لندن میں آجائے اور ہاں  
 کے بڑے کتاب خانہ (British Museum) کی سیر کرو اس کے بعد ہم دونوں مل کے  
 وطن واپس پلایں گے" میں نے بھی اس مشورہ منل کے موافق کہ "اندھا کیا چاہے دو انگلیں،  
 بڑا دل، اس دور و دماز سفر کا ارادہ کر لیا۔ اور اپنی مادہ شغف سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو گیا کہ جو  
 اس وقت میرے چوتھے بچے کے واسطے دروازہ قزوین کے باہر آنکھوں میں آنسو ڈھلایا ہو  
 لکڑی تیس اور جس وقت ڈاک کی گاڑی چلنے لگی تو اُنہوں نے مجھ سے فرمایا کہ "بھائی بھائی  
 اب میں تیرا چہرہ نہ دیکھ سکو لگی" الغرض پانچویں رنج الٹی شہادت کو طہران سے رخصت ہو کر  
 روس و جرمنی و ہالینڈ (Holland) میں لندن پہنچا اور وہاں اس کتاب خانہ عظیم اور  
 اس کی غنی و فارسی نادرو جو د کتابوں کو دیکھ کر اُن کے مطالعہ کا اتنا شوق مجھ پر غالب ہوا کہ  
 بے اختیار اپنے خاندان اور وطن کو یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالکل بھول گیا مگر اب تھوڑے وقت کے  
 واسطے کہ یہ تھوڑا وقت بھی اب اس سال سے گزر گیا ہے) اُن کا خیال میں نے اپنے دل سے  
 نکال دیا۔

پیامِ ہند | قریب دو سال تک میں لندن میں رہا اور وہاں انگریز مستشرقین کی ایک جماعت سے  
 ملاقات ہو گئی اور انجملہ پر و فیروز دہان (A. A. Bevan) ہیں کہ جو ادبیات  
 عرب علی، مخصوص جالبین اور محضریں کے اشارے کے تحت ہیں اور اس شبہ میں کتر کوئی شخص  
 اُنکی قابلیت کا ہوگا۔ اپنے فن میں بہت بڑے ستحر اور اپنے کام میں انتہا درجہ دقت اور احتیاط  
 سے کام لیتے ہیں جو بعض وقت وہم و دو سو اس کی عذاب پہنچ جاتی ہے چنانچہ نقاب بعض فرید و فرزان  
 کو تین بڑی جلدوں میں بیس سال کی محنت میں شہ لغایت ۱۹۱۲ء میں مقام لندن (London)  
 طبع کرایا اور بے تکلف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کی طباعت کو اتنی صحت و دقت کے ساتھ اس  
 آخری مہنت میں یورپ کا ایک بڑا ادبی شاہکار سمجھنا چاہیے۔

دوسرے سٹرائیس (A. G. Ellis) ہیں جو برٹش میوزیم کے کتابدار سابق اور اُن  
 گیب (Gibb Memorial) کے ایک ٹرسٹی ہیں۔ کتب قدیمہ کے چھاپے اور کتب

لغات بعض ان بلکہ بعض اردو میں اہر صوفی کہتے ہیں۔ میں نے بعض کہ اس لیے بحیثیت اصطلاح رہے دیا کہ اس  
 میں ایک ہی نقطہ ہے۔ مترجم



عربی و فارسی و ترکی کے نام اور ان کے مستشرقین کے عہد اور قعدہ اوقیانوف کی واقفیت میں بہت  
 دیکھتے ہیں۔ انکی تیار کردہ "برٹش میوزیم" کی فہرست کتب مطبوعہ عربی کی بہ بڑی عابدوں میں  
 ایک نہایت بیش قیمت تالیف ہے۔

دوسرے اُسٹونٹ علیہ سٹر آدرڈز (H. F. Amedroz) اوقات گیب کے ایک کن  
 بنال سامانی کی "تایخ الوزرا" اور ذیل تاریخ دمشق ابن العباسی کی طباعت انکی یادگار ہیں۔

دوسرے شہرستان شرق پر وینسر ادوارد برن (Edward G. Browne) کہ انکی  
 شہرت میری ہر طرح کی وصف و تعریف سے مستغنی ہے یہ بھی اوقات گیب کے ایک مشہور رکن اور  
 انھیں کے توسط سے بعض کتابوں کی تصحیح و طبع کا کام امانا سے مذکور کی طرف سے اس معیار پر

ہوا تھا۔ (۱۰) ارجمندی آخر ۱۳۳۵ء مسایط ۵ رجب ۱۳۳۵ء کیمبرج میں وفات پائی ۱۳۳۵ء  
 کے شروع میں اوقات گیب کے فرسٹوں نے "تایخ جہاں کشاے جوینی" کی تصحیح و طباعت مجاہد  
 سپرد کرنا چاہی اور میں نے بھی باوجود اپنی بے بسنائی اور تعلیم شان محنت و زحمت کے اس  
 کام کو متوکل علی اللہ قبول کر لیا اور اس مقصد کی انجام دہی کے واسطے ۱۰ رجب ۱۳۳۵ء  
 میں لندن سے پیرس کو روانہ ہوا کیونکہ وہاں متعدد نسخے اس کتاب کے موجود ہیں اور آخر ۱۳۳۵ء  
 تک پیرس ہی میں رہا۔

پیرس میں جن مستشرقین سے ملاقات ہوئی اور ان سے میں نے استفادہ کیا  
 حسب ذیل ہیں :-

پیرس میں فرانسیسی  
 مستشرقین سے ملاقات

(۱) اُسٹونٹ علیہ ہر توک ریمبورگ (H. W. Derembourg)

مشہور عربی داس اور طابع کتاب سیویہ "صاحب" الیفات مشہورہ۔ میں انکے پھر دس جوین کے قدیم  
 خط تیسری (حبکہ خط مستند بھی کہتے ہیں) اور اسی خط کے قدیم کتبوں اور پھر دس کے متعلق عجائبات  
 کوور (Couvreur) میں ہوتے تھے اکثر شریک ہوا ہوں اور غالباً وہ لکچر ہی کوور ہی میں  
 ہوتے تھے۔

۱۳۳۵ء یہ خط اس موقع پر ہستال کیا گیا جہاں آجکل ہاری زبان میں آثار ان تہتے ہیں۔ میں اُسٹونٹ علیہ کو "آہنائی  
 پر ترجیح دینا ہوں کیونکہ آخر ان کے لفظ میں کوئی تاسف و ملال کا جہان نہیں ہے۔ جو ہونا چاہیے۔

۱۳۳۵ء ۲۰ رجب ۱۳۳۵ء وفات پائی۔

۱۳۳۵ء ۱۹ رجب ۱۳۳۵ء پیرس میں وفات پائی۔

(۲) انسوف علیہ پارویہ درینار (Barbier de Meynard) جنہوں نے مسودی کی مروج الذہب کا ترجمہ ح اصل نو عبادوں میں چھاپا ہے اور اسکے علاوہ اور بھی کتابیں طبع کرائی ہیں۔

(۳) میونہ (A. Meinhart) مشہور ہندی و پنجابی۔ انہوں نے ہندوستان اور یورپ کی مختلف زبانوں کے صرف و نحو کا موازنہ کیا ہے۔ چند دن ان کے لکچررز میں جو سار بون (Sarabone) میں ہوئے تھے حاضرینہ ہوں۔

(۴) میو ہارت (Clement Meinhart) جنہوں نے عربی و فارسی و ترکی کی اکثر تصانیف کا ترجمہ یا تصحیح کی مگر کسی خاص فن میں تخصص نہیں کیا۔

پیرس ہی کے نیام میں آقائی میرزا علی اکبر خاں دستور اسے شرفِ امانت حاصل ہوا۔ یہ ایک مشہور عالم و مسنف شروع استبداد و مغیر میں ایک جاہل اہل ایران کے ساتھ اپنا وطن مالوت چھوڑ کر پیرس آ گئے تھے۔ اعلیٰ خدمت میں میں اکثر حاضر ہوتا اور اعلیٰ صحبت سے جی بچھڑتا۔ سچ پوچھیے تو جو لطفت میں نے اپنی عمر میں اس دنیا میں اُنھیں یا وہ وہی زمانہ تھا اور میں آرزو کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ مرنے سے پہلے یہ سعادت پھر نصیب ہو۔

ان کے علاوہ بناب آقائی حاجی سید نصر اللہ انجمنی دامت برکاتہ سے جو زمانہ موجودہ کے مشہور عالموں، شاعروں، اور ادیبوں سے ہیں بھگوانا زمانہ اوقات نصیب ہوئی۔ یعنی جس زمانہ میں "مرزا بنامہ" کی تصحیح و طباعت میں مشغول تھا ان بزرگ نے کہا ان اطمینان و فیاضی کے ساتھ کہ جو معرفت اُنھیں سے متوقع ہو سکتی تھی اپنا صحیح کیا ہو، نسخہ اصل کتاب کے بغیر کسی باقیہ لانا تھا اور اعتماد کے بھیکو غایت کیا اور اسی وقت سے اب تک سلسلہ خد و کتابت اُن بزرگ کے ساتھ جاری رہی جو میری سر فرازی کا باعث ہے۔

آخر سال ۱۳۳۳ء میں جب جنگ عمومی چھڑ گئی اور دنیا کے تمام کام روباہر مسلط ہو گئے (وجہ یہاں

۱۔ وسمیر اللہ میں پیرس وقات پانی

۲۔ استبداد و مغیر سے غالباً وہ زمانہ مراد ہے جو منظر "دین شاہ" کے آخر میں آزادی پسندوں کے ساتھ گفت جبر و ظلم کا تھا بقابلہ "استبداد کبیر" کے کہ جو محمد علی شاہ کے زمانہ میں ہوا۔ (ترجمہ)

لکھنا بے موقع ہے) جس کی وجہ سے میرا غاص کام پیرس میں رد کر اسجام پانا نامکن ہو گیا تو آٹائی حسین قلی خاں نواب نے جو میرے قدیم غنایت فرما اور اس وقت پیرس میں تھے اور اتفاق سے برلن کی سفارت پر مقرر ہو کر جانے والے تھے مجھ سے فرمایا کہ اب تم پیرس میں رہ کر کیا کر دے گے آؤ ہمارے ساتھ برلن چلو اور وہیں بیٹھنے والے رہو۔ وہاں کی بھی سیر کرنا اور وہیں بیٹھنے کے بعد جب جنگ ختم ہو جائے گی اور کاروبار اپنی اصلی حالت پر آجائے گا پیرس پھر واپس آؤ۔

اس تجویز کو کمال شوق سے قبول کر کے ۱۲ اربڑی اکچہ مسٹک ۱۸۸۳ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۳ء پیرس سے روانہ ہوا اور سویس (Schweiz) کی راہ سے آٹینس کی ہمر اہی میں پارون کے بعد برلن پہنچا۔ راستہ میں باوجود سخت دقتوں کے جو جنگ کی وجہ سے تمام مسافروں کو سفر میں ہوتی تھیں غاص نے کرب سفر ایک محارب ملک سے دوسرے میں ہوتا۔ مگر چونکہ میں ایک وزیر خزانہ کی ہمر اہی میں اور گویا آٹینس کے اسٹیشن میں تھا الحمد للہ کہ ان دقتوں اور تکالیف کا سامنا ہم لوگوں کو نہیں ہوا البتہ ہمارے داخلہ برلن کے قبوڑے ہی دنوں بعد تمام آمدورفت لوگوں کی جرمنی سے قطعاً بند ہو گئی اور وہ دو تین مہینے دو تین سال ہو گئے اور پھر بھی جنگ کا خاتمہ نظر نہیں آتا تھا۔ الغرض ساڑھے چار برس یعنی اتمام جنگ تک میں برلن ہی میں رہا اور چونکہ اوجھڑتیں کہ اس مدت میں قطعاً عام ہے تمام اہل ملک نے اٹھائیں ان کا ذکر اس مختصر مقالہ میں قطعاً محال ہے اُس کے لیے ایک کتاب "دو تہ الصفا" کے مجموعہ کے برابر چاہیے اور میں اس کام کو ان دو ارب کے حوالے کرتا ہوں جو آئندہ جنگ خلیفہ کی تاریخ لکھیں۔

قطعاً عام کا مفہوم جو میں نے اوپر کے فقرے میں استعمال کیا اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ قطعاً میں بھولا تنگی رزق صرف دو ایک چیزوں کی ہو سکتی ہے مثلاً روٹی یا گوشت یا اس کے سوا کوئی چیز۔ مگر اس جنگ عظیم کے انباؤ میں چونکہ جرمنی کا معاشرہ بڑی دیجی و دیں تہفہ نے پوری طرح کر دکھا تھا اس وطن کے جنگی جہازوں اور پندرہ ملین فوج کے ادویہ کے گویا اس کے گرد اگر دیک لوہے کی دیوار قائم کر دی گئی تھی کہ جس کا ٹوٹنا یا پھٹنا غیر ممکن تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام چیزیں مطلقاً اور کُل طور پر روٹی، آٹے، گوشت وغیرہ کی قسم سے یہاں تک کہ آلو، پیاز، دال، تمام اقسام غلہ، دودھ، پنیر، روغن اور تمام چیزیں کہ حیوانات سے بنتی ہیں اور تھنڈ و شکر مرتبے، سٹھرا سا بون، جوتے، تولیے، کمبل، ادنیٰ کپڑے تمام آکولات اور کُل استعمال و ضرورت کی چیزیں بالکل نایاب اور مستحکم ہو گئی تھیں وجہ یہ تھی کہ ضرورتیں اشیاء کو سلطنت نے اپنے تصرف میں لے لیا تھا اور ملک کے رہنے والوں پر



فی کس ایک مہینہ اور ایک مہینہ موت کے واسطے تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہر ایک مقدار مہینے! مثلاً ہفتہ بھر کے لیے فی کس ۲۶ سیر روٹی۔ ۳ سیر بوشت۔ ۵ شقال مینی ۲۵ گرام روغن اور مینہ کھ کے واسطے ۲ سیر شکر، ایک لٹرا اور تمام اشیاء اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔۔۔ اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ ہم ایرانی نسبت اہل ملک کے بہت خوش نصیب تھے اس واسطے کہ آقائی تھی زادہ کی کوشتیں بلیغ سے چونکہ ہم لوگ جنگ سے بے طریت (نیوٹراں) اور دولت جرمینی کے ہاتھ تھے ہم کو فی کس اشیاء مذکورہ کا دو تہ حصہ دیا جاتا تھا۔ یعنی ہفتہ میں بیچے ۵ شقال روغن کے، شقال اور بجائے مہینہ میں ایک اٹلے کے دو اٹلے بالآخر مرحمت ہوتے تھے

مختصر یہ کہ اس چار پانچ سال کی مدت اپنے قدیم دوست اور عنایت فرما محترم آقائی حسین قلی زادہ کی مصاحبت میں بسر ہوئی اور ان فاضل علامہ کی ملی و ادبی صحبتوں سے میں بڑا مستفید ہوا رہا۔ ان بزرگوار سے اس زمانہ میں سلطنت جرمینی کی اعانت سے ایک انجمن ہووم بکنیہ ایرانی (Germano Committee) قائم کی تھی جس میں تمام سوزا اہل ایران جو اس اثنا میں سبب راہ آمد و رفت بند ہو جانے اور روابط اتحاد و دوستی منقطع ہو جانے کے شل بیچارے مسافروں کے ادھر ادھر سرگرداں تھے۔ ہر چند کہ وہ اپنے وطن میں خوش حال اور متول تھے۔ آقائی قلی زادہ نے اس کمیٹی کے ذریعہ سے ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا تھا جس کی وجہ سے ایک جماعت کثیر ہمارے سمجھوتوں کی اس عالمگیر طوفان کے سمیوں سے بے خطر اور اس گرم ہوا کے تیز مہموں سے محفوظ رہے کہ ہر چیز کو جلانے والی تھی قہری ہمارے عانی میں محفوظ رہیں۔

بلکہ سچ پوچھیے تو اس چار پانچ سال کے عرصہ میں فضلاء ایران کی ایک منتخب اور عمدہ جماعت برلن میں قائم ہو گئی تھی اور مختلف اشخاص جو ایسے مشاغل و کاروبار کے ذریعہ سے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ آقائی قلی زادہ کی کوششوں سے ایک نقطہ پر جمع ہو گئے تھے اور جس طرح کمیٹیوں کا تھکے طوفان کے وقت سرچوڑ کے ایکجا جمع ہو جاتا ہے اسی طرح ہم مہمیت زادہ بھی کمال اتحاد کے ساتھ بسر کرتے تھے اور مسلمان اینہاؤں کی قربانی جو ہمارے باروں طریت مختلف مہدان جنگ میں ہو رہی تھی۔ ہم کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی سینا میں چند خرک مہارتیں

۱۔ سیر سے ایرانی سیر ۱۱ ہے جو تقریباً ڈیڑھ پینٹلک کا ہوتا ہے۔ ۲۶ سیر مغرباً ۲ سیر ہندوستانی کے برابر ہوے۔ دوسرے اوزان بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہئیں۔ (تقریم)

دیکھ رہے ہیں یا کبھی زخمی ہونے کا ڈر ہے یا ہوسے سپاہیوں کا منظر کسی راستہ لگی میں ہمارے چلنے  
ہو جاتا۔ یہ بڑے سولے و غور توں کی لمبی لمبی قطاریں تان بانی و قصاب و بقال کی دوکانوں کے  
ساتھ جیکے پرست پرستی پرستی پرستی ہوتا اور یہ بیچارے چھکے اپنے مقدرہ حصوں کے انتظار میں  
کھڑے ہوتے۔ بس اس کے علاوہ جنگ کے خارجہ جی آثار ہمارے دیکھنے میں نہیں آتے تھے  
اور ہماری آرام و اطمینان ظاہری کے ساتھ ہمارا یہ زمانہ گزرتا تھا۔

انجمن علمی و ادبی و برلن آقائی تقی زادہ نے ان اصحاب کی موجودگی برلن میں ہنسیت سمجھ کر ایک  
ادبی و علمی انجمن قائم کی تھی کہ جس کی نشست ہر شب چار شنبہ کو ہوتی اور اس پندرہ "میر کاوہ"  
کے دفتر میں جمع ہوتے اور نواع مسائل علمی و ادبی و فنی پر گفتگو کرتے۔ اور یہ بھی مقرر تھا کہ ہر ایک ممبر  
اس انجمن کا باری باری کسی خاص موضوع پر جو قبل سے وہ طرز اپنے واسطے مقرر کر سکتا تھا  
کوئی مضمون تیار کر کے ممبران انجمن کے سامنے سنائے۔

ممبران انجمن بنیان انجمن میں یہ حضرات تھے: (۱) میرزا فضل علی آقا محمد تبریزی بکسل سابق  
آذربائیجان جو فی الحقیقت ادبیات عرب میں بطولی رکھتے تھے۔ برلن میں آخری تاریخ جمادی الآخر  
۱۳۳۹ء وفات پائی۔

(۲) آقائی سید محمد علی خاں جمال زادہ جو ان لوگوں سے ہیں جن سے ایران کی بہترین آئندہ  
اسدیں وابستہ ہیں۔ اُن کی کتاب "روابط روس و ایران" اُن کی وسعت معلومات، ذہنیت انتقاد،  
اور تکتہ رسی بطرز اور پکا بہترین نمونہ ہے۔ اور دوسری کتاب "یکے بود و یکے بود" سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے  
کہ ایک انشا پر داز سہل و سادہ اور بے تکلف طریقے سے غیر زبانوں کے الفاظ خارج کر کے، ہر چند  
کہ یہ کلام آسان نہیں ہے، ایک عمدہ اور مفید کتاب کیونکر تیار کر سکتا ہے۔ یہ ایک خاص طرز و شیوہ  
ہے اگر کوئی ایرانی جدید یہ چاہے کہ اپنی زبان اور میں کچھ لکھے اور یہ بھی چاہے کہ سبب مجرب و  
کے کسی غیر زبان کے الفاظ و جملے اور اسباب بیاں اہل یورپ سے نقل کرے جیسا کہ اس زمانے  
کے بعض لکھنے والوں کا بر ا طریقہ ہے تو یہ بالکل ممکن ہے۔

(۳) آقائی میرزا محمود و خاں غنی زادہ آذربائیجان کے نہایت فصیح اور شیریں زباں شاعرین کا  
پُر لطف کلام "کاوہ" اور "ایرانشہر" کے صفحات پر اکثر شایع ہوتا رہتا ہے۔

(۴) آقائی میرزا حسین خاں کاظم زادہ مدبر مخلص (رسالہ) "ایرانشہر" سلسلہ برلن کہ خود دو رسالہ انکی

لمی و ادبی لیاقت کا بہترین ثبوت ہے۔

(۵) آقائی میرزا محمد علی خاں ترمذی آذربائیجان کے مشہور فاضل۔

(۶) آقائی سید محمد رضا خاں مساوات - مشہور فاضل و فلسفی۔

(۷) میرے قدیم دوست جو اس وقت برلن میں مقیم تھے آقائی میرزا ابراہیم پور دادا و عشر حائر کے مشہور شاخ صاحب طرز مہدیہ اس نقشب خاص کے جو ان کو قوم عرب اور زبان عرب کے ساتھ ہے الفاظ فارسی خالص استعمال کئے پرستے ہوئے ہیں، مثلاً خواجہ حافظ کے اس شعر پر یہ

اگر چہ غرض ہنر پیش یار ہے ادبی ست زبان خوش و لیکن ہاں پر از عربی ست  
خواجہ سے سخت ناراض ہیں کہ عربی کو جو ہنر کیوں شمار کیا۔ یہ حقیر باد جو دیکھ ان کے اس خیال سے  
یہی یہ کہ زبان عربی کے ساتھ اس قدر بہت: طرعی برتی جائے ہرگز متفق نہیں ہے مگر پھر بھی انکی  
عصبیت و عجز بہ قومی و وطن پرستی کا جان و دل سے معرفت ہے

برلن کے مستشرقین سے ملاقات | اس قیام برلن کے زمانے میں جن جن مستشرقین سے میں ملا اور  
ان کی معلومات سے بہرہ اندوز ہوا یہ حضرات ہیں:

(۱) پروفیسر مارکواریٹ (G. Marquardt) مشہور جرمن مستشرق صاحب تصانیف کثیرہ  
مثلاً کتاب "ایرالشہر" جس میں ایران قدیم کا جغرافیہ نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے وغیرہ۔ فی الواقع  
ان کا تجر اور وسیع معلومات عجائب و ذکاوت سے ہیں۔ ان کا حافظہ علوم کا ایک سمندر معلوم ہوتا ہے۔  
زبان ہلاوی و فارسی و عربی و ارمنی و سریانی کو بخوبی جانتے ہیں۔ ترکوں کے اس شہنشاہ و عسکری کا کہ  
اکثر دنیا کے مشہور لوگ زمانہ قدیم سے لیکر آج تک قوم ترک سے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم اور زردشت ان کے عقب سے کے بموجب ترکی الاصل تھے اور اس قسم کے ان کے عقیدے کے  
بموجب ترکی الاصل تھے اور اسی قسم کے ان کے عجیب و غریب خیالات کا انھوں نے خوب خاکہ اڑایا  
ہے۔ ارمنی لوگ ان سے بہت استعزاز رکھتے ہیں اور ان کی معلومات سے سیاسی فوائد کے خیال سے  
ان کا بہت زیادہ استہرام کرتے ہیں مگر ایرانی چونکہ ان کو نہیں پہچانتے ان سے کوئی فائدہ نہیں  
اٹھاتے

(۲) پروفیسر زاخاؤ (Eduard Sachau) کہ جن کی شہرت دنیا بھر میں ہے۔ عربی و

ریانی و سنسکرت کے عالم تبحر۔ فارسی بھی ایک عمدہ تک جانتے ہیں۔ اور سچان برودی کی "آلہا و الباتیہ"  
اور "تاریخ الہند" کی کمال خوبی سے محبت اور اس کا ترجمہ بھی زبان انگریزی میں کیا ہے۔ قریب میں سال  
سے کتاب مشہور "طبقات ابن سعد کی طباعت میں مشغول ہیں جس کی اب تک چودہ جلدیں شایع



ہونگے ہیں۔

(۳) دکتور مودتیز (H. Modtze) در کتاب غانہ در سنہ السنہ مشرقیہ برلن۔ جس قدر خطوط کہ اسلام میں جاری ہیں ان کے پڑھنے میں پختہ ہیں اور ایک بہت بڑی کتاب جس میں مختلف خطوط اسلامی کے ناس درج ہیں شروع زمانہ ہجرت سے آج تک تمام کتب اور اسناد سے جمع کر کے جو الفضل دنیا بھر کے کتاب خانوں میں موجود ہیں انھوں نے تیار کی ہے جو نہایت مفید مضمون خطوط عربی کے متعلق دائرۃ المعارف اسلامی میں مندرج ہے انھیں کے قلم سے ہے۔

(۴) ماسوٹ علیہ پر دوسور ہارٹن (Martin Hartmann) مشہور شرق اور زبان عربی و فارسی کے متخصص۔ ان کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ باوجود کبر سن سفید دڑھی اور خمیدہ قد کے شربس کی عمر میں برلن میں مجھ سے ارباب فارسی پڑھتے تھے اور مرنے سے ۹ دن پیشتر تک یہ عمل ایک جوانانہ ہمت کے ساتھ جاری تھا۔

(۵) ماسوٹ علیہ پر دوسور مان (Oskar Mann) زبان فارسی و کردی کے عالم۔ ایران میں متعدد سفر کر چکے ہیں اور زبان کردی میں مختلف تصانیف رکھتے ہیں۔

(۶) پر دوسور میتو (Eugen Mitto) مشہور عربی دان۔ "طبقات ابن سعد" ایک جزو ان کی تصحیح کے شایع ہوا ہے۔

(۷) پر دوسور فرانک (Frank) تخصص زبان سریانی۔

(۸) سیاسٹیاں بک (Sebastian Beck) نوٹ صرف و نحو زبان فارسی در زبان جرمن۔ باوجود کثرت اغلاط جامع ترین صرف و نحو کی کتاب ہے جو اب تک زبان فارسی کے متعلق خود فارسی یا کسی یورپین زبان میں لکھی گئی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ اس طویل مدت میں بھی میں سب سے بڑے اور سب سے بوڑھے جرمن مشرق (ایک ۸۸ سال کے ہیں) استاد نولڈکیہ (Theodor Noldke) کی شرف لیاقت سے مستفیض نہیں ہوا۔ ہر چند کہ اس کا کمال شوق رکھتا تھا، وجہ یہ تھی کہ میرے قیام برلن کے زمانے میں وہ استراز بورک (Strassburg) میں تھے اور ظاہر ہے کہ ایام جنگ میں ایک شہرے دار شہر جانا کس قدر مشکل تھا علی الخصوص ایسے دلوں میں۔ (Alsace + Lorraine) میں۔ استاد موسوٹ مشہور تاریخ ماسانیان اور مختلف قسمی تاہیات کے ایک مبسوط کتاب اور نام

۸۸ ستمبر ۱۹۱۹ء کو برلن میں وفات پائی ۸۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو برلن میں وفات پائی۔

علوم و فنون میں جو زبان عربی و عبری و سریانی و پہلیوی و فارسی سے قلعن رکھتے ہیں کمال و اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں جب استاد موسیٰ ہوت کی عمر ستر سال کی ہوئی تو یورپ کے تمام مستشرقین نے ان کی سائیکہ کے موقع پر دو ضخیم جلدوں میں ان کے حالات میں تیار اور شائع کی۔ اس کتاب میں استاد بزرگ کی ۶۴ تصانیف از قسم کتب و رسالات و مضامین کا ذکر کیا ہے۔ اور اس تاریخ سے آج تک ۱۸ برس گزر چکے قاتلاً اس عدد پر کچھ اور اضافہ ضرور ہوا ہو گا۔

یاد رکھئے | چونکہ مستشرقین کی صحبت کیا ہاں ذکر ہوا لہذا یہ نکتہ بھی جو میرے ذاتی تجربے سے ہے اس گفتگو کے آخر میں بیان کر دینا مناسب نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے تمام جموطنوں پر واضح ہو جائے کہ یورپ میں مستشرقین کے دائرہ میں اکثر مجھوٹے عالم نامہ شارلاتان اہلی اور حقیقی مستشرقین سے ہر ارب زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ مسئلہ تمام نوع انسان پر عادی ہے اور تمام ممالک دنیا میں اور ہر علم و فن کی نسبت یہ پایا جاتا ہے اور یورپی مستشرقین سے اس کی کوئی خصوصیت نہیں مگر کچھ یورپی مستشرقین کے متعلق یہ عجیب و غریب خصوصیت رکھتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یورپ مشہور فرانساوی شہر کے درہمکت کو راں آدم یک چشم بادشاہ است" (اندھوں میں کا ناراجہ) چونکہ اہل یورپ عموماً مشرقی ادبیات اور مشرقی علوم و فنون اور نیز مشرقی زبانوں سے ناواقف ہوتے ہیں لہذا مجھوٹے مدعیوں اور شارلاتانوں کے لیے جو محض رد ایک مشرقی زبانیں ایک حد تک جانتے ہیں اور انہیں میں امتحان دے چکے ہیں ایسا امتحان لینے والوں کی قابلیت امتحان دینے والوں سے کسی طرح زیادہ

لے مسند علامہ نے جو کتب ہاں ایرانیوں کے گوش گزار کیا ہے وہ ہم ہندوستانیوں کو بھی اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے۔ مصنفی اور نقلی مستشرقین کے متعلق فاضل صنف نے جو ایک سخت لفظ "شارلاتان" *Charlatan* استعمال کیا ہے اس کا ترجمہ بعض ہندوستانی انگلستان واپس شدہ عربی و فارسی محققین کی خاطر سے یاں ہمارے کیا گیا ہے کہ ان کو اپنے بعض اساتذہ کمال کی نسبت یہ لفظ ناگوار خاطر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم بے نیسب تفصیل ظلم کی غرض سے جب یورپ جاتے ہیں تو بیشتر ایسے ہی جو فروش گندم کا صاحب سے دو پارہ ہوتے ہیں جن کی قربانیوں پر اگر ان میں کی گئی ہیں اور اپنے زعم میں ہم ان کو آسان علم و فضل کا ایک درخشاں ترین ستارہ خیال کرنے لگے ہیں اور جب ہاں واپس آتے ہیں تو انہیں کی جھوٹی علمیت، مصدعی کمال، یزبان کی جودانی، نالک مزاجی اور قدیم طریقہ تعلیم و تلم سے کسر نفرت و حقارت کا انہماک انہیں کی تصانیف میں کرنے لگتے ہیں اور بچوں و بزرگوں کی ہوا ہمارے سر میں سرایت کر جاتی ہے۔ انکھرا حفظا من شرور تہہ ہاتھم۔ (مترجم)

نہیں ہوتی ایک عجیب وسیع میدان اپنے اظہار کمال کا پیدا ہو جاتا ہے لہذا یہ لوگ کوئی نہ کوئی وسیلہ  
 آموختہ کر کسی زبان مشرقی کی مسلحی پر تیار ہو جاتے ہیں جبکہ بعد اُس زبان کی تعلیم مع دیگر زبانوں کے  
 اُسی ایک زبان میں شامل کر دی جاتی ہے مثلاً فارسی و عربی و ترکی اور نیز تمام علوم و فنون کہ جو ان  
 زبانوں میں ہیں اور تمام متعدد پہچے کہ جو مختلف مقامات پر رائج ہیں۔ ان سب کی تعلیم کسی ایک  
 شخص کے سپرد کر دی جاتی ہے اور یہ لوگ بغیر کسی شرم اور خوف بدنامی کے (اس وجہ سے کہ عام  
 لوگوں کو اصل و نقل کی تیز ہی نہیں ہوتی) اُن تمام زبانوں اور علوم سے واقفیت کا دعویٰ کرنے  
 لگتے ہیں اور درس دنیا شروع کر دیتے ہیں اور تصنیفات بھی کرنے لگتے ہیں اور خاص خاص نظریے  
 بھی دنیا میں پیش کرتے ہیں اور کبھی یہ غصب کرتے ہیں کہ عربی فارسی ترکی کی کوئی کتاب لیکر اُسکو  
 نسخ کر کے افلاطون فاضلہ کے ساتھ بھجوا دیتے ہیں۔ ہر خلافت مسلمین زبان یونانی و لاطینی کے کہ ان زبانوں  
 سے اہل یورپ غمو اُکچھ نہ کچھ کمزور واقف ہوتے ہیں مگر ان بیچاروں کے دعوے عربی و فارسی شریفین  
 سے بہت کم ایک دسواں حصہ بھی نہیں ہوتے۔ اور کسی ایک چھوٹے شعبے تک ان دو زبانوں سے  
 محدود رہتے ہیں اور نصیحت و بدنامی کے ڈر سے یہ لاطینی و یونانی داں اپنی کلی سے پاؤں بڑھانے  
 کی جرأت نہیں کر سکتے۔ غرض کہ مقصد یہ ہے کہ ہرگز جو ملحق ایسے رسوم و عہدے کے الفاظ سے  
 مثلاً "سلم السنہ شرقیہ" "عضد الخن علی نلاں و نلاں" وغیرہ ہرگز صوکانہ کہائیں اور عام طور پر  
 اہل یورپ جو اس سلسلے میں لن ترانیاں اُڑاتے ہیں اُس سے چشم پوشی کر لیں تا وقتیکہ وہ بے اعتبار  
 کی کسوٹی پر پوری نہ اتریں اور اُسکو وحی منزل ہرگز نہ جانیں بلکہ ہر چیز میں حق و باطل کی تیز کی سیاق و سباق  
 خداداد کو تصور کریں اور اُسی معقول توازن سے تمام ایسے دعووں کو لا کریں تاکہ راہ کو چاہے اور  
 خضر کو غزل گرا دے چہاں سکیں۔

الغرض شروع جنگ سے ایکرا انتہا جنگ سے دو ایک سال بعد تک میں بولن ہی میں رہا  
 اور ہر چند کہ ولی تہاتھی کہ "ایخ جہاں کشاے جوینی" کی مطابقت کا انتظام کرنے کے لیے میں ہر سال  
 سے جلد ہونچوں مگر دابطہ دوستی بن الی اب تک درست نہیں ہوئے تھے اور اسی وجہ سے ایک  
 ایک سے دوسرے ملک میں سفر کرنے میں سخت دقتیں بھی واقع تھیں لہذا میری یہ تناسی طرح  
 پوری نہیں ہوتی تھی کہ حسن اتفاق سے اسی زمانے میں زامخانی علی غاں فردغی نکا و الہک ایران کی  
 طرف سے ممبر مقرر ہوئے صلح نامے میں شریک ہونے کے لیے ہر سال تشریف لائے۔ میں نے اپنی غرض  
 یعنی دہی ہر سال میں واپسی کی آرزو اُن کی خدمت میں عرض کی۔ انھوں نے فوراً بدوین تاخیر شاہزادہ



نصرۃ الدولہ فیروز میرزا وزیر خارجہ انت کی سادت سے کہ جو حسن اتفاق سے اُس وقت پیرس میں  
تشریف رکھتے تھے اور قدیم سے مجھ پر مطلق مناسب رکھتے ہیں۔ سفر کی مشکلات اور باپ پورٹ کی  
تعمیل وغیرہ کا ساتھ دے کر دیا۔ چنانچہ ۱۲ جولائی ۱۸۷۳ء (۱۲ جنوری ۱۸۷۳ء) کو پیرس  
سے روانہ ہو کر سوئس کی راہ سے چار دن بعد پیرس میں داخل ہوا اور پندرہ سواہ سال کی مفارقت کے  
بعد اپنے قدیم عنایت فرما آقائی ذکا والک سے ملا۔ مگر انہوں نے کہ ان کی صحبت کی سادت بہت  
مختصر رہے وہیں تک حاصل رہی۔ اس وجہ سے کہ آقائی موصوف سات آٹھ مہینے کے بعد ایران  
واپس تشریف لے گئے اور یہ زمانہ بھی زیادہ تر سفر ہی میں گزرا۔

معصیت غلام | پیرس سے واپسی کے بعد آقائی ذکا والک اُسی تہی صحبت، بشاشت چہرہ  
کے لیے وظیفہ | اور خرمی دل کے راقہ فحہ سے ملے گرا اُس ظاہر واری پر اکتفا کر کے چونکہ میری  
تنگی سبب کو ملاحظہ فرمایا تو گویا دوستی کے معنی دنیا کے لوگوں کو اس طرح سکھائے کہ فوراً میری تائید  
معاشر کے لیے کمر بستہ اندھ کر ساغی ہو گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر شاہزادہ نصرۃ الدولہ فیروز مرزا کی  
شرکت اور آقائی میرزا حسن خاں دوق الدولہ رئیس الوزراء کی فوری اجازت سے ایک سالانہ وظیفہ  
دولت ایران سے میرے واسطے مقرر فرمادیا اور ایران پہنچ کر مجھ پر مزید عنایت و لطفات کر کے اس  
وظیفہ کی وصولی اور اُس کا پونچا بھی اپنے ہی ذمے کر لیا۔ چنانچہ اُس تاریخ سے آج تک انہیں  
غیر توجہ کی کوشتوں سے وہ مجھ کو برابر پونچتا رہتا ہے۔ خدا اس کی جزا لے غیر مطلقاً انی دسمات باہرانی  
کے ساتھ ان کو عنایت کرے جس کی وجہ سے بالفصل میں آسودگی و آرام سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔  
آجندہ کا حال خدا کو معلوم ہے۔ مگر جو چیز سب سے زیادہ مجھ کو شرمندہ اور مغفل کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ  
اُن کے احسان و ہرانی کی توفیق سے اسے خالی ذلی زبانی شکر کے میں کسی طرح نہیں کر سکتا۔

پیرس میں اپنے قیام ثانی کے زمانے میں جن مشرقین فراسادی سے میں ملا ان میں ایک  
سیوکازانووا (Paul Casanova) ہیں جو ملاوہ زبان عربی میں متفہم ہونے

کے تاریخ و جغرافیہ بلاد اسلام میں (مخصوص مصر اور مختلف مذاہب و فرق اسلامیہ اور دول اسلامی  
کے سکون کی شناخت میں کافل ہمارت اور ان مباحث پر عمدہ تصانیف رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ  
میں نے غیر مشہور مشکل مسائل کی تحقیق نہایت دقت و موٹگی کے ساتھ انہوں نے کی ہے بلکہ اس کو  
اُن کا ایک نسخہ سمجھا گیا ہے۔ مثلاً ایک رسالہ لکھا جس میں کنا مشہور "الف لیلہ" اور اس کی

تہ ساری کتب میں مصر میں دولت باقی

ردایات اور مقامات جزائیائی کہ جو سندباد بحری کے سفر میں مذکور ہیں۔ ان سب کی اُنھوں نے کافی تحقیق کی ہے اور اگرچہ اصل حکایت ظاہر ہے کہ افسانے سے زیادہ نہیں ہے مگر اپنی تحقیق سے ان روایات تجارتی کو جو بھرے اور خلیج فارس کے ایرانی و عرب تجارت اور ہندوستان و جزائر بحر ہند کے مابین دوسری اور تیسری صدی ہجری میں قائم تھے سمات طور پر دکھایا ہے اور ان مقامات کو بھی جو اُس سفر نامے میں مذکور ہیں جلی و افسانہ نہیں بلکہ سب درست اور جزائر بحر ہند کے صحیح نام بتاتے ہیں۔ صرف اُن کے زیادہ تر نام اب بدل گئے ہیں۔ دوسرا رسالہ مشہور کتاب "اخوان الصفا" کے متعلق ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کی تالیف کس زمانے میں ہوئی اور اس کا مؤلف یا مؤلفین کون تھے۔ ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے قبل تصنیف ہوئی ہے اور اس کے مؤلف فرید اسماعیلیہ باعلیہ سے تھے۔ ایک اور رسالہ در خصوص ایک بڑی قلمی کتاب کے تحریر کیا ہے، جو کتابخانہ پیرس میں علم نجوم و تاریخ کے متعلق موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب "الکیمیاء" (Almagest) کے کتابخانے کا حسن صباح کے عہد کا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور رسالہ "اصحاب بن بریم" کے متعلق ہے۔ یہ لوگ طبرستان کا ایک مشہور خاندان تھا جس سے صاحب "مرزبان نامہ" کا بھی تعلق ہے۔ اس میں اُن مسکوکات کا بھی ذکر ہے کہ جو اس خاندان سے باقی ہیں۔ ایک اور رسالہ نہایت عمدہ اُن لوگوں کے متعلق ہے جو صاحب الزنج مشہور سے منسوب ہیں۔ جس نے ۵۵۰ھ میں مصر سے میں خروج کیا اور اُن کے حبشی غلاموں کو اور اُن کے مالکوں میں جنگ کرا دی۔ ایک اور رسالہ در خصوص خطوط ظلمات اور ہند کے ہے کہ یہ کس زبان میں اور کس خط میں لکھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی مشہور البقعات ان کی ہیں جو سب نہایت مفید ہیں۔

ان کے علاوہ مسیو گابریل فرنان (Gabriel Ferrand) دریا ایشیا تک جہاز سے ملاقات ہوئی کہ جو ایک نہایت محترم ہڈ سے آدمی ہیں اور جزائیا سے جزیرۃ العرب و بحر ہند اور روایات تجارتی در بیان ایران و عرب اور بنادر خلیج فارس و جزائر بحر ہند و سائر اوجاد و غیرہ کے اہم خصوصی ہیں اور ان کی تالیفات بھی ان مسائل پر کثرت سے ہیں۔

اس زمانے میں پیرس میں آقائی میرزا عباس خاں اتہال آشتیانی مقیم تھیں ان سے غائبانہ ملاقات اور سلسلہ خط و کتابت قائم ہوا۔ یہ ایران کے ایک نوجوان فاضل ادیب ہیں اور تہذیب و تمدن کے ساتھ طریقہ امتداد و تحقیق غربی کے جامع ہیں۔ در کمال محنت و مشقت اور جوانی کے زور و شور کے ساتھ آثار ادبی ایران کے از سر نو زندہ کرتے ہیں سرگرم ہیں۔

ایک اور فائنل بزرگ بین سے پیرس میں سرسری ملاقات ہوئی مگر کافی استفادہ انکی صحبت سے حاصل نہ کر سکا، تاہم ان کی مدت قیام پیرس میں کم تھی، آٹائی میر محمد حسین خاں نمید الملک حسابی ہیں۔ یہ طرز جدید کے مشہور لکھنے والوں میں ہیں اور ان سے سلسلہ خط و کتابت بھر ادا کا نام ہے۔

تبیح و تالیف کتب | جن دو چار کتابوں کی تبیح یا تالیف یا ترجمہ اس حقیر نے قیام یورپ کے زمانے میں کیا ان کے اسما و حسب ذیل ہیں: (۱) تذکرۃ الشعراء غوثی موسوم بہ لباب الالباب تبیح کی جلد اول کا ایک حصہ (۱۲) مرزبان نامہ (۲) البیہ فی سائیر الاشعار العجم الیبت شمس قیس ماری (۳) چہار مقالہ نفاذی غرونی سمرقندی (۵) جلد اول و دوم تالیف جہاں کتا سے جوینی (۱) الفل اس کی قیسری جلد کی تبیح و تالیف میں مشغول ہوں۔ (۶) ترجمہ لوائج جانی زبان فریچ میں (اس کا انگریزی ترجمہ مسٹر وینفیلڈ نے لندن سے چھاپا ہے)۔ (۷) ایک رسالہ مشہور شاہر مسعود سند سلمان کے حالات میں کہ اس کا انگریزی ترجمہ اسوفا علیہ استاد ہراؤن کے تلم سے شایع ہوا ہے۔ (۸) تذکرۃ الاولیاء۔ شیخ فرید الدین عطار کا دیوانہ جس میں ان بزرگوار کے حالات درج ہیں۔ (۹) مضامین متفرق بعض مجلات فارسی میں۔

محمد بن عبدالواہب قزوینی

۱۶ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۱۴ء

(الناظر، اکتوبر ۱۹۲۵ء)



ماسی  
غلام حسین خاں حنفی آفاق بنارس  
(رام نگر۔ بنارس ۷)

## تذکرہ شمس علی خاں

۔۔۔ جون ۱۹۱۶ء کو میں اپنے ایک دوست کے عقد میں شرکت کی غرض سے ہقام گونی گئے  
کیا تھا۔ یہ مقام ضلع بدوہی (اٹلیٹ بنارس) میں شامل ہے اور بنارس سے سولہ سترہ کوس کے  
فاصلے پر جانب گوشہ جنوب مغرب واقع ہے۔ واپسی میں علی الصباح اسٹیشن بنارس چھاؤنی پر اتر  
چند احباب بھی ساتھ تھے۔ عجب اتفاق کہ اس رات شہر آشیں پر اس وقت کوئی گاڑی  
یا آگ نہیں ملا۔ دوستوں کی ریلے ہوئی کہ شہر تک ٹہرتے ہوئے چلیں۔ شہر میں رام نگر پہنچنے  
کے لیے متعدد گاڑیاں اور کثرت کے لیے بائیں گے، یا دریا کی راہ بہ آسانی مکان پہنچ جائیں گے  
الغرض ہم لوگ خراماں خراماں طاہران کی راہ سے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

اس وقت میرے ساتھیوں میں علاوہ دیگر احباب کے میرے چھوٹے بھائی محمد شمس علی خاں

آج بتاؤں گا ایک مشہور قبرستان ہے۔ جسے میرے انوں نے ادبائی میں۔

سلطان اور عالم محمد نعیم الدین صاحب بھی تھے۔ یہ صاحب حکیم محمد عطا کریم عطا سوہسروی مردوسک صاحبزادہ  
ہیں اور عالم عظامردوم سیرے کشتی یار تھے۔ ناظران کے قریب پہنچ کر ان لوگوں نے شیخ  
علی حزیں کی قبر دیکھنے اور اس پر فاتحہ پڑھنے کا امتیاز ظاہر کیا۔ تبریح کی دید کا نشان پڑھیں  
ناظران کے اندر داخل ہوا۔

مرد شیخ علی حزیں کے آس پاس ہزار ہا پختہ و تمام جدید و کھنہ قبریں موجود ہیں۔ انہیں  
کوئی قبر سنگ مرمر کی سفید شفات چمکے ہی ہے کسی قبر پر چمن سلور کی ڈال چڑھی ہوئی ہے جس پر  
نقاب کی شفات پڑنے سے نظر کو خیرگی ہوتی ہے۔ بہت سی قبریں مولیٰ اینٹ پتھر کی گلاب  
برس کی کہنہ ہیں، جنکو ہر سال اپنے بارش کے چھینٹے دے دے کر گھٹا سے بھی کہیں زیادہ یاد  
نبار کھا ہے۔ اکثر پرانی قبروں کے سنگ تھوڑے جابجا سے ٹوٹ گئے ہیں۔ کس کا لحد پتھر  
تو کسی کا پورا پتھر نثار ہے بعض بعض قبروں کو اونچے اونچے رزقوں نے اپنے سامنے  
لے رکھا ہے۔ کچے قبریں گھانٹوں نے اپنے دامن میں چھپالی ہیں۔ ان قبروں کا یہ منظر کھل کر  
بھنے زیب انسان کا بشعرد جو ان کی قبر پر کندہ ہے، یاد آگیا۔

غیر سبز و پوشیدہ کے مزار مرا کہ قبر پوش خریاں ہیں گیا ہیں است  
کچھ قبریں خام بھی تھیں، جن کا نشان اس طرح ملتا تھا کہ بعض مٹی کے ڈھیر زمین سے کچھ اونچے  
ہو کر بنائے تھے کہ ہم بھی کسی غریب کی قبر میں۔ انھیں مٹی کے ڈھیروں سے ملے جھلے بعض  
گرٹے زمین سے باہر ڈیڑھ یا تھوڑے بٹھکرا دھارت قبر بننے کا ثبوت ہے۔ یہ دیکھا گیا  
نیری زبان سے نکلا کہ

کوئی اتنا بھی نہیں پوچھنے والا انکا کیا گزرتی ہے کہو قبریں سونے والو  
جب ان قبروں سے گزرتا ہوا اس اکیلی قبر کے پاس پونچا جو مسجد و دروازہ ناظران (ناظرین)  
سے زیادہ قرب رکھتی تھی اور اس میں تصویات و تخیلات کا بار شاہ مسیحی منید سورہا تھا۔  
نہ شعر کی فکر نہ مصرعہ کا خیال۔ بعضوں آفرین کا ہوش نہ سنن سازی کے جو اس سنگ قبر پر  
دو تین شعر جو کسی زمانے کے سوزوں کیے ہوئے تھے، کندہ ہیں وہی تھارت میں کشتی علی

خزینہ خداداد ہو کر، کپڑے بدل کر ڈیڑھ سو برس سے بھی چند سال پہلے اس شہر کے اندر تھے کہ  
فرش پر خواب استراحت میں مصروف ہیں۔ قبر پر ایک مٹی کا چٹا بونٹ لٹا ہوا ہے۔ ان لوگوں کو اس قبر پر  
لچکے کی خبر سننے پر ہاتھ دھو کر اور کچھ مرچا لے کر ہوئے پھول جو کہ رہا تھا کہ ہم آج ہی کی رات اس  
پر چڑھائے گئے ہیں پڑے تھے۔

ہم اور ہمارے تمام ساتھی قبر کے چوتھے پرچہ بمقابلہ دوسری قبروں کے اونچا نہ تھا، جو  
آثار آثار کر چڑھ گئے ہمارے ساتھیوں نے بہت اشتیاق کی نفرت قبر کا گوشہ گوشہ دیکھا اور  
فاتحہ خواں ہوئے۔

ناظران سے رونا نہ ہونے پر اٹھائے۔ اور میں جہاں تک سناٹے حالات شیخ کے  
مجھے معلوم تھے میں نے سنا دیے مگر اس سے ان لوگوں کی پوری تشہی نہ ہوئی۔ بلکہ مسلسل ہاتھ  
شیخ کے سننے کا شوق بڑھتا نظر آیا۔ لہذا ان لوگوں کا ہاتھ ہوا اشتیاق دیکھ کر مجھے شیخ کے  
حالات کے دریافت کرنے کی تلاش و فکر ہوئی۔

کتاب فتح التوابع جو میرے پاس موجود ہے، وزیر کتبہ ہمارے موجودہ کتب خانہ بیکار  
آقاہم بادر و دیگر ذرائع سے شیخ کے حالات تلاش و کجا کر رہا تھا کہ میرے ہر ابن عاتق شیخ  
امام الدین صاحب نے جو، چون کو میرے ساتھ تھے شیخ کی سوانح قمری فارسی میں ہیں خود  
شیخ نے اپنی سوانح شت تلمذ کی ہے، طبیبہ سلمہ بی بی سیدہ ہری، انیس سے عاتقہ بزرگ  
دی۔ اگرچہ اس سے مجھے مزید اہم نہیں ملی۔ کیونکہ کتب خانہ سرکارہ قائم میں بھی ہیں باغی  
شیخ کی طبیبہ پڑیں مفاد ہند ہارس شتہ موجود تھی اس سے میں ضروری حالات کا ہتھار  
کر چکا تھا، تاہم میں حانظی کا شکوہ ہوا۔

الغرض یہ حالات شیخ کے جہاں تک سمجھتے و اختصار کے ساتھ ملے اختیارات متعارف  
درج کیے۔





بن مال الدین بن شیخ تاج الدین ابراہیم معروف بہ شیخ زائد گیلانی۔  
 شیخ زائد گیلانی شیخ صفی الدین اردبیلی کے مرشد و خسر تھے۔ شیخ صفی الدین اردبیلی زبیدی  
 کے سجاد و نشین اور شاہان صفویہ کے اجداد و حضرات۔ ام موسیٰ کاظم سے اولاد سے تھے انکا  
 سلسلہ نسب حضرت موسیٰ کاظم سے اکیسویں پشت میں ملتا ہے۔ بادشاہان صفوی اسی خاندان  
 سے تھے اسی وجہ سے صفوی کہلاتے۔

شیخ صدر الدین اردبیلی شیخ صفی الدین اردبیلی کے صاحبزادے اور شیخ زائد گیلانی کے  
 نو سے تھے۔ یہ نہایت نیک و صالح تھے۔ انکی نیکی پر پیرنگاری تیمور شاہ جیسے دی شہر بادشاہ  
 کو انکے مکان پر لے گئی۔ جب تیمور شاہ نے پوچھا کہ میں تمہاری کون سی خدمت کروں تو شیخ  
 صدر الدین نے کہا کہ اُن اسیروں کو جنہیں تم روم سے لائے ہو رہا کر دو۔ تیمور شاہ نے انکی  
 یہ درخواست قبول کی جس وجہ سے وہ احسان مند ہوئے شیخ صدر الدین کی موت ہو گئی اور انکا  
 اعتقاد انہیں تک نہیں رہا بلکہ اُن کو ان کی اولاد نے شیخ صدر الدین کی اولاد کا سنت و عہدہ  
 ملا۔ ۱۰۔

کتاب نفحات التواریخ میں تائید و ثبات شیخ صفی الدین اردبیلی اس طرح تحریر ہے:-  
 کہ سلطانی اولیا بود و در پائے تمیض عرفان است  
 دودہ التاج اعمیا بود و جد شاہان ملک ایران است  
 صاحب اردبیل شیخ صفی است کا تبت نکستہ غنی ذہلی است  
 ماد عاشورہ و ذوالحجہ و محرم ہوا کاں تلب شد بحر نعم  
 روز کفین او دو مستحب گو صاحب ننگہ ماں زلمست او  
 شیخ علی حزیں کے اجداد شہر سارا کے رہتے تھے۔ شیخ شہاب الدین شہر  
 سے لاہجان میں کہ مدہ ترین شہر گیلان سے ہے آٹ ارد قیام پذیر ہوئے۔  
 شیخ کے والد شیخ علی بن عماد اللہ الکی طر و مشہور شخص تھے۔ خان احمد خان اردشاہ

نے سو انگری شیخ عبود مسلم پڑھائی تھی۔ یہ نام شیخ جمال الدین علی بن عماد اللہ تحریر ہے کہ وہ  
 نسوں میں بہ نام عبود علی بن عماد اللہ تحریر ہے۔

بادشاہ گیلان سے ان سے کچھ پڑھا تھا۔ اس لیے بادشاہ انکی قابلیت علمی کی کمال منہم کرتا تھا۔

شیخ علی بن عطاء اللہ کے صرف ایک بیٹے تھے شیخ عبداللہ جنہوں نے کل علوم و فنون کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور تقویٰ کے باعث تارک دنیا ہو کر تھوڑی سی مٹی پر بسر کرتے تھے۔ شیخ عبداللہ کے تین فرزند شیخ عطاء اللہ و شیخ ابیطالب و شیخ ابوالیم تھے۔ شیخ عطاء اللہ فرزند البر تھے بولا ولد مرے۔ شیخ ابوالیم جو سب سے چھوٹے تھے خوشنویسی میں بہت قلم تھے شیخ ابیطالب (شیخ علی حزیں کے والد) بھی نہایت خوش نویس تھے ستر چالیس کتابیں انکے ہاتھ کی لکھی ہوئی انکے کتب خانے میں موجود تھیں۔

شیخ ابیطالب بعد تحصیل علم مرادی میں برس کی عمر میں افراسیاب بہت علماء سے حراق و معائنہ میں آئے اور آقا حسیں خوانساری سے درس لینے لگے۔

بحالت قیام اصفہان انکی شادی حاجی عنایت اللہ اصفہانی کی لڑکی سے ہوئی جو شیخ علی حزیں کی والدہ تھیں۔ جب سے شیخ ابیطالب کی شادی حاجی عنایت اللہ کی لڑکی سے ہوئی شیخ ابیطالب اصفہان میں رہنے لگے۔

تاریخ ۱۲۰۳ ھ "آخر سن" ہجری روز بدوشنبہ شیخ علی حزیں اصفہان میں پیدا ہوئے جب چار برس کے ہوئے تو گامشاہ محمد شیرازی نے جو اس وقت کسی ضرورت سے وارد اصفہان تھے بہر اللہ کرانی۔ آٹھ برس کی عمر میں ماسحین قاری اصفہانی سے قرآن مجید پڑھا۔ دو برس میں قرآن مجید ختم کر کے فارسی کی چند کتابیں نظم و شریطیں۔ پھر سالہ صرف و نحو و فقہ فہم کر کے پندرہ سالے منطق کے پڑھے۔

طبیت و وزوں ذہن رسا پایا تھا۔ شعر گوئی کی طرف رجحان ہو گئے ہر فن انکے اُستاد سے کرتے تھے مگر انکا میلان طبع اسکو چھوڑنے نہ دیتا تھا۔ جو کچھ یہ موزوں کرتے تھے پوشیدہ رکھتے جاتے تھے۔

سالہ تاریخ فارس مہجور سنہ ۱۲۰۳ ھ میں تاریخ پیدائش شیخ ۱۲۰۳ ھ مرادی لائسنسۃ تخریبہ جو غلط ہے لا محذور  
 سہولت حزیں مہجور طبع میں زکشتور سنہ ۱۲۰۳ ھ ہجری صغیرہ ۱۲۰۳ ھ مناجات تاریخ صغیرہ ۱۲۰۳ ھ۔



چند روز کے بعد فرط محبت سے اس کے والد نے خود پڑھانا شروع کیا۔ کئی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ اسی دربان میں اپنے والد کے ہمراہ لاہور اپنے چچا شیخ ابراہیم کے پاس گئے۔ اور ایک سال تک ہاں مقیم رہ کر، اپنے والد کے پاس سے اپنے چچا سے رسالہ غلامتہ الحساب پڑھا۔ پھر وہاں سے واپس آئے پرماجی محمد طاہر امجدانی و حکیم شیخ عسکرت اللہ صاحب سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اس کے والد نے خواہش تربیت شیخ غلیل طائفانی کے سپرد کیا۔ تین برس تک ان کی خدمت میں رہ کر استفادہ ہوا۔ یہ بزرگ شیخ کو شعر گوئی سے منع نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی خود نظم دیتے تھے کہ کچھ سناؤ۔ تخلص حنین انھیں کا عطیہ ہے۔

جب غلیل امجد طائفانی نے سفر آخرت اختیار کیا تو شیخ بہار الدین گیلانی سے درس لینے لگے اور فرط شوق و ذکاوت سے مختلف فنون و علوم کی کتابیں، جن کو پڑھنا تھا، مطالعہ کیا۔ شیخ ان لوگوں کو پہنچا کر آپ خرم آباد کو بھی سپاہیوں کے خوف سے نہ لایا۔ اس لیے وہاں سے روانہ ہو کر بصرہ آئے۔ بصرہ آنے پر خیال آیا کہ حج کا زمانہ قریب ہے۔ فوراً بصرہ سے روانہ ہو کر بغداد آئے۔ یہاں جہاز قبضہ حج مکمل رہا تھا سوار ہو گئے۔ پالیس روز کی مسافت طے کر کے جہاز ساحل بین پر پہنچا۔ ع۔ تقدیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی۔ شیخ اس مرتبہ پھر بچا ہو گئے۔ اور زمانہ حج گزر گیا۔ شیخ نہایت افسوس کے ساتھ اسی حالت بیماری میں واپس ہو کر بصرہ و لڑسان فلی ہوتے ہوئے خرم آباد آئے۔

شیخ بحالت بیماری خرم آباد میں مقیم تھے کہ احمد پاشا ابن حسن پاشا سردار روم کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ اور یہاں کے لوگ بھاگ بھاگ کر پاڑوں میں جا چکے۔ شیخ بوجہ علالت جمع چند دستکاروں کے وہیں رہ گئے تھے کہ احمد پاشا مع فوج ظفر منج شہر میں داخل ہو گیا۔ اب شیخ نے تنہا رہنا مناسب نہ سمجھا اور لشکر روم میں چلے گئے۔

سردار روم نے اپنی طرف سے ایک شخص کو وہاں کا حاکم مقرر کر کے وہاں سے مرا کی۔ شیخ بھی انھیں کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ بسبب ضعف و بیماری کران شاہاں میں آکر رہ گئے۔ جب بخوبی صحت ہو گئی تو کران شاہاں سے روانہ ہو کر بغداد پہنچے اور بغداد

سے کر باپے مٹلی و نعت اشرف میں تین سال مقیم رہے۔ یہاں سے بقصد شہد و خراسان روانہ ہوئے۔ مگر جنگ کا زمانہ تھا۔ تمام راستہ مخدوش ہو رہا تھا، شہد نہ جاسکے پھر کرمان شاہاں میں چلے آئے۔ یہاں سے آذربائیجان آئے مگر یہاں بھی آب و دانے نہ رہنے دیا اور بیل و گیلان ہوتے ہوئے شہر استارا میں جو کسی وقت شیخ کے ابداد کا وطن تھا، آئے۔ اُس وقت شہر استارا میں سبھی خاں حاکم تھا، بوجہ قابلیت علمی شیخ کی بہت قدر کی اور قیام کے لیے مُصر ہوا۔ شیخ اُسکے اصرار سے چند روز استارا میں مقیم رہے۔ یہاں شیخ کے چند ہمراہی طاعون میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئے اس وجہ سے شیخ وہاں سے روانہ ہو کر ازندراں آئے۔

جب شاہ طہاسب فتح روم سے برسرِ بیکار تھا، افغانوں نے موقع پا کر سرحد خراسان بمقام قبضہ کر لیا تھا۔ لچھ جسے کے مالک تو افغان ہو گئے تھے بقیہ حصہ خراسان پر ایک محمّد کرتے تھے اور موانع شکایہ کو اپنے والد سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح بہت سی کتابیں جو پڑھی۔ مہتممیں مل ہوئی گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طاعت و عبادت کا بھی شوق پڑتا جاتا تھا۔ مگر باوجود نثر و شاعری و لطائف کے شیخ کو صحبت شعراء و شغلوں و سخن سے کمال لہجی رہا کرتی تھی۔ ایک۔ وہ انکے والد کے پاس چند شعرا جمع تھے، انکے والد نے جو انکی مثنوی شاعری کا مال بانتے تھے انکو بھی بلوایا۔ شعرے حاضرین میں سے کسی نے طعنت کا کسی کا یہ شعر پڑھا

اب قامت بلند تہاں در کند تو      رمائی آئندہ یہاں قہر بلند تو

انکے والد نے انکی طرف توجہ ہو کر کہا مجھے علم ہے کہ تم کو شاعری کا شوق ہے اگر ہو سکے تو یہاں طرح میں چند شعر موزوں کرو۔ شیخ نے اُسی وقت ایک مطلع موزوں کیا۔ جب انکے والد نے اس پر دوبارہ نظر پڑی اور وہ سمجھے کہ یہ کچھ کہا پاہتے ہیں مگر ادب و محاب مانس ہے تو پڑھنے کی اجازت دی شیخ نے فوراً یہ مطلع سنایا۔

صید از برم کند خم جہ بلند تو      فرید از تل دل شکین کند تو

حاضرین صید بہت کموناً ہوئے، فرید اسرت سے اُچھل پڑے اسنت آفریں کی مابین بلند

برہمن۔ اسی اثنا میں شیخ نے دوسرا شعر سنایا

شدر شک طراز ادرت کو سے عاشقان      نہیں کہ یا و خرد و بانہا سپند و

الغرض اسی طنز تھوڑے تھوڑے غورو قائل میں دوسرے اشعار بوزوں کر کے سنانے، حضار بہت تعریف کی۔ اور کہا کہ اس طرح فی البدیہہ اشعار بوزوں کر تاہر نفس کا کام نہیں ہے۔ انکے والد نے بہت خوش ہو کر کہا اب میں نے اجازت دی تم شعر کہا کرو گراستدر شک نہ ہو جاؤ کہ وقت ضائع ہو۔

اسی زمانے میں شیخ کو چند احباب کی صحبت میں گھوڑا دوڑانے کا شوق ہوا۔ ایک روز چند دوستوں کے ساتھ گھوڑا دوڑا رہے تھے کہ گھوڑے سے گر پڑے اور داسنے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور ایک سال تک صلاح میں نہ آئی۔ شیخ نے انہیں ہاتھ سے کھینچ کر شوق کی اسی وقت ایک مشنوی ساتھی نامہ لکھا جس کا ابتدائی شعر یہ ہے

نہ ابا توئی آگر اذرا از ویں      بہشت از تو دارند باکاں ہوں

من دسنی و کج سینا      بہ آزادیم خط پیا

واقعات کے دیکھتے ہوئے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے تحصیل علم و حصول نفی صحبت علماء کے لیے بہت دور دراز کے سفر اختیار کیے اور حیدرآبادی تکلیفیں گوارا کی ہیں۔

اب تک شیخ نے تنہا گھر سے باہر قدم نہیں مکالا تھا والدین کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئے تھے کہ بغرض تحصیل علم و اربابا قائل شیراز کے دیکھنے کا اشتیاق ہو گیا۔ والدین سے اجازت کے خواستہ کار ہوئے۔ الفت پوری، جو خداداد عالم نے ہر ذی روح میں خلقی پیدا کی ہے، کبھی اگر تنفس نہیں کر نور نظر کو، آنکھوں کے سامنے سے ادم بھر کے لیے بھی اوجھل ہونے دے۔ تصور پتہ لائق اور ہونہار بیٹے کو۔ لیکن انکے والد نے جو خود ایک فی علم و قابل شخص تھے اور اپنے بیٹے کو یہ علم کا مہربا بنانا چاہتے تھے دل پر نہایت جبرگوارا کر کے اجازت سے دی۔

شیخ اجازت پاتے ہی خوشی خوشی مہمان سے روانہ ہو کر بعد قلع منازل طے مراحل۔۔۔

شیراز میں داخل ہوئے اور شیخ محمد مسیح فنائی سے کہ جو آقا حسین خوانساری کے شاگرد



تھے درس لینے لگے۔

کئی سال تک شیراز میں مقیم رہ کر چند کتابیں شیخ محمد مسیح فنائی سے پڑھیں اور جب شیخ محمد مسیح زندہ رہے دوسرے سے درس نہیں لیا۔ بعد ازاں شیخ محمد مسیح فنائی کے چند کتابیں مولوی لطیف اللہ شیرازی و باقر مولوی سے پڑھیں۔

عرصہ دراز تک شیراز میں مصروف تحصیل علم رہنے کے بعد شیراز سے روانہ ہو کر محال ہنیاسے فارس آئے۔ اگرچہ یہاں بجز چند تریہ معمرہ کے شہریت بالکل نہیں رہی تھی مگر اس مقام کو خوبی آئے ہو اسے نماز، مکانات و شکار گاہ سے دلچسپ پایا۔ چند روز وہاں قیام کیا اور وہاں کے علما و فضلا کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔

محال ہنیاسے فارس سے روانہ ہو کر اردکان فارس گئے۔ وہاں عبدالکریم ارکانی سے کہ عابد و عالم تھے علم نجوم میں کامل و متکاہر کہتے تھے، چندے صحبت رہی۔ وہاں سے پھر شیراز واپس آئے۔ چند روز شیراز میں قیام کر کے شہر فسا ہوتے ہوئے شہر گادرون کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر گادرون میں پہونچکر معلوم ہوا کہ عارف ربانی شیخ سلام اللہ سولستانی جسکا سلسلہ مشائخ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، دنیا سے کنار کش ہو کر پاڑ میں گوشہ نشین ہیں، انکی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض سے ایک گھانٹوں میں ٹھہر گئے وہاں کے رہنے والوں سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگ کسی کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ مگر شیخ کو ان سے اعتقاد خاص تھا۔ تقدیر را بہر ہوئی، حضور می حاصل ہو گئی۔ چند روز حاضری کے بعد شیخ نے یہ تناظر اہر کی کہ بقیہ زندگی اسی مقام پر بسر کروں مگر انھوں نے اجازت نہ دی۔ اور رخصت کیا۔ شیخ کا قول ہے کہ اس وقت تک مجھے حسب قدر لوفیق سعادت و خیر میسر ہوئی ہے انھیں بزرگ کی برکت اور نظر اشفاق کا نتیجہ ہے۔

شہر گادرون سے روانہ ہو کر شہر سولستان و شہر ہرم و خطہ لار ہوتے ہوئے بندر عباس آئے اور بقعہ مکہ معظمہ جہاز پر سوار ہوئے۔ خوبی قسمت سے جہاز ہی پر بار ہو گئے۔ جب جہاز ساحل عمان پر پہونچا ابھی جہاز سے اترنے بھی نہ پالے تھے کہ ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ اکثر ساز

جنگل میں پڑے رہ گئے۔ شیخ بھی اُسی حالتِ علالت میں پڑے رہے۔ جب صحت ہوئی تو زانہ  
مچ گزر چکا تھا۔ وہاں سے واپس ہو کر جزیرہ بحرین آئے۔ یہاں سے ساحل فارس بندہ سمور  
کنگ میں آ کر شیراز چلے آئے۔

اس سفر میں شیخ نے ملک فارس کی اچھی طرح سیر کر لی۔ اب انکے دل میں یہ سہالی کہ  
دنیا و لذات دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں میں کسی مقام پر جہاں گوشہ و پانی ہو، گوشہ نشینی اختیار  
کروں اور خلق خدا سے کنارہ کش ہو کر جو کچھ خدا سے اُسی پر قناعت کروں، لیکن کل امر  
مرہون باد قاتا۔ اس وقت شیخ کا یہ خیال پورا نہ ہو سکا، انکے والد کی تحریر پڑے امرار کی ملی جلی  
دیکھتے ہی شیخ کا دل بچپن ہو گیا تو رُاہِ ارادہ اصفہان شیراز سے روانہ ہوئے۔

اصفہان میں پونچ کر والدین کی قد سہی محل کی ابھائیوں سے ملے۔ شیخ کے والدین  
نے چاہا کہ انکی شادی کر دیں مگر شیخ نے اپنے اثنالِ ملی کو مانع سمجھ کر انکار کیا اور تہمتِ دو  
قانع الیالی کو نسب سمجھا۔

۱۲۷۰ ہجری میں انکے والد شیخ ابلیاب نے دنیا سے رحلت کی اور دو سال کے بعد  
انکی والدہ نے بھی جنت کا راستہ لیا۔ اب گھر میں بجز ایک ضعیفہ جدو مادری اور دو بھائیوں  
کے کوئی نہ رہ گیا۔ انکے چچا شیخ ابراہیم جولاہجان میں انتظام جاگیر کرتے تھے وہ پہلے ہی مر چکا  
تھے۔ شیخ ان صدموں سے بہت مغموم رہا کرتے تھے۔ اور انکے دل میں دنیا کی طرف سے  
نفرت اور گوشہ نشینی کی رغبت بڑھتی جاتی تھی۔ لیکن جب پساندگاں کی بکسی پر غور کرنے  
تھے تو مجبور ہو جاتے تھے۔

کل جاگیر و علاقہ شیخ کا صوبہ گیلان میں تھا۔ انکے چچا کے مرنے کے بعد کسی غوا کے منتظم  
نے ہرنے سے اُسکی آمدنی میں جیسے اُنکے تمام اخراجات کا امداد تھا، روز افزوں کی ہونے  
لگی۔ یہاں تک کہ اس اطراف میں جہاں جاگیر و علاقہ تھا روس کا قبضہ ہو گیا اور وہ ذریعہ  
آمدنی کا قطعی باتار ہا۔ اس کثرتِ حزن و ملال میں بجز شغلِ شعر و سخن کوئی دمساز و نواز  
نہ تھا جو دم بھر بھی انکا غم غلط کرتا۔

چرخ ستمگار اس پر بھی خاموش نہ بیٹھا یعنی شیخ اسی رنج و غم میں مبتلا تھے کہ ایران کے  
 نزل کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ افغانیوں نے سیرویس خاں قندھاری کو سردار بنا کر ایران  
 پر حملہ کیا۔ سیرویس خاں اصفہان پہنچا اور شاہ نواز خاں حاکم اصفہان کو قتل کر کے مالک خاں  
 بن بیٹھا۔ شاہ حسین صفوی ابن سلیمان صفوی سے جسکی زوجہ ایک مدت سے آرام طلبی کی مادی  
 ہو رہی تھی تدارک اشد و قرار واقعی نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ سیرویس خاں کا انتقال ہو گیا  
 اسکے بعد اس کا بیٹا محمود خاں قندھاری اسکا جانشین ہو کر کرمان یزد میں پہنچا اور قتل و غارت  
 کرنا ہوا اصفہان میں آیا۔ یہاں بھی لوٹ اور غارتگری شروع کر دی۔

اسی لوٹ میں اہل شہر کے ساتھ شیخ کا بھی تمام مال و اسباب و کتب خانہ جس میں قریب  
 ایک ہزار جلد کتابیں تھیں لٹ گیا۔ شیخ کے دونوں بھائی و جدہ مادی کا بھی انتقال ہو چکا  
 تھا۔ شہر کے لوگ ہر گوشے سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ یکم محرم ۱۰۳۵ ہجری کو شیخ بھی تبریز میں  
 اصفہان سے نکل کر قریب کے ایک گاؤں میں پوشیدہ ہو رہے۔

۱۵ محرم ۱۰۳۵ ہجری کو شاہ محمود قندھاری نے شاہ حسین صفوی کو قید کر کے تمام شہر پر  
 اپنا قبضہ کر لیا۔ شیخ یہ خبر سنا کر اس گاؤں سے روانہ ہوئے اور خوانسار میں چلے گئے۔ خوانسار  
 سے حرم آباد جو لرستان خلی کا دار الحکومت تھا پہنچے۔ یہاں علی مرداں حاکم حرم آباد کے  
 ہاں جو شیخ کا تاسا تھا، مقیم ہوئے۔ علی مرداں بوجہ علم و فضل کے شیخ کی بہت عزت و احترام  
 کرتا تھا۔

بوجہ صدقات متواتر و هجوم رنج و محنت شیخ کے قوالے داغی بیکار ہو گئے تھے اور کوئی مغلوث  
 صنفہ خاطر پر نہ رہ سکتی تھی۔ ایک سال اسی حالت میں گزری۔ جب صحت ہوئی تو حرم آباد کے  
 معززین و علماء سے ملے اور صحبت احباب سیر مقامات میں بسر ہونے لگی۔

شاہ طہاسب ثانی پسر شاہ حسین صفوی بن قید پر خیال تدارک ناغہ آذربائیجان میں  
 مقیم تھا کہ آذربائیجان کی خبر معلوم ہوئی۔ شاہ طہاسب مع لشکر قزلباش زوج روم سے برسرِ کار  
 ہوا۔ روم کی ممانعت کثیر ہونے کے اسوا فوج روم کو برابر مدد پہنچتی باقی تھی، اس وجہ سے



شاہ طہاسپ روم کی فوج تفریح کو روک دے گا۔

سب سالار روم نے خرم آباد پر حملہ کرنا چاہا۔ ملی مردان ماکم خرم آباد نے یہ خبر سنا کر مایا کہ خود شہر کو غارت اور خراب کر کے اور رعایا کو ساتھ لیکر کسی پہاڑ پر چلے جائیں کیونکہ فوج روم کا مقابلہ کرنا اور ان پر فتیاب ہونا مشکل ہے۔ شیخ نے بنظر ہمدردی یہ رائے دی کہ ایسے شہر شکستہ روم کو اپنے ہاتھوں خراب کر کے خلق اللہ کو پریشانی میں ڈالنا، بوڑھنوں، بچوں اور عورتوں کو سر ہلاکت رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ تمام لوگ متفق و مستعد ہو جائیں اور دشمن کو روکنے کی کوشش کریں۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا اور باہم عہد و پیمان ہونے کے بعد سب نے مسلح ہو کر حصار و قلعہ کو مستحکم کیا رومیوں نے آذربائیجان سے چل کر ہمدان پر ہو کیا اور بعد جنگ ایرانیوں سے ہمدان لیلیا اور بہت سے محرز نامی اشخاص کو گزنا کر لیا۔ ان قیدیوں میں کچھ احباب شیخ کے بھی تھے۔ جبکہ شیخ غیروں کے ساتھ ہمدردی و احسان کرنے کے عادی تھے تو اپنے دوستوں کو قید میں دیکھنا انکی حسرت اور ہمدردی کے کشتیاں ان شان تھا جس وقت شیخ نے اپنے دوستوں کا قید میں جانا سنا، بھین ہو گئے۔ اپنی جگہ پر خاموش نہ بیٹھ سکے۔ نشترا دیوں کو ہمراہ لیکر روم کے لشکر کی طرف روانہ ہوئے۔ لشکر روم میں اکثر معززین کمران شاہاں بھی تھے اور وہ لوگ شیخ کے قدیم شناساؤں میں تھے۔ شیخ نے ان لوگوں کے ذریعے سے تمام قیدیوں کو رہائی دلائی اور ان کا مقام محفوظ میں پہنچا کر آپ خرم آباد چلے آئے۔

سیستانی ماکم نیمروز جو شاہی نکو خوار تھا، بادشاہ سے سخت ہو کر قابض ہو گیا اور خود صاحب سک و خلبہ ہو کر شہد میں متمتع تھا۔ بادشاہ طہاسپ میں قوت محار بہ انی نہیں رہ گئی تھی جو ملک محمود کو اسکی خود سری کی سزا دے سکتا۔ بادشاہ اسی فکر میں تھا کہ ایک جماعت استر آبادی اور چند دیگر گروہ آکر لشکر شاہی میں شامل ہوئے۔ جب بادشاہ کی طرف جمعیت کا فی ہو گئی تو شاہ طہاسپ اور ملک محمود میں مقابلہ ہوا۔ چند روز تک خونریز جنگ ہوئی رہی باوجود  
ایک محمود قید ہوا اور قید میں ہلاک کر دیا گیا۔

جو گروہ اس جنگ میں شاہی لشکر کے مددگار اور شاہ طہاسپ کی فتح میں ساعی ہوئے

ان میں سے ایک گروہ کا سردار نادر قلی بگ بھی تھا۔ آدمی شجاع و بہادر تھا۔ جب شاہ  
 طہاسب نے اس جنگ میں اسکی کارگزاریاں دیکھیں تو یہ خیال کر کے کہ شاید اسکی بہ دولت ایران  
 کی زوالی حالت میں ترقی کی صورت پیدا ہو، نادر قلی کو خراسان کی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔  
 تقدیر راہبر تھی، رفتہ رفتہ موردِ الطاف شاہی ہو کر بہت بڑے مرتبے پر پہنچ گیا۔ یہاں تک  
 کہ طہاسب قلی خاں خطاب پایا۔ تمام ملکی انتظامات اُسکے ہاتھ میں رہے دیے گئے اور اُس کو  
 پورا استقلال ہو گیا۔ طہاسب قلی خاں کی روز افزوں ترقی دوسرے فراموشی دیکھ کر دوسرے  
 امرا و اراکین دل ہی دل میں بُرا مانتے تھے۔ طہاسب قلی خاں بھی اُن امرا و اربابِ منصب  
 سے معافی نہ رکھتا تھا، بلکہ اُن لوگوں کو غارِ راہ سمجھتا تھا۔

جب بادشاہ طہاسب شہد میں مقیم تھا، شیخ ازندراں سے روانہ ہو کر استرآباد پہنچے  
 ہوئے شہد آئے اور بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے بخیاں اُنکے علم و فضل کے  
 عزت کی۔ شیخ اراکینِ سلطنت میں شامل ہو کر بادشاہ کے حضور میں رہنے لگے۔

ماہِ صفر ۱۰۲۲ھ ہجری میں اشرف خاں اتقان مجددِ شاہ و قندھاری کا چچا زاد بھائی فوج  
 لیکر خراسان کی طرف متوجہ ہوا۔ بادشاہ طہاسب طہاسب قلی خاں سے دیگر امرا و اراکین فوج  
 موجود شہد لیکر بقصدِ مقابلہ روانہ ہوئے۔ بادشاہ نے شیخ کو بھی ہمراہ لینے کا حکم دیا۔ مجبوراً  
 منزلِ اول تک شیخ ہمراہ رہے مگر معذرت کر کے عقبِ لشکر اطمینانِ روانہ ہوتے رہے۔ شیخ  
 کو شہرِ سبزوار سے تپ آنے لگی۔ اتقان میں پہنچ کر ٹھہر گئے۔ جب اتفاق ہوا تو شہر سارا ازندراں  
 میں آئے یہاں سے چند روز کے بعد لہران چلے گئے۔

اشرف خاں اتقان بعدِ شکست فارس کی طرف بھاگا۔ طہاسب قلی خاں مع فوج آپ کے  
 عقب میں سامور ہوا۔ شیراز میں پہنچ کر اتقان و طہاسب قلی خاں میں پھر جنگ ہوئی وہاں بھی  
 اتقان کو شکست ہوئی۔ چند روز کے بعد خطہٴ لار میں پہنچا وہاں سے بھی شکست کے بعد

لے نادر قلی، امام قلی کہڑیے کا بیٹا تھا۔ مسئلہ ہجری میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں بہت غریب شخص تھا۔ ایک مرتبہ  
 اُٹروں کے گروہ میں رو کر لوٹا اسے گزرا فات کرنا پڑا۔

قندھار اور قندھار سے بلوچستان پہنچا۔ ہر جگہ اسکے ہمراہی کم ہوتے جاتے تھے بلوچستان  
 میں پہنچنے پر صرف دو تین ہمراہی باقی رہ گئے تھے، پسر عبد اللہ بلوچ نے اشرف خاں  
 افغان کو قتل کر کے اسکا سر سح ایک وزنی ہیرے کے جو اس کے بازو پر تھا ہما سپ شاہ کے  
 پاس بھیج دیا۔

ہما سپ قلی خاں اشرف خاں افغان کو شکست دیکر فارس سے روانہ ہوا۔ عربستان  
 ارستان نیلی ہوتا ہوا قلمرو علیشکر میں آکر حاکم بہدان و اشکر روم سے برسر پیکار ہوا اور فتح پائی  
 وہاں سے آگے بڑھتا آذربائیجان پہنچا اور وہاں سے جنگ کی۔ تبریز کو رومیوں کے قبضہ  
 سے چھوڑا لیا اور آب اس کے ایک طرف قبضہ کر کے حکام مقرر کر دیے اور دوسری طرف  
 امرے روم سے صلح کر لی۔ قلعہ ہرات خالی پا کر دشمن قابض ہو گئے تھے ہما سپ قلی خاں کی  
 طرف متوجہ ہوا اور قلعہ ہرات پر جا کر قبضہ کیا۔

شیخ طہران سے روانہ ہو کر اصفہان آئے۔ بادشاہ ہما سپ اس وقت اصفہان میں موجود  
 تھا۔ چھ ماہ تک بادشاہ کے حضور میں رہے۔ اس درمیان میں شیخ نے بادشاہ سے  
 چند مفید باتیں کہیں اور بار بار ایسی رائے دی جو باعثِ بقائے ملک و دولت تھی مگر موافق نہ ہوئی  
 نواح بہدان میں کچھ لوگ خود سر ہو گئے اور قلعہ درست کیا تھا۔ بادشاہ ہما سپ  
 انکی سرکوبی اور بقیہ آذربائیجان کو چھڑانے کی غرض سے اصفہان سے روانہ ہوا۔ شیخ کو بھی  
 ہمراہ لے لیا پایا مگر شیخ سامان سفر درست نہ رہنے کا عذر پیش کر کے رہ گئے اور وہاں سے  
 شیراز چلے آئے۔ چند روز شیراز رہ کر لاہ ہوتے ہوئے بند عباس پہنچے اور انگریزی جہاز پر  
 سوار ہو کر جیدہ آئے اور ایک قافلہ کے ساتھ جدو سے کہ منظم پہنچ گئے۔ ایک مدت کی تنہا

لے اگرچہ وہ مفید باتیں جو شیخ نے کہی تھیں معلوم نہیں ہوئیں کہ کیا تھیں مگر صورت حال سے ظہن ہوتا ہے  
 کہ وہ وہاں ہما سپ قلی خاں کے خلاف تھیں جس وجہ سے شیخ کی طرف سے بھی ہما سپ قلی خاں کو رہا  
 اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ کو عمر بھر کے لیے ایران چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔

لے یہ وہی بقیہ آذربائیجان ہے جسکی نسبت ہما سپ قلی خاں نے سردار روم سے صلح کر لی تھی



رج بیت اللہ شریف) پوری ہوئی۔

بادشاہ طہاسب اصفہان سے روانہ ہو کر نواح ہمدان میں پہونچا۔ وہاں احمد پاشا سردارِ روم سے جنگِ عظیم کے بعد صلح کر لی۔ احمد پاشا بغداد چلا گیا۔  
 اُدھر تو بادشاہ کا بہادر سپہ سالار طہاسب قلیخان جنگ اور دشمنوں کی سرکوبی میں مصروف تھا اُدھر یہ ضعیف اقل بادشاہ طہاسب قلیخان کے منصوبہ و مقبوضہ مقامات کھو رہا تھا۔

طہاسب قلیخان نے صلح ہمدان کو، جو بادشاہ نے احمد پاشا سے کی تھی نامنور کر دیا اور اسی نقص کی وجہ سے طہاسب شاہ کو تخت سے اتار کر اُسکے بیٹے عباس کو جو صرف چند سال کا تھا بادشاہ نامزد کر لیا۔ پھر آپ بطور نائب سلطان انتظامِ سلطنت میں مصروف ہوا۔

۱۶۴۵ء ہجری میں جب شیخ عبدہ حصولِ شریع بیت اللہ شریف بندر عباس میں واپس آئے تو سا کہ ایران میں تنیر حکومت ہو گیا ہے۔ بادشاہ طہاسب قید کر لیا گیا، طہاسب قلی خود متصرف ہو گیا۔ یہ خبر شکر شیخ روم تک بندر عباس میں مقیم ہے۔ وہاں سے روانہ ہو کر اصفہان آئے مگر اصفہان کو جاے اقامت نہ پایا۔ وہاں لارائے لارائے پر معلوم ہوا کہ لار کا حاکم سابق گزدا ہو گیا اور خانِ منظم کی طرف سے حاکم جدید مقرر ہو گیا ہے۔

بحکم خانِ منظم محمدخان بلوچ سردارِ فارس مقرر کیا گیا اُس نے باتفاقِ رائے حاکم شیراز خط لار کا قصد کیا جب محمدخان بلوچ کی فوج شہرِ جہرم میں پہونچی اور عبدہ یعنی حاکمِ جہرم سے

بوشیخ کا درست تھا کوئی معاملہ ملے نہیں ہوا تو نوبت جنگ کی پہونچی۔  
 اُدھر تو جہرم میں جنگ ہو رہی تھی اُدھر لار کے لوگوں میں غضب کی شورش مچ گئی۔  
 خزاں بلوہ ہو گیا اور بلوہائیوں نے حاکم لار کو مع چند غلاموں کے قتل کر ڈالا۔ طرقدارانِ خان

۱۶۴۵ء لفظ جو تاریخ ایران مولفہ منشی حسینی مدرس مبلوہ ۱۶۴۵ء مع اردو اخبار پریس دہلی۔  
 ۱۶۴۵ء طہاسب شاہ کے تخت سے اتارے جانے کے بعد طہاسب قلی خان کا لقب خانِ منظم ہو گیا۔

عظم نے اس بلوے کو باشارہ شیخ سمجھا۔ سردار فارس جو تہرہ جرم کو محصور کیے ہوئے تھا، اس بلوے کی خبر سنتے ہی حاکم شیراز کو مدد فوج جہرم کے محاصرہ پر چھوڑ کر خود لشکر گراں کے ساتھ خطہ لاریں آگیا۔ اور شہر میں قتل عام شروع کر دیا۔ شہر والے اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے انھیں کے ساتھ شیخ بھی نکل گئے اور بند عباس چلے آئے۔

احمد پاشا بید جنگ ہمدان بغداد کی طرف چلا گیا تھا اور خان منظم نے سلاج کو جو بادشاہ نے رومیوں سے کی تھی اسے منظور کر دیا تھا۔ جب یہ خبر روم میں پہونچی تو روم سے توپال پاشا سپہ سالار روم مع فوج کثیر کے اراد کے لیے بھیجا گیا اور بید جنگ عظیم کے خان منظم کو مل گئی۔ لیکن خان منظم نے چند روز میں پھر فوج جمع کر کے ۸۲۲ھ ہجری میں جنگ کی اور فتح پائی۔ توپال پاشا مارا گیا اور بغداد شریف میں مقبرہ حضرت امام ابو صفیہ میں دفن ہوا۔

جب شیخ نے ایران کی یہ حالت دیکھی تو دوسری ولایت چلے جانے کا قصد کر لیا جہاں سندھ کی طرف بارہا تھا۔ ۸۰۰ھ ہجری میں البارک ۸۲۲ھ ہجری کو اسی جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ غزوہ شوال ۸۲۲ھ ہجری کو جہاز ساحل ٹھٹھہ پر چھوڑ دیا۔ سندھ کا محاصرہ تمام ہے پونپنا۔ شیخ کا خیال تھا کہ یہاں کوئی شخص مجھے پہچانے گا مگر اسی روز ایک گروہ تیار ہونے کو فارس میں

۸۰۰ھ ہجری میں توپال پاشا کا ارادہ تھا کہ ۸۲۲ھ ہجری میں لکھنؤ سے جو صبح نہیں مدام ہوا کیونکہ ہونہر کا شیخ مہمور مسلم پریس دہلی ۸۲۲ھ ہجری کے صفحہ ۶۰۰ سطر ۹ میں مذکور ہے (تاریخ ہند) تحریر ہے۔

۸۰۰ھ ہجری میں شیخ کا حج سے ۸۲۲ھ ہجری میں بند عباس واپس آکر تیسرا ایران کی خبر سنا۔ اور شیخ کا یہ ادعا ہے ایران دیکھ کر بلا سندھ کی طرف جانا اور ٹھٹھہ میں غزوہ شوال ۸۲۲ھ ہجری کو پونپنا کھانا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ فارس صفحہ ۴۰۰ سطر ۶ و صفحہ ۴۰۱ سطر ۶ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۵۔ اس نکتہ پر سمجھ میں نہیں آتا کہ جب شیخ ۸۲۲ھ ہجری میں بمقام ٹھٹھہ (سندھ) آگئے اور یہ امر مسلم ہے کہ سندھ میں آنے کے بعد پھر شیخ کو ایران جانا میسر نہیں ہوا تو پھر ۸۲۲ھ ہجری میں حج کے بعد بند عباس کیونکر پہونچ گئے جو تیسرا ایران کی خبر سنی۔

شیخ کو دیکھا تھا پہچان لیا۔

خانِ معظم تو پال پاشا کو ارکرب اس مہم سے فتیاب واپس آیا تو شاہِ عباس نے  
 ۱۰ لڑکا جو بادشاہ کہلاتا تھا فوت ہو گیا، تختِ ایران خالی ہے۔ اسی درمیان میں تقریباً روز  
 ۳۲۰ تمام امرا و سردارانِ ایران نے جمع ہو کر خانِ معظم سے استعالیٰ کو آپ بادشاہت  
 ایران قبول فرمائیے، مگر خانِ معظم نے بظاہر انکار کیا۔ جب امرا و اراکین نے بڑبڑاہت  
 تمام ہرا کر کیا، اُس وقت خانِ معظم جو مذہبِ شیعہ ترک کر کے سنی ہو چکا تھا اس شرط پر بادشاہت  
 قبول کرنے کا وعدہ کیا کہ مذہبِ امامیہ موقوف کر دیا جائے اور سب لوگ سنی رہیں تاکہ ایک  
 مذہب ہو جانے سے تمام مسلمانوں میں سلوک اور موافقت پیدا ہو۔ اگرچہ یہ شرط تمام قوم کی مرضی  
 کے موافق نہ تھی اور نادشاہ کے مرنے کے بعد وہ لوگ پھر شیعہ ہو گئے مگر اُس وقت اس انقلاب کا قرار  
 کیا گیا اور خانِ معظم ۳۲۰ ہجری مطابق ۱۲۷۷ء میں لقبِ نادشاہ بادشاہِ ایران مقرر ہوا۔

شیخ چند روز ٹھہرے وہاں سے بسواری کشتی خد آباد میں جو سندھ کا ایک قریب  
 ٹھہرے چند روز کی سافت پر واقع ہے، آنے۔ اور خد آباد سے بسواری کشتی روانہ ہو کر  
 نین روز کے بعد شہرِ بکر میں پہنچے۔ یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے اور خراسان  
 کے تجارتی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوتے ہیں۔ مگر مغارت ایران اور انکی بیڑ سامانی  
 نے جو ان کو ہر دم ہمچین بٹھار رکھتی تھی یہاں بھی نہ رہنے دیا اور بھکر سے روانہ ہو کر تان گئے  
 تان بہت لانا چوڑا شہر نہیں ہے لیکن یہاں کے لوگ متمول زیادہ ہیں یہاں بھی  
 تنہائی و ناکاہی سے طبیعت پریشان رہی نہ لگا۔ ہزار خرابی چند روز تک تان میں مقیم  
 رہ کر اپنے پوش پریدہ و حواسِ رسیدہ کو یہ ندا دیتے رہے۔

مطربِ طالع برکش سائی شراب وہ ایامِ راجال فلک جواب وہ

۱۰۔ انا قیامِ تان میں بموسم گرادر یاے سندھ میں سیلاب آیا اور تمام صحرا و عمارت و مکانات پرانی  
 چرہ کیا آمد و رفت بذریعہ کشتی ہوتی رہی۔ جب سیلاب کم ہوا دہائی ہیریاں پھیل گئیں و پانی



پہننے تک۔ بلائیں ملتان پر نازل رہیں۔ شیخ بھی تپ میں مبتلا ہو گئے۔ اُسی زمانہ ہستی میں  
 شیخ ملتان سے روانہ ہو کر لاہور آئے۔ لاہور دریا سے اُنہیں کچھ کشمیر سے آکر لاہور سے  
 گذرنا ہوا ملتان جاتا ہے) کناٹے پر ہے اور بوجہ دارالقیام شاہان منلیہ کے نہایت خوشامد  
 بے نظیر شہر ہے۔ ایک تو علالت دوسرے تکلیف مسافت شیخ لاہور میں پہنچ کر نہایت  
 ناتوان ہو گئے تھے جب صحت ہوئی تو کچھ ایسے وجود پیش آئے۔ جنکے باعث شیخ کو لاہور سے  
 روانہ ہونا اور بلا خواہش و قصد دہلی آنا پڑا۔ دہلی میں ایک سال کے قریب مقیم رہے۔  
 ایران کی محبت کہیں آرام سے نہ بیٹھنے دیتی تھی درود و کرنش کی طرح دل میں مہلک  
 تر پادیا کرتی تھی۔ کابل و قندھار کی راہ سے خراسان پہلے جانے کا حکم ارادہ دل میں ٹھان  
 کر شیخ دہلی سے پھر لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔

ادھر تو شیخ خراسان کی تنہا میں دہلی سے روانہ ہو رہے تھے ادھر نقدیرا کی تنہا پرستی  
 تھی۔ کیونکہ ملک ہند کی زمین شیخ کو اپنی گود میں قیامت تک سلائے رکھنے کے لیے آغوشِ راز  
 کھول چکی تھی۔ الفرض ۱۲۹۵ھ ہجری میں جب شیخ لاہور پہنچے تو یہ خبر سنی کہ نادر شاہ کی فوج  
 ارادہ تھیروہاں قندھار قندھار میں موجود ہے۔ یہ خبر شکر شیخ نے اپنی بیوی پر سخت تاسف کیا  
 اور لاہور میں ٹھہر کر منتظر رہے کہ معاملہ قندھار ٹٹے ہو اور راہ میں امن ہو جائے تو خراسان  
 روانہ ہوں، مگر راہ میں امن ہونا کیسا وہ شورش جو قندھار میں پھیل رہی تھی سیلاب کی طرح  
 ۱۲۹۵ھ تاریخ بارس میں لکھا گیا ہے کہ ۱۲۹۵ھ ہجری میں شیخ لاہور سے دلی گئے اور ۱۲۹۵ھ ہجری میں پھر  
 ۱۲۹۵ھ ارادہ واپسی خراسان دلی سے لاہور آئے تو ۱۲۹۵ھ میں بخبر معلوم ہوئی کہ قندھار میں لشکر  
 تزلزلش موجود ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ نادر شاہ ۱۲۹۵ھ میں قندھار کا قصد کیا۔ تیسری  
 جگہ لکھا ہے کہ نادر شاہ ۱۲۹۵ھ ہجری میں آگئے۔ ملاحظہ ہو تاریخ بارس ۱۲۹۵ھ و ۱۲۹۵ھ  
 سطر ۱۹ و ۲۰ و ۲۱ و ۲۲ و ۲۳ و ۲۴ و ۲۵ و ۲۶ و ۲۷ و ۲۸ و ۲۹ و ۳۰۔ اس جگہ یہ سمجھ میں نہیں آتا  
 (۱) جب ۱۲۹۵ھ میں شیخ حج کے بعد بندہ عباس ہوئے اور تغیر حکومت ایران کی خبر سنی تو پھر ۱۲۹۵ھ  
 میں لاہور سے دلی کیو نہ آئے (۲) اور جب ۱۲۹۵ھ میں نادر کی فوج قندھار میں آئی تو شیخ نے ۱۲۹۵ھ  
 ۱۲۹۵ھ میں لاہور پہنچ کر یہ خبر کیوں کر سن لی کہ قندھار میں نادر شاہ کا لشکر موجود ہے۔

پنجاب کی طرف بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں میں اُس بڑے ہوئے میلے نے  
 تمام پنجاب کو گھیر لیا۔ علیٰ غرض لاہور خاص میں آمد اور شاہ سے غرض کی بجلی بج گئی۔  
 جب نادر شاہ اطراف لاہور میں پہنچ گیا تو شیخ بخوبی نادر لاہور سے روانہ ہو کر پھر دی  
 آئے اور دو تین روز مسکاردوں کو لیکر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

۱۵۰۰ ہجری میں نادر شاہ دہلی میں آیا اور محمد نامہ بادشاہ دہلی سے سخت جنگ ہوئی بارہ تر  
نظام الملک احمد شاہ کی کوشش سے صلح ہوئی اور نادر شاہ نے فوج تباہ کر دی۔ ۱۵۰۰ ہجری مطابق  
۱۷۱۷ء شہر میں آکر قلعہ شاہجہان آباد میں اُترا اور محمد شاہ کا نہان ہوا۔ دوسرے  
تیسرے روز جب جنگی ٹر خانے والوں نے پشور کر دیا کہ اور مارا گیا۔ تو ۱۵۰۰ ہجری  
کو نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کا حکم دیا۔ ۱۷۱۷ محرم ۱۵۰۰ ہجری مطابق ۱۲ اپریل ۱۷۱۷ء  
کو نادر شاہ ایران کی طرف واپس روانہ ہوا۔

منصل مال اور شاہ کے دہلی آنے کا یہ ہے کہ نادر شاہ نے جب افغانوں کو تندرہ سے نکالا تو تمام افغان کو ہستانی کابل میں پھیل گئے اُس وقت کابل میں سلطنت ہند کی طرف سے صوبہ دار رہتا تھا۔ اس لیے نادر شاہ نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے پاس ایچی صیبا کہ آپ بھی اپنے صوبہ کے نام افغانوں کے نکال دینے کے لیے حکم بھیجیں جس میں دونوں جانب سے دبا کر افغانوں کو قرار واقعی گوشمالی دی جائے۔

وہ ایلیچی نادر شاہ کا راستے ہی میں مار ڈالا گیا یہاں اُن دنوں پیش و عشرت کا کچھ ایسا نمل بلند ہو رہا تھا کہ ایلیچی کے قتل کی خبر کسی کے کان تک نہ پہنچی۔ چند روز کے بعد نادر شاہ نے پھر خط لکھا مگر اُسکا بھی جواب نہ درو۔ آخر کو نادر شاہ نے خود ہندوستان کا قصد کیا۔ یہاں کانوں میں ایسی غفالت کی روٹی بھری ہوئی تھی کہ بجز اچ گانے کے کسی دوسری خبر کی آواز ہی نہیں سنائی دیتی تھی۔ کابل و لاہور کے ماکوں کی جو غرضیاں آتی تھیں وہ بھی بغیر لحاظ پر ہی رہتی تھیں۔ بادشاہ کو انکے ماحول کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ یہاں تک کہ نادر شاہ نے کابل کو گھیر لیا۔ کابل کے ماکہ نے نہایت مضطرب کے ساتھ عرضی لکھی۔ جسوقت وہ خلیفہ پُرشاہ، بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا بادشاہ تہابِ اش میں زامیج دیکھ رہا تھا، سُرد بھی بڑھا ہوا تھا

ادشا دے عرضی لیکر اسکا گوشہ شراب میں ڈبوایا اور کی

این دتہ بے سستی غرق مے تاب اولی

انیرالہ مرانظام الملک آصفجاہ کی دانائی و تجربہ کاری کو اہل دربار نے ہوتے تھے  
اسلئے اورشاہ کی آمد کی خبر شکر آصفجاہ کو بلوایا اور صہرناورشاہ نے کابل فتح کر کے پھر محمد شاہ کو  
خدا کھا۔ یہاں دربار میں یہ اُنجمن پڑی تھی کہ کئی خط اور کئی ایچی آچکے اور سے جواب  
نہیں گیا۔ اب جواب کیا لکھا جائے۔ اور لکھا بھی جائے تو اس میں القاب کیا لکھا جائے! کیونکہ  
نادرشاہ کوئی غلامانی بادشاہ نہیں ہے۔ اتنے میں خبر آئی کہ نادرشاہ کا لشکر دریائے اٹک

اتر آیا۔ یہ خبر شکر اب یہاں بھی کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ خان دوراں مقابلے کے لیے مع  
فوج روانہ کیا گیا۔ برہان الملک کی ٹہنی کے لیے اودھ آوی بیجا گیا۔

خان دوراں فوج شاہی لیکر دہلی روانہ ہوا اگر اس سستی و آہستگی کے ساتھ روانہ ہوا  
کہ دہلی میں دہلی سے کرناں تک جو چالیس کوس کے فاصلے پر ہے پہنچا۔ شاہی فوج  
براتیوں کی طرح نہر کے کنارے پڑی تھی اور برہان الملک کا انتظار ہو رہا تھا۔ جلد اودھ  
سے برہان الملک آکر لشکر شاہی میں شامل ہوا اتفاق سے اُسی دن نادرشاہ بھی قریب آگیا  
مگر یہاں کسی کو خبر نہ ہوئی۔

چند گھنٹے زخمی و برحواں دورے ہوئے آئے کہ ہم بگل میں گھانس کھودنے  
گئے تھے۔ نادری قراولوں نے گئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا، ہم لوگ بھاگ کر یہاں تک  
پہنچے۔ ادھر یہ تذکرہ ہی تھا کہ چند قزلباش برہان الملک کے ڈیرے پر ہاتھ مار گئے۔ یہ  
خبر شکر برہان الملک فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور فوج لیکر لڑنے کو روانہ ہو گیا۔ خان دوراں کو  
جو یہ خبر ملی تو وہ بھی اپنی فوج لیکر برہان الملک کی فوج سے آ ملا۔ اودھ سے نادرشاہ بھی  
اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ولایتی فوج کو تین طرف سے حملے کا حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دستار  
میش پرورد فوجیں پریشان ہو گئیں۔ بہت سے سردار اسے آگے خان دوراں بھی زخمی  
ہوا۔ خان دوراں کے زخمی ہوتے ہی لشکر میں شکست کی ہوا اُڑ گئی۔ اب صرف برہان الملک



اپنے چند رفیقوں کے ساتھ میدان جنگ میں رہ گیا اور جوں مادی سے ہاتھی پر بیٹھا ہوا تیرا رہا تھا کہ ایک ایرانی فوج نے چار طرف سے گھیر لیا۔ ایک سپاہی گھوڑا دوڑا کر ہاتھی کے پاس آیا اور گھوڑے سے اتر کر رہتا تھا مگر ہودج میں جا بیٹھا۔ برہان الملک نے بوجب دستور ان اپنے کو گرفتار سمجھ کر کمان ہاتھ سے رکھ دی۔ ایرانی سپاہی ہاتھی کو گھیر کر اپنے لشکر میں لے گئے۔ نادر شاہ نے جرم بخشی کر کے عنایت فرمائی۔ اُس وقت برہان الملک نے موقع پا کر مصلحت آمیز گفتگو شروع کی اور نادر شاہ کو اس بات پر رضامند کیا کہ حضور ایک مقبول نذرانہ لیکر ہمیں سے

واپس تشریف لے جائیں۔ نادر شاہ رضی ہو گیا۔ برہان الملک نے اس حال سے بادشاہ کو اطلاع دی اور آصفیہ کو کہہ لکھا کہ تم آکر ہاں کا فیصلہ کر لو۔ محمد شاہ نے فوراً آصفیہ کو روکا کیا۔ برہان الملک آصفیہ کو ہزار لیکر نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بعد گفتگو یہ طرہ پایا کہ دو کروڑ روپیہ لیکر ہمیں سے ایران کو مراجعت فرمائی جائے۔ نادر شاہ دو کروڑ روپیہ لیکر ایران واپس چلے جانے پر رضامند ہو گیا۔ آصفیہ جاہ نے واپس آکر بادشاہ کے حضور میں کھل حال بیان کیا۔ دوسرے روز محمد شاہ اور نادر شاہ سے ملاقات کی ٹھہری۔ ادھر سے بادشاہ بڑے تزک و اتشام سے روانہ ہوا ادھر سے نادر شاہ نے اپنے بیٹے کو استقبال کے لیے بھیجا۔ وہ راہ میں آکر بلا اور بادشاہ کے ہمراہ ہو کر نادر شاہ کے پاس لے گیا۔ نادر شاہ لب فرش تک استقبال کے لیے آیا۔ اور اپنے منہ پر نہایت تعظیم سے بٹھایا۔ آپس میں باتیں شروع ہوئیں۔ پاسے کا دھڑپٹنے لگا۔ تھوڑے عرصے کے بعد بادشاہ نے ہنسی خوشی مراجعت کی۔

خان دوران کے زخمی ہو کر انتقال کرنے کے بعد اس لقب و منصب کو برہان الملک پنا حق سمجھے ہوئے تھا۔ مگر نظام الملک آصفیہ کے خطاب و ناصت پانے کا حال سنا تو آتش حسد سے ہلکا نادر شاہ سے کہا کہ حضور نے یہ کیا غضب کیا جو ہندوستان کے قارونی خزانے کو چھوڑ کر صرف دو کروڑ روپیہ پر رضامند ہو گئے۔ یہ رقم تو فقط غلام ادا کر سکتا ہے۔ شہر بابا سے چالیس کوس کے فاصلے پر ہے حضور وہاں تک تکلیف فرمائیں یہ شکر نادر شاہ خور

ہو گیا اور اسی وقت آصفیہ کو بلا کر کہا کہ تم ٹھہر جاؤ اور اپنے بادشاہ کو بھی بلاؤ۔ آصفیہ نے کہا کہ ہمدانے میں تو یہ شرط نہ تھی۔ نادر شاہ نے جواب دیا کہ ملک و سلطنت اور بادشاہ کی عزت و آبرو سے ہیں کوئی تعرض نہیں ہے فقط ایک مرتبہ ہم اور ملنا چاہتے ہیں۔

امیر الامرا نظام الملک آصفیہ نے تا چار پھر بادشاہ کو اظہار دی اور بادشاہ کو مجبوراً پھر نادر شاہ سے ملنا پڑا۔ نادر شاہ نے بادشاہ کو عزت و احترام کے ساتھ الگ خیمہ میں اترا دیا اور نادر شاہ نے بادشاہ اور آصفیہ کو یہاں رکھ لیا، اور اپنے ایک سردار کو فرمان دیا کہ شہر میں بھیج دیا۔ اُس نے جاتے ہی قلعہ دار سے کنجیاں لیں۔ اور تمام کارخانوں پر قبضہ کر لیا دوسرے دن نادر شاہ محمد شاہ کو لیکر دہلی آیا اور قلعہ شاہجہاں میں اترا۔

دو تین روز کے بعد ایک نیا سنگوفہ کھلا یعنی بھگیرٹانے سے زخماں خبر اڑی کہ محمد شاہ رنجیلے نے نادر شاہ کو مروا ڈالا۔ یہ خبر مو کی طرح شہر بھر میں پھیل گئی۔ جس خبر سے شہر ہونے کے ساتھ ہی بڑا غضب یہ ہوا کہ نادر سی سپاہی ایک ایک دو دو جگہ کی چوڑی میں بٹھاتے پھر رہے تھے لوگوں نے انہیں بے وارثہ سمجھا کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ رات کو نادر شاہ کو یہ خبر معلوم ہوئی اُس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ سب اپنی جگہ پر قائم رہیں اگر کوئی چڑھ کر آئے تو جواب دیا جائے ورنہ پشیمانی نہ کی جائے۔ رات بھر ہی حالت یہی رہی۔ صبح تک کئی سواری سپاہی آئے۔ مگر اراکین و ربار دہلی پہلے بیٹھے تماشہ دیکھ کیے۔ کسی کے کان پر چوں تاک رہی صبح اٹھ کر نادر شاہ نے پوچھا تو وہی حال سنا دیا آنکھوں میں آنسو تھری گئی۔ اسی وقت ہوا رہو کر شہر دیکھتا ہوا چلا کہ شاید مجھے زندہ دیکھ کر اب بھی یہ پلٹان نہ دے گا۔ مگر لوہان تھا کہ شہر نے اُس پر بھی تھپڑیں مارنے بلکہ بندہ و قیں چاہیں۔ نادر شاہ نے شہر کے گشت میں بھی دیکھا کہ بایجا ایرانیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ یہ دیکھ کر آنکھوں میں خون اُتر آیا اور تل عام کا حکم دے دیا۔ اور آپ روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں تلوار کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اور سپاہیوں نے گلیوں میں خون کے پر مالے بہا دیے، گھروں میں آگ لگا دی۔ نادر کا غصہ نہ اکا قرتما۔ بادشاہ اور تمام امرا بیٹھے یہ حالت دیکھ رہے تھے مگر دم نہ مار سکتے تھے۔

دوپہ کے قریب جب شہر میں کھرام بچ گیا، تعدادِ مقتولین کی شمار سے باہر ہو گئی تو سب نے  
 آصفیاء سے رجوع کی۔ آصفیاء وٹے گئے میں تلوار ڈالی اور سر پر پہنے کیے نادرشاہ کو سامنے  
 ہاکر کھڑے ہو گئے۔ نادرشاہ نے نظر اٹھائی تو آصفیاء کو روٹا پایا۔ پوچھا کہ چہ می خواہی؟  
 صفت جاہ نے کہا۔

کسے نماند کہ دیگر بیخ تا زکشی مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی  
 نادرنے شرما کر سر جھکا لیا۔ تلوار میان میں کی اور کہا کہ بریش سفیدت بخشیدم۔ اسی وقت  
 ایرانی نقیب شہر میں امان امان پکارتے ہوئے دوڑے۔ واہ سے نادری حکم جس نے  
 جہاں سے نقیب کی آواز سنی وہیں تلوار روک لی اور دم بھر میں امن ہو گیا۔ سلطنت کے  
 کاروبار کے ساتھ دونوں بادشاہوں کی صحبتیں پھر بدستور جاری ہو گئیں۔

نادرشاہ کو دہلی میں اراکینِ سلطنت کی حاسدانہ کارروائیوں کی بدولت دونوں ہاتھوں  
 سے لوٹنے کا موقع ملا۔ اُس نے اور اُسکے ہمراہیوں نے بشیار زرو جو ہر وزیرِ اعلیٰ یعنی وہ کل  
 دولت جو بادشاہ کے وقت سے شاہانِ منلیہ جمع کرتے آئے تھے سمیٹی۔ یہاں تک کہ کثرتِ دس  
 بھی جو شاہجہاں نے ساڑھے چھ کروڑ روپے کی لاگت میں تیار کرایا تھا نہ چھوڑا۔ سونے  
 بانہی کے پکی کے پاٹ ڈھلوا ڈھلوا کر اونٹوں پر لدوا دیے۔ غرض کہ دہلی سے اس قدر دولت  
 بادشاہ کے ہاتھ لگی کہ دو حیران تھا کہ اسکو کیا کروں۔ چنانچہ کل فوج کو تین ماہ کی تنخواہ پیشگی دی  
 ورسال بھر تک فارس کے باشندوں سے کوئی محصول نہیں لیا۔ اور صرف اسی قدر کی دولت  
 ہی پر نہیں اکتفا کیا بلکہ محمد شاہ کی بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی بھی کر لے کے بعد ۱۶ محرم ۱۱۵۲ھ  
 کو دہلی سے ایران کی طرف واپس روانہ ہوا۔

جب شیخ نے دہلی میں نادرشاہ کا آنا سنا تو شیخ کو پیدائش پیدا ہوا انا پار علی قلی خاں کے  
 مکان میں چپکرا اپنی جان بچائی اُسی زمانے میں شیخ نے ایک قصیدہ اہل ہند کی مذمت میں  
 لکھا تھا جسکی وجہ سے شعرائے شاہجہان آباد کو شیخ کے ساتھ مخالفت پیدا ہو گئی۔ اس وجہ سے  
 شیخ نے دہلی میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور تین سال کی ماہ تک دہلی میں رہ کر بہ ارادہ بنگال



دہلی سے روانہ ہو کر بنارس آئے۔ اور بنارس میں چندے قیام کر کے عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے  
 عظیم آباد میں کئی سال مقیم رہے، وہاں کے علما اور اُستاد سے ملے۔ ایک روز شہر کی سیر  
 کو نکلے تو دیکھا کہ شہر کے اُتر جانب ایسے گنگا اور کھن جانب ندی جلا واقع ہے۔ شیخ کی  
 نظر میں لتان کے سیلاب کی تصویر پھر گئی۔ خیال گذرا کہ کسی وقت اگر دریا اور ندی دونوں جو شہر  
 ہوے تو شہر عظیم آباد جو دونوں کے درمیان میں ہر غرقاب ہو جائیگا۔ پس ایسی جگہ رہنا مصلحت نہیں  
 ہے۔ اسیلے عظیم آباد سے روانہ ہو کر بنارس چلے آئے مگر بنارس آنے پر بھی شیخ کی یہی تئاری ہی کہ  
 ایران واپس چلا جاؤں لیکن خاک بنارس نے کچھ ایسے مضبوط قدم کھڑے کہ پھر ایران جانا کسی  
 ممکن و سیر نہ ہوا اور بہت سے موانعات پیش آتے گئے۔ جب شیخ کو کامل یقین ہو گیا کہ خاک نہ  
 مجھے ایران نہ جانے دگی میری قبر کی جگہ نہ ہی میں ہو تو شیخ نے ہر طرف سے سیر و سیاحت ترک کر کے  
 بنارس کو اپنا مسکن دائمی قرار دیا اور راجہ بلونت سنگھ سابق والی بنارس سے زمین لیکر روضہ فاطمہ  
 (فاطمہ) بنوا کر رہنے لگے۔ جس مقام پر فاطمان ہے پہلے وہ مقام صحرا میں شمار ہوتا تھا۔ احاطہ و  
 روضہ فاطمہ مسجد و شش نشین و باغ وغیرہ جہاں میں متعلقہ فاطمان شیخ کی توالی ہوئی ہیں جو اب تک  
 وجود ہیں۔ مسجد فاطمان شش سحری میں تعمیر ہوئی ہے۔ تاریخ تعمیر مسجد شیخ کی لکھی ہوئی یہ ہے۔

بہر خاک نہ دریں مسجد کز بر اسے عبادت است اینجا

ہر تاریخ اس بنا اتعفت گفت۔ در گاہ حاجت است اینجا

راجہ بلونت سنگھ سابق والی بنارس کو جو علما و فقہا اکہ بہت دوست رکھتے تھے شیخ سے  
 خلوص خاص تھا۔ اسیلے شیخ کی نہایت عزت کرتے تھے اور کبھی کبھی خود شیخ کی قیام گاہ پر جا  
 کرتے تھے۔ شیخ بھی راجہ مدوح سے نہایت محبت سے پیش آتے تھے اور راجہ کی ترقی و ترقی  
 کے لیے دعا گو رہتے تھے۔ راجہ مدوح اپنے صاحبزادے راجہ چیت سنگھ کو جو اُس وقت  
 بہت صغیر سن تھے کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے شیخ بہت شفقت و محبت سے  
 پیش آتے تھے اور اپنے پاندی کے کھٹولے پر مسیر کسی کو بیٹھنے دیتے تھے ٹھا لٹا کرتے تھے

اور رخصت کے وقت دعا کے ساتھ کچھ بطور تحفہ از ستم خواہرات اشرفی وغیرہ شے دیا کرتے تھے  
بعد وفات شیخ جب حساب کیا گیا تو قریب پالیس ہزار روپے کی اشیاء عطیات شیخ سے نکلیں۔

بارس کے قیام میں شیخ کے اخراجات معمولی نہ تھے بلکہ مثل امراء شاہزادگان اخراجات  
پاکرتے تھے۔ ناطقان کی تمام ناماء میں شیخ نے اپنے صرف سے بنوائیں مگر کسی کو آمدنی کا حال  
معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں سے آتی ہے۔ اس ہنگام اکثر لوگ مختلف روایتیں بیان کرتے ہیں۔ کچھ لوگ  
دست غیب خیال کرتے ہیں بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ شیخ کا خدشہ رسمی و صفائی میں تھا اسی کے  
دریہ شیخ کے تمام اخراجات ہوا کرتے تھے۔

نواب شجاع الدہ جب بارس آئے تو نظر علم و فضل و نبیائے عزت ایران شیخ کے قیام گاہ  
پر گئے۔ دروازہ پر پہرہ دیکر شیخ سے کہا کس عہد و روش رادرباں نباید۔ شیخ نے انرا  
استغاثہ فی البدیہہ جواب دیا کہ عہد باید تا گت نیاناید۔

شیخ کی طبیعت فن شعر گوئی میں ایسے تبحر اور ماکہ پر تھی جسکا اندازہ کراہت مشکل ہے شیخ  
کے ہستان آنے پر بڑے بڑے شعرا اپنے عہدہ عمدہ کلام بخلیہ اصلاح ستاتے تھے مگر شیخ اپنی  
ہندیبہ منانت سے سب کی تعریف کیا کرتے تھے۔ زیادہ اصرار ہونے پر اس طور سے الفاظ کو  
تبدیل کر دیا کرتے تھے جس سے حسن کلام و بالا ہوتا تھا۔ کسی شاعر نے بجا ہر اصلاح کی طرف  
سے یہ شعر سنا اگر باطن میں نبیال انمار کمال اپنے نزدیک چوٹی کا شعر پڑھا تھا۔

فصل از دوسہ مہایم کہ دریں نظرت تک انچہ در کیہ خود داشت ہر باب بخشید  
شیخ سنہ بابتبار ہمنوں آفرین تعریف کی جب انکا اصرار ہوا تو صرف دو لفظ بکر لطف شعر کو دہلا کر  
نہیں از چشم مہایم کہ دریں نظرت تک۔ انچہ در کاست خود داشت ہر باب بخشید

فجائت کا متن چشم سے بن نہ کر و سے او کیہ اس کے دینے سے کاسہ والے کا دنیا زیادہ قابل تعریف  
ایک روز کسی شاعر نے شیخ کے سامنے اپنا شعر پڑھا

سہ چوڑی دست از غار نازن دیم بتاخ مندی چہ ہمار مہریں دہم  
شیخ نے کہا کہ اس طعنت کی کیا ضرورت ہے اسی قدر کہہ دیا کافی ہے کہ

سید چڑی بادست آں شکارے      بناغ صندلی چمپہ وارے  
 سنا جاتا ہے کہ مزار نفع الدین سودا کا کلام شیخ کو بہت پسند آیا۔ جب شیخ ایران سے  
 ہندوستان میں آئے تو لوگوں سے پوچھا کہ شعر لے ہند میں انہوں کوئی صاحب کمال بھی ہے؟  
 لوگوں نے سودا کا نام بتایا۔ سودا نے جب سنا تو خود شیخ سے ملنے انکی قیام گاہ پر گئے اطلاق  
 کرائی کہ سودا حاضر ہے شیخ نے جواب دیا کہ سودا کہاں کیا کام ہے بازار میں جائے اور کلوخ  
 طفلان کھائے۔ اُس وقت سودا نے کہا یا کہ مزار نفع الدین متخلص بہ سودا حاضر ہے۔ پیکر شیخ  
 نے لمبا لیا اور کلام سنانے کی فرمائش کی۔ سودا نے کہا کہ میں تو حضور کے کلام کا شائق ہو کر  
 آیا ہوں۔ شیخ نے یہ شعر پڑھا

تائیر تو زہ کرد کاسنے بہ کیکنے      یک صید نیا سودا زانے پزینے  
 سودا نے تعریف کر کے فی الجملہ سکوت کیا اور یہ شعر پڑھا

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زانے میں      ترپے ہے مرغ قبلہ نانا آشیانے میں  
 اس وقت تک شیخ اُردو کے محاورہ (ترپے) سے ناواقف تھے پوچھا (ترپے ہے) چہ معنی دارد؟ سودا  
 نے کہا اہل ہند طہیدن را ترپا سیگوین۔ شیخ نے سودا سے شعر مکرر پڑھوایا۔ دوبارہ سننے پر  
 نہایت محفوظ ہوئے اور سودا سے بے لکیر ہو کر کہا تم نے تو قیامت کر دی ایک مرغ قبلہ نانا کہلاتا  
 تم نے اُسکو بھی نہ چھوڑا۔

شیخ کا نام رمضان جو بنارس میں شیخ کے ساتھ تھا اور کہا جاتا ہے کہ جن تھا بظاہر رمضان  
 غہ سنگار بنا رہتا تھا، نہایت فی علم و تامل متفہم تھا شیخ کے کلام موزوں کا جواب اکثر موزوں  
 دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ نے کہا "رمضان گسان ذہا آئند"۔ رمضان نے فوراً جواب دیا حضور،  
 تاکساں پیش کساں می آئند۔ ایک روز شیخ حجرے میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے تھے جب غلیف  
 سے نایغ ہوئے رمضان سے پوچھا کہ "از شب چہ قدر گذشتہ باشد؟" رمضان نے جواب دیا  
 کہ "زلفش کمر رسیده باشد"۔ الغرض رمضان اور شیخ میں اس قسم کے سوال جواب اکثر ہوا کرتے تھے  
 ایک روز ایک رئیس کی ملاقات کو آئے۔ شیخ نے اپنے باغ کا لیمو بطور تحفہ رمضان سے



نگوایا اور رمضان کو حکم دیا کہ پست جدا کر کے لاؤ۔ رمضان نے لمبولا کر میں سے پوچھا کھنڈو  
 و ترش پسند ہے یا شیریں؟ رئیس نے ہنسا کر کہا کہ ایک ہی تو لمبو ہے، پھر ترش و شیریں کی  
 تفریق کیسی؟ رمضان نے جواب دیا کہ آفتاب کی طرف کا حصہ شیریں ہے اور دوسری جانب ترش  
 نہیں ہے جب دونوں جانب چکچا تو واقعی ایک طرف شیریں اور دوسری جانب ترش تھا۔  
 شعرا و رسا جو شیخ سے ملنے آتے تھے شیخ ازرا و استغناء کی تنظیم کرتے تھے۔ کیونکہ شیخ کو  
 سی سے کچھ طمع نہ تھی۔ ایک چاندی کے کھٹولے پر جو اپنے لیے مخصوص بنا رکھا تھا بیٹھے رہتے  
 تھے اور اسپر کسی کو بیٹھنے نہ دیتے تھے۔

جس وقت شیخ بنارس میں مقیم تھے۔ بنارس میں ملا عبد اللہ معروف بہ امام محمد عثمانی صاحب بنارک  
 شگر و مولوی سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی بھی موجود تھے ان دونوں صاحبوں میں سلسلہ  
 ارتباط و محبت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ملا محمد عثمانی روزانہ شیخ کی پیام گاہ پر جایا کرتے تھے اور جو کچھ تصنیف  
 کرتے تھے شیخ کو سنایا کرتے تھے اور شیخ جو کچھ موزوں کیا کرتے تھے وہ ملا کو سنایا کرتے تھے۔ اکثر  
 ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی طرح میں دونوں صاحب طبع آزمائی فرماتے تھے۔ چنانچہ شیخ دُلا  
 کی ہر طرح غزلیں درج ذیل ہیں

### غزل شیخ علی خیریں

لے لے برائے کز یاد رفتہ باشد	دردِ دام ماندہ باشد میا و رفتہ باشد
آہ از دیکہ تنہا باداغ او چو لالہ	درخون نشستہ باشد چوں باد رفتہ باشد
خونش بہ تیغ حسرت یارب ملال بادا	صدے کہ از کثرت آہ و رفتہ باشد
از آہ و درد تا کہ سازم خبر دل را	روزے کہ کوہ صبرم بر باد رفتہ باشد
رمست برائے کز گردِ دام الفت	باصدا میداری تا شا و رفتہ باشد
شادم کہ از قیاباں دہن کشاں گذشتی	گوشت خاک اہم بر باد رفتہ باشد

پرسوز از خیرین است امروز کوہ و محسرا

مہنوں گذشتہ باشد فراد رفتہ باشد

## غزلِ ملا سابق بناری

جانش چناں بحسرت ناشاد رفته باشد      کز ہجر بد دل ادو سید اور رفته باشد  
 فریاد و در رحم است بریدے کہ اورا      بایں جان شیریں برباد رفته باشد  
 از خارزار انکاں ہر کس کہ چید اماں      چوں سر دزیں گلستاں آزاد رفته باشد  
 بر حال زار صیدے ہست کو بحسرت      در دام جاں سپارد صیاد رفته باشد  
 اے دلے مرغیہ ایک جہاں مٹا      در وقت جاں سپردن از یاد رفته باشد

سابق مہوز آور دایں مصرعِ حزینم

مجنون گزشتہ باشد فریاد رفته باشد

ایک روز شیخ سے کسی نے پوچھا گیا کہ اس کیونکہ اتفاق سے ملا محمد عمر بھی اس وقت  
 موجود تھے۔ شیخ نے کہا کہ از ملا پرس۔ کھانے کہا گیا پلاؤ کی ایک قسم ہے اور صرف یہی لکھ  
 نہیں خاموش ہوے بلکہ اسکی مفصل کیفیت مع ترکیب تباہی بیان کر دی شیخ نے تعجب ہو کر پوچھا  
 کہ آپ نے کھایا ہے؟ کھانے کہا میں نے کھایا تو نہیں مگر اسکی کیفیت مجھے معلوم ہے۔ شیخ  
 نے کہا کل میں آپ کو گپیا کھلاؤں گا۔ دوسرے دن شیخ نے ملا کو گپیا کی دعوت دی اور ملا  
 کے ساتھ بہت لوگوں کو مدعو کیا۔

شیخ کا کلام اُنکے مرنے کے بعد میں قدر دستیاب ہوا وہ کلیاتِ حزین کے نام سے  
 مطبعِ نامی منشی نو کشور دہلی ۱۲۹۳ ہجری میں چھپا ہے۔ کلیات میں عداوہ غزلیات کے قصائد منویات  
 و رباعیات وغیرہ بھی ہیں اور کچھ حصہ شُرکاء ہے جس میں شیخ نے اپنے اور اپنے اساتذہ کے  
 حالات درج کیے ہیں۔ چند اشعار شیخ کے کلیات مذکور سے انتخاب کر کے ذیل میں درج کیے جائیں۔

ادو صبا فنا نہ زلف تو ساز کرد      پیغامِ آشنایب مارا دراز کرد  
 گردید قسمتم ز ازل عشق شعلہ نو      ساقی دایہ ہرے جاگہ از کرد  
 افزوں شد از بہا زلفت شور عاتقاں      نیز گمب باغِ نالہ مرغاں دراز کرد

گرایا باب از سبب عجز دنیا تر بود پیاوند که چشم تراست از کرد

کننا سے لب بقصد رازناں حرمیں

تو اں حدیث شوق بہر دور از کرد

از شور نامہ ام دل جانان خبر نہشت آن شاخ گل زمخ خوشالکان خبر نہشت

بیودہ سینہ پر درو بام نفس ندیم میا و باز طالب اسیران خبر نہشت

شورید را بزرگدم غار و گل کیست یل از بنداپت بیابان خبر نہشت

برگزینا رفت کسے احباب خوش صبرین از تعافل جانان خبر نہشت

دو بوج خیر فتنہ حرمیں آرمبدہ ام

آب گہر ز شورش طوفاں خبر نہشت

برہرزمیں کہ جاوہ کئی آسماں کئی می زبیدت کہ از بکون مکان کئی

ہر جا کشتائی ز پے دل زلف پر شکن مرغان سدرہ راہمہ بے آئیاں کئی

شکلیں شود غزال کا بہت بیک نظر لے کاش میبخت مرا سرمدان کئی

لے عند لب باتو مرا حق صحبت است خواہم کہ خاک تربت اگلنشاں کئی

گرد و طرازدین دست جنوں حرمیں

خوننا پڑ کہ از رگ مرگاہاں رواں کئی

اکثر کام شیخ کے دوسرے نسخوں میں ملتے ہیں مگر کایات میں نہیں ملے ہیں۔ چنانچہ ذیل

کی غزل جو شیخ نے اپنے حساب لکھی ہے تاریخ بارس میں درج ہے۔

چشم کشودہ دست در فین نو بہار از داغ رنجتست دلم طرا لا زار

منت خدے را کہ بعون عنایتش منت پذیر نیستم از خلق روزگار

مروجن فتنے نیم از فین بحر و بر منون نظر د نیم از ابرو ہزار

ہمت براں سراست کہ خگر بڑوں نہ از تنگنا سے عرصہ این بنگلوں مزار

در کو دکی کہ بود دلم ماکلی ہنر جوشید ذوق شعر ز طبع گہر شمار



ہر مصرع زلف رسا و لہریب تر  
 حسنِ بلاغت و نہک گنگوے من  
 صوفی بجا نقاد سرانید گشتام  
 ہر صنف را از سبیل دریاں جن جن  
 معنی پہ چشمے کہ بود بحر رشکوہ  
 پیرایہ قبول و صفا ہے نفس مجسم  
 شرمندہ مست گہراے آبگوں  
 گاہے گرجی طر آئیدگان رسم  
 اکنوں نماندہ است بدل فوق گنگو  
 ہر نقطہ ام بہ شوخی خال عذریار  
 شورے نکلند در دل عشاقی بقرار  
 مطرب پہ ساز بزم ز شرم کشیدار  
 مرغولہ زیر قلمہ من رخت یادگار  
 لفظش سجود تے کر بود موج جو بار  
 لطف اشارت و نہک عاشقی بکار  
 پر دروہ من مست سخنماے آبدار  
 اندر گزہر گہ و سخن ماست پادار  
 کوتاہی از من و کرم از آفریدگار  
 فاش خریش کہ امہ پایاں رساندہ

وقت بہت خامہ را نکلند دست و مشہدار

شیخ نے بجاالت قیام بنارس، بنارس و اہل بنارس کی شان میں باعتبار مذاق شاعری فرمایا کہ  
 پری رخان بنارس بعد کرشمہ رنگ  
 بے پرستیش مہدیو چوں کند آہنگ  
 بہ گنگ غسل کند و بہ سنگ پاماند  
 زہے شرافت سنگ نہی لطافت گنگ  
 ایران سے شیخ کے کسی دوست نے شیخ کو خط لکھا کہ کیا اب بنارس ہی میں رہو گے وطن  
 اہل کو نہ آؤ گے تو شیخ نے اُسکے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا۔

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا  
 ہر برہمن پسر چھین رام است اینجا  
 جب شیخ بنارس میں مقیم تھے تو اسی اثنا میں سید غلام حسین خاں ابن سید ہدایت علی خاں  
 مہالہائی مولف سیر النافخین بنارس میں آئے اور حسب سفارش ڈاکٹر فلرٹن صاحب،  
 صاحب کلاں کی مصاحبت میں مامور ہوئے۔ یہ بھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے  
 ظلم و تقویٰ کی وجہ سے شیخ ان سے بہت خوش رہتے تھے۔ انفاقا سید غلام حسین خاں کے وہ  
 بار ہو کر دنیا سے رحلت کر گئے۔ ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۵۹ ہجری کو جب سید غلام حسین خاں

یہ خبر سنی اور اپنے وطن حسین آباد منوگیر بغرض انتظام جاگیر جانے کا قصد کیا۔ شیخ نے اسے  
 کہا کہ میری عمر کے خاتمہ کا اب بہت تھوڑا زمانہ رہ گیا ہے بہتر ہونا کہ تم اس وقت یہاں  
 موجود رہتے۔ مگر سید غلام حسین اشد ضرورت کی وجہ سے نڈرک سکے اور اپنے وطن چلے  
 گئے۔ وہاں جا کر سند جاگیر جو ان کے والد سید ہایت علی کے نام تھی، مہاراجہ شاہ اسے  
 منتظم ریاست مرشد آباد کی سرکار سے اپنے نام تبدیل کرائی اور انتظام جاگیر میں ایک سال  
 تک مصروف رہے بنارس نہ آ سکے۔

ادھر شیخ علی حزیں نے پندرہ سال تباہی و اربادی الاول شمسہ ہجری بمقام  
 فاطمان (بنائیں) کو نیات و دلوں کو چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کیا۔ اناشد و نا الیہ راجون۔  
 اور جو قبر غمتہ شیخ نے اپنی زندگی میں اپنے لیے بنوا رکھی تھی اسی میں دفن ہوئے۔ قبر سنگی ہے  
 محرم و شہبازے رشتہ ان المبارک میں شیعہ اصحاب جمع ہوتے ہیں اور مجلس عزاء ہوتی ہے۔  
 شیخ کے سنگ قبر پر جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔ لوح قبر پر "ہیں تدا تاک المسی" کے  
 بعد شیخ کا نام ان لفظوں میں تحریر ہے۔ "العبد الراجی رحمۃ ربہ محمد المدعو بہ علی ابن بطاہ الجیلانی  
 ہر دو پہلو میں یہ دو شعر ہیں جو شیخ نے اپنے سے کھمک سنگ قبر پر کندہ کرانے کا حکم دے رکھا تھا۔

زبانہ ان محبت بودہ ام و گریہ اندم      ہمید انم کہ گوش از دست پناہ شدہ انجا  
 حزیں از پاس رہ چاہے سر کی اہم      سر شوریدہ بر بالین آسائش رسیدہ انجا  
 اور پائین قبر میں یہ شعر ہے :-

روشن شدہ از دصال تو شہبازے تارما      صبح تیاہت است چراغ مزارما  
 کتاب متاح التوایخ میں شیخ کی تاریخ وفات یوں درج ہے :-

تھی غشت بہات روسے ز میں      ز شیخ محمد علی حزیں

ایک قطعہ میر غلام علی آزاد بگرامی نے بھی لکھا ہے مگر اس میں ایک عدد کم ہوتا ہے۔

علامہ عنصر و شاعر خوب      افسوس کہ از میانہ بر قات

تاریخ وفات اور نوبت حزیں حزیں دل ماست

تاریخ از مولوی محمد عبدالغفور قاسم نساخ

پچھلے سال ترحیل و فوت حزیں نوشتم غم جاوہر ان حزیں  
قبرستانِ قاطان میں شیخ کی قبر کے بعد رفتہ رفتہ مسلمان شہر کی ہزار ہا قبریں پختہ و نہ  
اندرا حاطہ قاطان ہو گئی ہیں اور ہوتی جا رہی ہیں خصوصاً شیعہ اصحاب کی قبریں بہت ہیں۔  
الغٹ صاحب کشتربارس کی بی بی ہندوستانی تھیں وہ بھی یہیں دفن ہیں اور خرابا  
مجلسِ غیرہ کے لیے کچھ جائداد بھی وقت کی ہے۔ کشتربارس کے حکم سے پچھلاک حاطہ قاطان  
کاتیار ہوا ہے اسپرہ اشار کند ہیں:-

صاحب کلاں بہادر سیدان سوری  
اب کرم کشادہ تاریخ سال ۱۰۱۰  
افراختہ این بنا کہ باوچ سار سید  
در داذہ عظیم زہر سوندہ رسید  
ذی قدرت شیعہ اصحاب مدہا روپیہ دیکر حاطہ قاطان کے اندر قبر کی زمین مول لیتے ہیں۔  
عشرہ محرم کے روز مرد عورتوں کا بہت بڑا مجمع ہوتا ہے اور یہ مجمع مرنے والے قاطان ہی تک  
محدود نہیں رہتا بلکہ دور تک شرکیوں اور گلیوں میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ شہر کے زیادہ حصے  
تقریبوں کے سبب دفن ہوتے ہیں۔

(الناظر، یکم دسمبر، ۱۹۹۱ء)



## اختر ہو گا گڑھی پروفیسر میرزا حیرت

نام میرزا اسماعیل بن میرزا محمد علی، مسندہ مطابق مسندہ ۱۸۷۱ء میں دارالافتاء ملہران میں پیدا ہوئے۔ مالی تہی، اور شرف کے لحاظ سے ان کے تانہان ایران میں ہونہ علمت و شوکت میں ممتاز اور امور سلطنت میں پورا دھن رکھتا تھا چنانچہ انکے ابا اور امی، میں سے ہونہ سبب عالیہ دیوانی پر منسوب تھے۔ میرزا جعفر جو انکے ابا، بزرگوار میں سے تھے سلطان کریم خان زند کے عہد سلطنت میں وزارت کے علیل لہذا عہدے پر مقرر تھے۔ علاوہ ازیں تحصیل و کمارت علوم میں بھی ان کا خاندان مشہور تھا۔ چنانچہ میرزا عبدالباقی تخلص بہ طیب جوابتہ زانے کے طیب ذوق اور ملک اشعرا تھے، اور میرزا عبدالباقی تخلص بہ طیب ذوق اور تخلص بہ طیب ذوق جو وزیر ایران اور شاعری میں بے نظیر تھے، اسی خاندان سے تھے

چار سال کی عمر میں سایہ پدری سر سے اٹھ گیا۔ مغربی ہی میں انکے حرکات و سکنات سے جوت و فطانت مترشح تھی، چوبیس برس کے سن میں ایک روز انکو ایک فوج کا فذ کے ساتھ جنگو انہوں نے مشق کے طور پر خوش خلد لکھا تھا، ملک ن محمد شاد قاپار کے حضور میں گئے، سلطان سرور نے باوجود مغربی اس فوق العادہ زیرکی اور فوشنویسی کو دیکھ کے ایک تیلی شریف کی اور ایک مطلقاً قلند ان عنایت فرمایا۔

بچپن ہی سے وہ تحصیل علوم میں مشغول ہو گئے تھے، اور جس سن میں سب ارد کے اوقات کو کمیل کو د، لہو و لعب میں صرف کرتے ہیں انہوں نے وقت مزین نایات شوق سے مطالعہ کتب

یہ سرت کیا۔ تھوڑی مدت میں انکی وسعت معلومات علوم ربی عربی، فارسی میں ہرچہ نہایت ہو گئی تھی جسکے سبب ارکان دولت و رؤسائے قوم اور مل انکی بہت عزت کرتے تھے۔

طبیعت چونکہ فطرت موزوں واقع ہوئی تھی، نیز نکات شاعری کی شرافت میں مہارت تامہ ہم پہنچائی تھی، تھوڑی ہی مدت میں فن شعر میں وہ مہارت پیدا کر لی، کہ میرزا ابوالحسن جنتی اور مرزا حبیب قہ آبی ایسے شاعران نامور (جبکہ انکی عمر اسوقت پندرہ سال کی تھی) انکی دل سے قدر کرتے اور داد دیتے تھے۔

انکی نشانت، اور غیر معمولی شخصیت کا شہرہ گوش زد و غناس و عام ہو چکا تھا اس لیے سر دہس کی عزتیں انکو گیان کی حکومت تفویض کی گئی لیکن انہوں نے کسب کمالات کو بااثر و ثروت پر ترجیح دی اور اس سے تعلق انکار کر دیا۔ یہ بات انکی والدہ ماجدہ اور بعض اصحاب کو جو ان سے ترقیات دینی کی امید رکھے ہوئے تھے، ناگوار گزری۔ آخر کار ان باتوں سے نیز ملائق دنیوی سے تنگ آکر چاہنی اختیار کی، اور متوکل علی اللہ بغیر زاد راہ کے چل نکلے جس کے بعد مدت العمر پھر سرزمین ایران میں قدم نہ رکھا۔ قہر کا شان سے ہوتے ہوئے اصحابان پہنچے، اور وہاں سے تبریز کی راہ سے روم گئے، جہاں کہیں راہ میں فروکش ہوتے لوگ نہایت اعزاز و اکرام سے پیش آتے اور محدود جفاظ و مدارات کرتے تھے۔ رذتہ الروم میں آفہ مینے قیام کیا اور وہاں کسی فرانسیسی عالم سے فریخ سیکرلی۔ پھر قسطنطنیہ تشریف لگئے جہاں تین سال سکونت اختیار کر کے ترکی کی تفصیل کی اور روم کو راستہ سے مصر کی طرف مراجعت کی۔ ایک سال کے بعد خرمن شریفین کا ارادہ کر کے مازم مدن ہوئے اور ارادہ کر لیا کہ اس سفر سے نوٹ کر شہر منعمایں اقامت پذیر ہوں اور عارفان کرام و فقرائے نظام کی صحبتوں میں بیتہ العمر سرت کر دیں لیکن تنہائے اتنی سے یہ ارادہ قوت سے عمل میں نہ آسکا چند روز جہاز کے انتظار میں مدن میں ٹھہرے رہے، اتفاقاً ایک روز جبکہ وہ شہر کی تفصیل اور خندق اور قلعہ کے استحکام کو غور و فکر سے معائنہ کر رہے تھے وار و نہاد قلعہ اس طرح دقیقاً نہ لگا دے دیکھنے پر بدمن ہو گیا اور انکو روسی جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا اور انگریزی فوج کے ایک دستہ کے ساتھ دریا کے راستہ سے شہر بلگام میں جو زیر حکومت بستی ہے بھیج دیا۔ کچھ دنوں کی تحقیق و تفتیش کے بعد معلوم

ہو گیا کہ جس شخص کے حق میں سوہنسی جیسا ہے، لہذا ادا کر دیے گئے، اور پھر خاکِ ہند ایسی دھکیں پڑی کہ مدتِ العمر یاں سے نہ نکل سکے۔

چند سال اطرافِ دکن، اور دیوبند گجرات و سندھ میں مشغول سیر و سیاحت رہے اور اسی اثنا میں انگریزی کی تفصیل شروع کر دی چنانچہ تھوڑے عرصے میں انگریزی کے لغات، اصطلاحات و محاورات پر پوری قدرت حاصل کر لی۔

انہیں دنوں میں گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے خلیج فارس کے محکمہ تاجر برقی کے پیشکار مقرر ہوئے، بعد ازاں دفتر دیوانی میں مترجم فارسی مقرر ہوئے اور چند مدت تک اسی میں بسر کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں گورنر بیٹی کے حکم سے انہوں نے سر جان سلیم کی انگریزی تاریخِ ایران کی دو جلدیں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ اس تاریخ کے ترجمہ میں جو سلاست ہے وہ شکل سے تو تاریخِ ایران میں پائی جاتی ہے، فصاحت کے علاوہ زبان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہے جو اس با کمال ادیبِ اریب کی ہمہ دانی اور جامعیتِ علمی پر دال ہے، یہ کتاب غایتِ شہرت سے تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔ کسی جلیل القدر یورپین نے اس فارسی ترجمہ کو پھر انگریزی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ میرزا صاحب موصوف سلسلہء میں بیٹی کے اسٹیشن کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر کیے گئے، اور پچیس برس کی بقیہ عمر اسی شغل میں صرف کر دی حافظہ اتنا قوی تھا کہ درسِ ایچ وکٹ کتبِ منہج کو حفظ پڑھتے تھے۔ کئی ہزار اشعار متلوات شعرے متقدمین تا آخرین یاد تھے، خصوصاً نظامی، حافظ اور سعدی کے اشعار۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں پوری مہارت رکھتے تھے، خصوصاً فلسفہ انبیاء میں انکو بڑا دخل تھا، تمام اقوامِ قدیم و جدید کے عقائد و ادیان کی تاریخ سے واقف تھے، اور تعلیمی ملبسوں میں علمیہ اور حکمیہ مسائل کے غوامض پر اس تحقیق و تدقیق سے پکڑ دیتے تھے کہ انکے حسنِ بیان اور وسعتِ معلومات سے لوگوں کو حیرت ہوتی تھی؛

انکے استہفاق، اور حسنِ ظن پر جو انکے بارے میں حکام گورنمنٹ کو تھا، نظر کرتے ہوئے لیکن تھا کہ وہ جلیل القدر مراتب پر پہنچ جائے لیکن جیسا کہ سابقہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ زفاریں نبوی اور علامتِ زندگی سے دل برداشتہ تھے۔ اور اگرچہ شغلِ تدریس انکے شاہانِ شان نہ تھا،



آہم آخر تک اسی شغل پر تہمت کر کے ان مناسباً یہ سے جو حکم وقتاً فرماتا انکو دینے کا ارادہ کرتے، وہ انکار کر دیتے۔ مع ذلک گورنمنٹ سے انکو "فیلو آف دی ہیبی یونیورسٹی" کے علاوہ "شمس العلماء" "تجسّات دی پس" وغیرہ معزز ترین خطایات عطا ہوئے تھے، گو انکا ذاتی شرف اس طرح کے اعزاز سے مستثنیٰ تھا۔

ماہ جون ۱۸۹۷ء میں کالج سے علیحدہ ہو گئے تو گورنمنٹ نے فیشن مقرر کر دی۔ اسکے دوا بعد ایک روز جبکہ وہ اپنے پائین باغ میں نفل رہے تھے ناگاہ زمین پر گر پڑے جسکی چوٹ کے سبب نے انکو بستر بیماری پر ڈال دیا، نقاہت بدنی، اور نزاکت کے باعث مرض ترقی کرتا گیا، بہتیرا علاج کیا گیا لیکن یہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر کار باسٹھ سال کی عمر میں یہ روزہ شنبہ پست و چارم جمادی الاول ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۸۹۷ء رات کے ۹ بجے وفات پائی۔ اور اس سرے فانی کو خیر باد کمر عالم جاودانی کو سیدھا رکھے۔ اور قبرستان مغولیہ میں جو بیٹی میں غربی بانی واقع ہے، مدفون ہوئے۔ انکی تاریخ وفات قلعہ ذیل سے دریافت ہو سکتی ہے۔

چوں روان پاک حیرت شد رواں      سوے جنت زیں جہان آب و گل  
ہر تاریخ دفاتش با تقم،      گفت اغفر لہ بگو از صدق دل  
نہایت درویش طبیعت اور صوفی مشرب آدمی تھے۔ عمر بھر انھوں نے تامل انبار دنیا  
ضیفوں بسکینوں کی دستگیری کرتے تھے، حتیٰ کہ کوئی سائل انکے در سے فانی ہاتھ نہ جاتا۔  
اگرچہ خود تنہا تھے لیکن دس بارہ نو کریم اہل و عیال انکے سایہ مرحمت میں نہایت فراغ مالی  
سے پرورش پاتے تھے۔ کئی آدمی انکی سفارش سے بڑے بڑے ہمدوں پہنچ گئے تھے،  
نہایت سلیم النفس اور نازک طبیعت تھے۔ اور صداقت و فروتنی کو انھوں نے ہمیشہ سے اپنا  
شعار بنا لیا تھا۔

مرتے وقت انھوں نے اپنی تمام جائیداد مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دی  
اور انھیں کی وصیت سے بیٹی کی "انجمن اسلام" اس رقم کو ہر سال قریب چھ سو روپے کے



بہی کے مسلمان طلباء فنون و علوم کی مدد و معاش میں ہر فن کرتی ہے۔  
 فن شعر میں حبیب کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے انکو پوری قدرت تھی۔ مگر کبھی کبھی تفتن طبع  
 کے طور پر شعر کہتے تھے۔ انکی طبیعت زیادہ تر غزل سرائی کی طرف مائل تھی۔ لیکن اس  
 سے انکا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ اس میں کوئی نام پیدا کریں بلکہ وہ تو ہمیشہ اسی بات میں  
 کوشاں تھے کہ انکے بعد انکا نام و نشان منقطع ہو جائے۔ اسی سبب سے جب  
 کبھی شعر کہتے ان منتشر اشعار کو جمع کرنے میں بے اعتنائی سے کام لیتے۔ اور ایک دفعہ دوسرے  
 زندگی میں انکے تلامذہ اور اصحاب نے جتنے اشعار جمع کیے تھے۔ سب کو جمع کر کے آگ کی  
 ذکر دیا۔ انکے انتقال کے بعد سب کو انکے کلام کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ بہت  
 جستجو کے بعد انکی بعض غزلیات جو مسٹر فریدون جی ابن منوچہر جی پروفیسر دکن کالج  
 پونا کے پاس تھیں، ہاتھ لگیں۔ جو سندھاء میں بیٹی میں طبع ہو گئیں، ان میں سے ہم  
 یہاں مرزا صاحب کا نونا کلام درج کرتے ہیں جس سے انکی قادر الکلامی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

ہر جا گزرم ز فرش تا عرش      ہر سو گرم ز پست و بالا  
 سر تا سر بایر گا و امکاں      در تا در کار گا و اشیا  
 ذرات شہ و مست و ہشیار      افراد و جود زشت و زیبا  
 ہر یک ہر طاعتی کہ دارند      گو سیند کہ لالہ لالا

کار دیوانہ بہ تدبیر فرد بہ نہ شود      زیور بخت نہ باشد سر پہ ساماں را  
 اسے طبیب از سر ماہر خداست بد ا      خوے با در و گر نعم چہ کفہ درماں را  
 بنایت ہمہ کارست کہ با کوشش و جد      رتہ آرد ہم فاکہ نہ رسد شیطان را  
 پند ازین غلغلہ و وزخ و غوغاے بہشت      اسے خوش آں کفر کہ دشت ہر دہاں را

بہت پرستی خیر تا از خود پرستی خوشتر است      خود پرستی عاقلان را بہت پرستی داناں را

صبح شد بر خیز و در نه خواب و بر کش آردا  
از تن آید بسو زایں نیلگون فرخا و در

انیم یک استخوان دآں نیز یک مفصل و صد شکلیا

فرخند و سرے آں که پائے تو رسید هست  
فرخند و تر آں دید که رایت بگریه است  
آسود و آفاق به بیم مگر آں را که  
با عشق تو پیوسته و آفاق بریده است  
خوش طالع آں سر که به تاج تو نهاد دست  
خدا و دولت پائے که زخار تو تولید است

گرمی کشد جنایت بان من و بنایت  
در می کشد عنایت دست من و عنایت

سربا که شبی بود سحر آمدش از پی  
یارب شب مارا اگر از پی سحر نیست  
در گلشن ما آئی و نظر کن که به بینی  
بے بانگ انا الحق و سقا بر شجر نیست

ندست جام جہاں میں کن کہ از جم بگذری  
جم جہاں جوئی کہ دے گر بکن این جام را

زند و جاوید کیست در نغیر ہو شیار  
آں کہ نند سر بعد قی بر سر سود لے یار

رباعی

آمین مشو که مرکب مردان مرد را  
در شگل لاخ بادیه تنها بریده اند  
آید هم میباش که رندان باد و نوش  
تا که به یک خروش بمنزل رسیده اند  
(الناظر، یکم نومبر ۱۹۱۶ء)



# Tazkirey



Khuda Bakhsh Oriental Public Library

Patna